”چہارسُو“

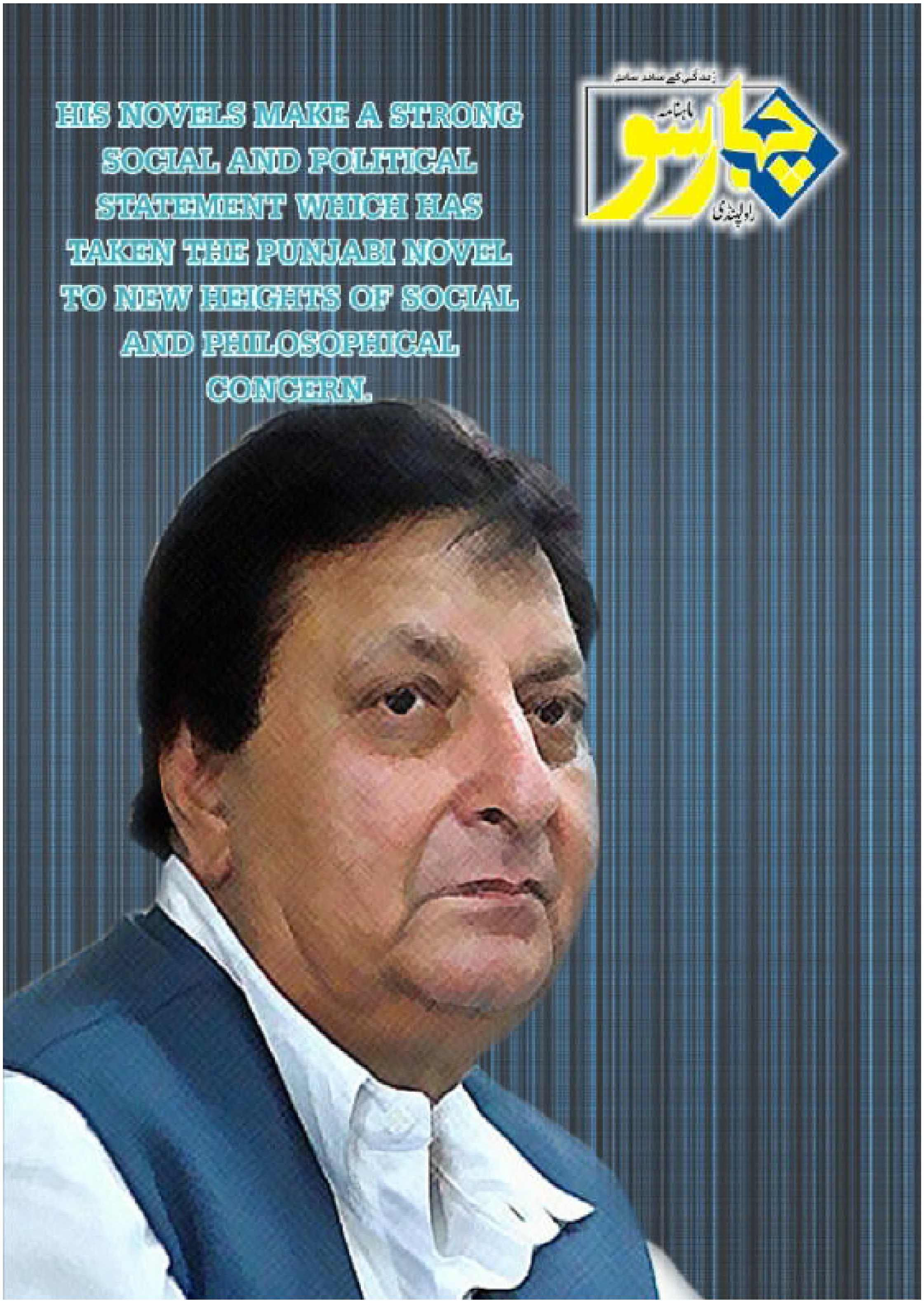
HIS NOVELS MAKE A STRONG SOCIAL AND POLITICAL STATEMENT WHICH HAS TAKEN THE PUNJABI NOVEL TO NEW HEIGHTS OF SOCIAL AND PHILOSOPHICAL CONCERN.
چہارسو
راولپنڈی

ـــــ نوبیل حیاتیات ـــــ

شناخت کے نئے کا آغاز باقر نقوی نے کچھ سال پہلے سائنسی موضوعات سے اپنی غیر معمولی دل چسپی کے اظہار سے کیا تھا۔خلیے اور الیکٹرونکس پر اُن کی کتابیں شائع ہوئیں۔اس کے ساتھ ہی الفریڈ نوبیل پر انھوں نے کتاب لکھی۔اور بس پھر تو وہ جانِ حیا ایسا کھلا ایسا کھلا۔پہلے ''نوبیل ادبیات'' پھر ''نوبیل امن کے سو برس'' جیسی تاریخ میں زندہ رہنے والی کتابیں انھوں نے اردو قارئین کی نذر کیں۔اس سلسلے کی تیسری کتاب اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے جو پوری بیس ویں صدی کے ادویات کے شعبے میں نوبیل انعام حاصل کرنے والوں کی تقریروں اور ان کے کام کے تعارفی خطبات کے ترجمے پر مشتمل ہے۔ادب، امن اور ادویات تینوں شعبے ویسے تو ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں لیکن دیکھا جائے تو تینوں انسانی زندگی کی فلاح، ترقی اور خوش حالی سے بہت گہرا تعلق رکھتے ہیں۔باقر نقوی نے نہ صرف اس تعلق کو بخوبی سمجھا ہے بلکہ آج کی انسانی صورت حال میں اس کی شدید ضرورت کو بھی واضح طور پر محسوس کیا ہے۔اسی لیے انھوں نے اہلِ اردو کو یہ بیش قیمت تحفے پیش کیے ہیں۔سچ پوچھیے ترجمے کا یہ کام مجھے تو بہت سوں کے طبع زاد کام سے بھی، بہت زیادہ قدر و قیمت کا حامل نظر آتا ہے۔یہ کام ادارے کرتے تو بھی مبارک باد کے مستحق ہوتے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ باقر نقوی کے انفرادی کارناموں کی بڑھ چڑھ کر پذیرائی ہونی چاہیے۔

ـــــعطاء الحق قاسمی

اشاعت ۲۰۱۲، قیمت ۳۰۰۰ روپے، اکادمی بازیافت، کراچی

ـــــ بے لاگ ـــــ

پروفیسر عزیز جبرانؔ انصاری صحیح معنوں میں ایک کثیر الجہات قلم کار ہیں شاعری، افسانہ نگاری، تنقید نگاری، انٹرویو نگاری اور تدوین کاری کے شعبوں میں انھوں نے قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں لیکن علمِ عروض میں انہیں اختصاص اور کالم نگاری میں امتیاز حاصل ہے۔کالم نگاری کی بہت سی قسمیں ہیں۔عزیز جبران انصاری نے اپنے کالموں میں ادبی اداروں میں ہونے والی دھاندلیوں اور ادیبوں کی بدعنوانیوں اور شاعروں کی فنّی کمزوریوں کی تنقیدی گرفت کی ہے۔عزیز جبرانؔ نے جو کچھ لکھا ہے کسی مصلحت یا مفاد سے بے نیاز اور ذاتی تعلقات و تعصّبات سے بلند ہو کر لکھا ہے۔ان کے کالموں میں ادب اور ادیبوں پر کی گئی تنقید معروضیت کی مظہر ہے۔ان کے کالم واقعی بے لاگ ہیں۔انھوں نے ہر جگہ غیر جانب داری سے کام لیا ہے۔

ـــــعلی حیدر ملک

اشاعت ۲۰۱۳ء، قیمت ۵۰۰، جبران اشاعت گھر، کراچی

ـــــ ابن صفی۔شخصیت اور فن ـــــ

جاسوسی ناول بھی اتنے ہی اہم ہیں جتنا کہ دوسرا ادب۔ابن صفی واحد جاسوسی ناول نگار تھے جن پر یہ فن شروع ہو کر انہی پر ختم ہو گیا تھا۔ان سے میری ایک ملاقات بھی ہوئی تھی۔میرے چھوٹے بیٹے کو جنون کی حد تک ابن صفی کو پڑھنے کا شوق تھا۔میں نے ابن صفی کو پڑھا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ راشد اشرف جیسے نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے۔وہ ہمارے مستقبل کا حال ہیں اور ہمارا حال ماضی بن جائے گا۔''ابن صفی۔شخصیت اور فن'' کی اشاعت پر میں راشد اشرف کو مبارک باد دیتا ہوں۔

ـــــڈاکٹر جمیل جالبی

اشاعت ۲۰۱۳، قیمت ۳۰۰ روپے، بزمِ تخلیقِ ادب، کراچی

N.P.R- 063

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۲۲'شمارہ: جولائی اگست ۲۰۱۳ء

بانی مدیرِاعلیٰ
سید ضمیر جعفری
○○○
مدیر مسؤل
گلزار جاوید
○○
مدیران معاون
بینا جاوید
فاری شا
محمد انعام الحق

○
مجلسِ مشاورت
○○○
قارئین چہارسُو
○○○
زرِ سالانہ
○○○
دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ
○

رابطہ: 537/D-1 'ویسٹریج-III' راولپنڈی، پاکستان۔
فون: 5462495,5490181-51-(92+)
فیکس: 5512172-(92+)
موبائل: 0558618-336-(92+)
ای۔میل: chaharsu@gmail.com
۔ ویب سائٹ ۔
http://chaharsu.wordpress.com

پرنٹر: فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہارسو

سرِ ورق، پسِ ورق۔۔۔۔۔۔شعیب حیدر زیدی

تزئین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عظمیٰ رشید

کمپوزنگ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تنویر الحق

قرطاسِ اعزاز

جی آیاں نوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فاری شا ۶

اپنے ہاتھ میں آئینہ۔۔۔۔۔۔۔۔شیخ عبدالرشید ۹

براہِ راست۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔گلزار جاوید ۱۵

بے تاج بادشاہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔محمد انعام الحق ۲۰

چانن دی آس۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔شریف کنجاہی ۲۴

جہنم کی آگ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔امرتا پریتم ۲۶

ایک عہد کا استعارہ۔۔۔۔۔۔محمد نظام الدین ۲۷

یک نفری فوج کا سپہ سالار۔۔۔۔۔۔شاہ محمد مری ۲۹

جدا آپودھاپی پے گئی۔۔۔۔۔۔۔۔امجد علی بھٹی ۳۱

کعبہ میرے آگے۔۔۔۔۔۔۔۔سید شبیر حسین ۴۰

اصحاب کہف کی تمثیل۔۔۔۔۔۔۔شاہین مفتی ۴۳

زرد ستارے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اقبال بھٹی ۴۶

پنج دریاواں دامان۔۔۔۔۔۔۔صاعقہ مقبول ۴۹

نورِ وحدت

محمد علی مضطر، تشنہ بریلوی۔ ۵۲

افسانے

صبح کے قریب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ناصر بغدادی ۵۳

ذوقِ اسیری۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سید سعید نقوی ۵۶

کپوت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔آغا گل ۶۰

نیم پلیٹ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فرخندہ شمیم ۶۴

گھمن کا گھونسا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔نجیب عمر ۶۶

وقت کی شہزادی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عظمیٰ صدیقی ۶۷

زندان کا قیدی

انتظار باقی، مشکور حسین یاد، سرور انبالوی، آصف ثاقب، محمود الحسن، غالب عرفان، یوگیندر بہل تشنہ، خیال آفاقی، نسیم سحر، سریوا ستورند، حسن عسکری، رؤف خیر، صدیق شاہد، حنیف ساحل، پنہاں۔ ۶۹

گم شدہ شناخت

زیرِ طبع ناول کا ایک باب۔۔۔۔۔۔۔۔انل ٹھکر ۷۷

قیدِ جاں

رب نواز مائل، پرواز انبالوی، علی مسعود تنہا، زہیر کنجاہی، نعیم الدین، عرش صہبائی، ناصر علی سید، ابراہیم عدیل، نورزمان ناوک، اسد اعوان، سیفی سرونجی، رومانہ رومی، تصور اقبال، شگفتہ نازلی، نوید سروش۔ ۸۵

ہوا کے دوش پر

ایک عام آدمی کی داستانِ حیات۔۔۔۔فیروز عالم ۹۰

فضائے ہفت گردوں

پروین شیر، حسن منظر، یوگیندر بہل تشنہ، حسن عسکری کاظمی، مناظر عاشق ہرگانوی، عارف شفیق، نورین طلعت عروبہ، انیس الرحمٰن۔ ۹۵

ڈرامہ

بغل بچے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔گلزار جاوید ۱۰۲

ایک صدی کا قصہ

لتا منگیشکر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔دیپک کنول ۱۰۷

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین۔۔۔۔۔۔۔۔وقار جاوید ۱۱۴

☆

قرطاسِ اعزاز

فخر زمان

کے نام

''جی آیاں نوں''

فاری شا (لندن)

ڈاکٹر جمال ہوشیار پوری

جی آیاں نوں کہو جمال رل کے اج اک جوگی نواں آیا اے ہتھ ناد، نہ سہلیاں گلے اندر، پر ڈونگھا گیان لیا یا اے
کدے کرے فریز اوہ سین کوئی، سلوا یکشن دے وچ اوہ کدے ویکھے کیویں ہف کے ڈگدیاں ہین چڑیاں، کیویں ماردے کانٹی بزرگ ایتھے
وِزیبلیٹی پوُراے اجے بھانویں، سُرت اوس دی اوہنوں دکھاوندی اے مُڑ مڑ آونی اے بقر عید نہیں جھڑی بندے دی رت وگاوندی اے
کدے دس دا اوہ وڈیریاں توں بھانگا کیویں مصلّیاں کڈھنا ایں پنچ مار کے نال سٹریٹیجی دے کیویں ناک آوٹ کر چھڈنا ایں
نویاں بوتلاں وچ شراب کہنہ نشہ ہو گیا دون سوایا اے جی آیاں نوں کہو جمال رل کے اج اک جوگی نواں آیا اے

...... ○ ......

دھرتی زادہ

آسمان کے سارے موسم
اک اک کر کے
اُس کے مٹی جسم پر اترے
آگ کی بارش
کڑکتی بجلی
انسانوں کی انسانوں پر یلغاروں کی ساری رُتیں
تلواروں اور بندوقوں سے چھن چھن کرتی صبحیں شامیں
بوٹوں والی دھمک سے لرزاں صفحوں کی چپ چاپ سی راتیں
کھیتوں میں سرسوں کے پھولوں کے پژمردہ چہرے
بھنگڑوں اور گِدّوں کے پڑ میں
پُراسرار سی خاموشی
ایسے میں وہ دھرتی زادہ
اپنے ہاتھ میں پھولوں کی اِک ڈال لیے
ساری دھرتی کی رُتوں کو جی آیاں نوں کہتا ہے

○

اکھراں داچانن

-
تیریاں سچیاں سوچاں
ساڈے جسم دی اک اک رگ وچ وس گئیاں
تیرے اکھراں فخر زماں
چارے پاسے پیار دے سوہنے پھُل کھلارے
پھُلاں دی خشبواں دے وِچ
ساہ لیندے نیں بندے سارے
تیرے اکھر
چانن بن کے
ساڈی وسوں نوں لشکاندے
کالیاں رِیتاں مار مکاندے
تیریاں اکھراں تیریاں سوچاں
گھُپ ہنیرے دے سینے تے
پیار دے ڈھیراں دیوے بالے

○

شعر دابُوٹا

عبدالکریم قُدسی

فخرزمان اوہ شعر دابُوٹا
جس دی ہر جڑھ دھرتی کولوں منگے پیار دا پانی
مُڑ ایہہ پیار دی بارش بن کے پیار دا پانی پرتا
دیوے چونا کر کے
فخرزمان اوہ پیار دابُوٹا جس دیاں شاخاں
چار چفیرے کھلر پیّاں
آندے جاندے دُھپ دے ڈنگے راہی
ایہدی ٹھنڈی چھاں نوں ویکھ کے تے
پینڈے دی اوکڑ بھُل بھلا کے بہہ جاندے نیں
فخرزمان اوہ پیار دابُوٹا جھدیاں ٹِنکیاں ٹِنکیاں
پر امبلاں آون والے وڈے وڈے
طوفاناں دیاں خبراں دیون
فخرزمان اوہ شعر دابُوٹا، پیار دابُوٹا
جس دے اُتے
جِنّا فخر وی کریئے گھٹ اے

❍

پورٹریٹ

سنتوکھ سنگھ سنتوکھ

فخرزمان
پنجاں پانیاں تے وگدی اوہ ہوا
جو نہ ونڈ سکے کوئی
تے نہ کوئی سکے ہنڈا
جس دی سرسراہٹ چ ہُونگ اے
ست گواچے لوکاں دی دعا
چر دا سِٹہ اِک ونگار
رُوح وِچ وی رُوح دا خُمار
چڑیاں دا چمبہ
ون دے بُوٹے تے بیٹھا اے
کُجھ اکھر تاں معنے بندے
کُجھ معنے اکھر لین ہنڈا
ماڈل ٹاؤن چ وی
مچلا جیہا جٹ
جس نوں لبھے خُدا
نہ میرا نہ تیرا کُجھ وی
اوہ تاں فخر پنجابی دا

❍

فخر زمان

دل نواز دل

سب مکین کہتے ہیں بن کے اک مکاں
فخر تجھ پر ہو نہ کیوں فخر زمان
آتشِ دل نے رکھا تجھ کو جواں
ایسی آتش سے نہیں اُٹھتا دُھواں
بے ادب کرتے رہے گستاخیاں
پر تنی کب تیرے ابرو نے کماں
سوچ تیری صاف اور شفاف ہے
کیا کسی کو ہے کوئی اس میں گماں
''راستے کی دُھول'' تیری آنکھ میں
سامنے تیرے ہے منزل کا نشاں
''ست گواچے لوک'' جب تجھ کو ملے
راز تب دل کا ہوا تجھ پر عیاں
تھی ''کہانی اک مرے بندے'' کی جو
اُس کو دی تو نے زندہ کن زبان
''توں کہ میں'' کے بھید کو تُو پا گیا
یہ تھا امر واقعی تیرا بیاں
لاکھ ''دیواریں'' اُٹھائیں آب نے
پر رہا ''زھراب'' جاں میں تو رواں
تھی ''زوالِ وقت کی نازک گھڑی''
جو سبک سازوں پہ گذری تھی گراں
جب وہ بندی وان ''بے وطنا'' ہوا
موسمِ گل میں در آئی تب خزاں
دیکھ کر ''چڑیاں دا چنبہ'' صحن میں
یاد آیا ہے جدائی کا سماں
دہر کو ''ویلے دی کنسو'' دے نہ دل
ورنہ ٹوٹے گا زمین پر آسماں

جیوے فخر زمان

نذیر قیصر

ہتھ وچ دیوا مٹی دا
تے پیراں ہیٹھ اسمان
حرف دا بوہا کھلیا
اندر وسدا کل جہان
ہنیرے دی گنڈھ کھول رہیا اے
کلا بندی وان
اُڈدیاں کونجاں دے پر چمدی
سرگی دی اذان
''جیون ساڈے پنج دریا تے جیوے فخر زمان''

○

قطعہ

اقبال راہی

اہلِ قلم پہ اس کے ہیں احسان بے شمار
راہی قلم ہے فخر کے قابل زمان کا
سوچوں میں اس کے فکر کا اک انقلاب ہے
سب کیلئے دھڑکتا ہے اک دل زمان کا

○

''اپنے ہاتھ میں آئینہ''

شیخ عبدالرشید

(لاہور)

ہمہ جہت شخصیت فخر زمان کی حیات وخدمات کے تین نمایاں پہلو ہیں۔وہ بالغ نظر سیاستدان، روشن خیال ادیب اور ورلڈ پنجابی کانگرس کے پختہ فکر راہنما ہیں وہ تھری ان ون ہیں اور مذکورہ بالا تینوں جہتیں اُن کی ذات میں اس طرح مدغم ہیں کہ ان کی ذات میں کوئی تضاد بھی دکھائی نہیں دیتا۔اس بات کی تصدیق اوران کی شخصیت اورفن کو درست طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کی کتابِ حیات کی ورق گردانی کی جائے۔سینٹ بیو کا تنقیدی اصول ہی یہ ہے کہ ہم کسی شخص کو جان لینے کے بعد ہی اس کی تحریروں ،فن وخدمات کا حقیقی ادراک کرسکتے ہیں وہ کہتا ہے کہ:

''When we know the tree, we know the fruit''

اسی اصول کی روشنی میں ہم فخر زمان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا تذکرہ کریں گے تاکہ ان کو دیکھ کر بعدازاں ان کے کام کا جائزہ لیا جاسکے۔

ابتدائی زندگی:

فخر زمان گجرات کے ڈھنڈی گوت کے پڑھے لکھے ''جٹ'' گھرانے کے قابل فخر سپوت ہیں۔وہ ۲۱/جنوری کو علاقہ کی ممتاز سیاسی وسماجی شخصیت میجر (ر) چوہدری محمد زمان کے گھر پیدا ہوئے۔وہ اپنے والد کی اکلوتی نرینہ اولاد اور چار بہنوں کے منجھلے بھائی ہونے کے باعث پورے گھر کے لاڈلے تھے۔فخر زمان کے دادا چوہدری مولا داد تقسیم ہند سے قبل بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور پیشے کے اعتبار سے انجینئر تھے اُنہوں نے اپنے بچوں کی تربیت میں تعلیم کو بنیادی اہمیت دی چنانچہ ان کے منجھلے بیٹے چوہدری محمد زمان نے فوج میں کمیشن لے لیا۔چوہدری محمد زمان کا رجحان سیاسی تھی۔ چنانچہ انہوں نے بطور میجر فوج سے ریٹائرمنٹ لے لی اور گجرات آکر سیاسی ڈیرہ بنالیا۔جلد ہی خوش شکل،تعلیمیافتہ اور پُرکشش گفتگو کے فن سے آشنا میجر (ر) محمد زمان کا سیاسی ڈیرہ عوامی توجہ کا مرکز بن گیا۔بعدازاں اسی سیاسی ڈیرہ داری نے ان کے لختِ جگر کو سیاست میں دلچسپی وراثت میں دی۔

فخر زمان بچپن میں محلے کے دوسرے بچوں کی طرح پتنگ بازی، کبوتر بازی جیسے شوق رکھتے تھے۔وہ محلے کے گراؤنڈ میں ہی کرکٹ اور بیڈمنٹن بھی کھیلتے تھے۔وہ بچپن ہی سے سنجیدہ طبع اور شرمیلے مزاج کے حامل تھے۔جٹ گھرانوں کی روایات کے مطابق اُن کے والد اپنی اولاد نرینہ کی جسمانی صحت کے بارے میں بھی متفکر رہتے۔صبح ناشتے میں دودھ،لسی اور مکھن گھر کا معمول تھا مگر فخر زمان دودھ،لسی پینا پسند نہیں کرتے تھے اس پر اکثر انہیں والدین سے ڈانٹ پڑ جاتی کہ اگر مکھن،دودھ اور لسی استعمال نہیں کروگے تو جٹ گھرانے کا سپوت کیسے دکھائی دوگے۔

تعلیم:

ہمارے ہاں کے متمول اور امیر گھرانوں کا معمول رہا ہے کہ وہ اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے بھی ایک خاص طرز کے سکولوں کا انتخاب کرتے ہیں اور بورڈنگ سکولوں میں بچے داخل کروانا امیر گھرانوں کا خاص فیشن ہے مگر وسائل و استطاعت کے باوجود میجر (ر) محمد زمان نے اپنے اکلوتے بیٹے کو کسی دور دراز یا بورڈنگ سکول میں نہیں بھیجا کیونکہ وہ اپنے نورِ چشم کو آنکھوں سے دور نہ رکھ سکتے تھے۔چنانچہ فخر زمان نے ابتدائی تعلیم گھر کے قریب ہی واقع مشن ہائی سکول سے حاصل کی۔میٹرک پاس کرنے کے بعد انہوں نے تعلیم کے لیے زمیندار کالج گجرات کا انتخاب کیا جو اس زمانے میں پاکستان کا ''علیگڑھ کالج'' سمجھا جاتا تھا۔انہوں نے ۵۶۔۱۹۵۵ء کے لگ بھگ زمیندار کالج میں داخلہ لیا اور وہاں ۱۹۵۸ء تک رہے۔ان سالوں میں انہوں نے بھرپور زندگی گزاری۔اس کالج کے علمی وادبی ماحول کا فیضان ہی تھا کہ صحت مند جٹ پُتر کے دماغ کو ادب کی جاگ لگی۔وہ کالج میں محض کتابی کیڑا نہیں تھے بلکہ نامور کھلاڑی،لکھاری اور یونین لیڈر تھے۔وہ کالج میں بیڈمنٹن،ٹیبل ٹینس کھیلنے کے ساتھ ساتھ کالج کی کرکٹ ٹیم کے کپتان اور ہاکی ٹیم کے نائب کپتان تھے۔چونکہ خاندانی سیاسی جراثیم ان میں تھے لہٰذا وہ سیاست میں بھی رہے اور کالج کی سٹوڈنٹس یونین کے الیکشن میں بھرپور حصہ لیا اور واضح اکثریت سے یونین کے صدر منتخب ہوئے۔چُست وتوانا،فخر زمان کا ادبی ذوق شوق بھی نمایاں تھا۔وہ کالج کے میگزین ''شاہین'' کے سرگرم لکھاری تھے اور انگریزی و اردو میں لکھتے تھے۔اسی زمانے میں ہی انہوں نے اپنی پہلی تحریر اردو میں افسانے کی صورت میں قلمبند کی جس کا عنوان ''مانواں ٹھنڈیاں چھاواں'' تھا اور یہ ''شاہین'' میں شائع ہوا۔اسی دور میں انہوں نے رجحان ساز ادیبوں امرتا پریتم،موہن سنگھ اور شریف کنجاہی کی تحریروں کا مطالعہ کیا۔۱۹۵۸ء میں انہوں نے زمیندار کالج سے بی۔اے (آنرز) کی ڈگری رول آف آنرز کے ساتھ حاصل کی اور پھر مزید تعلیم کے لیے گجرات کو خیرباد کہہ کر لاہور چلے گئے۔جہاں زندہ دلان لاہور کی طرح زندگی سے لطف اندوز ہوئے۔

گریجویشن کے دوران ہی انہیں زبان وادب کا چسکہ پڑ گیا تھا مگر انہوں نے لاہور جاکر چند ساتھیوں کے مشورے سے پنجاب یونیورسٹی سے شعبہ اکنامکس میں داخل لے لیا اور ایم۔اے اکنامکس کے طالبعلم بن گئے مگر ادب پسند دل کو اقتصادیات کی خشک مزاجی نہ بھائی اور وہ جلد اُکتا کر انگریزی ادب

کے شعبے میں آ گئے یہاں ابھی انہیں چارہ ماہ ہی ہوئے تھے کہ جامعہ پنجاب میں سوشل ورک کے نئے شعبے کا آغاز ہوگیا۔ساتھیوں نے اصرار کیا تو سوشل ورک میں آ گئے۔ یونیورسٹی میں بھی خاصے فعال رہے یونین کی سیاست میں متحرک ہوئے تو اپنے شعبے کے صدر چُنے گئے۔ قلمی میدان میں بھی جوہر دکھاتے تھے چنانچہ میگزین کے ایڈیٹر بھی بنے۔ایم۔اے سوشل ورک کی ڈگری لے لی تو لاء کالج چلے گئے اور ایل۔ایل۔بی میں داخلہ لے لیا۔ساتھ ہی ساتھ شعروافسانے بھی لکھتے رہے۔ایل۔ایل۔بی سے فارغ ہوئے تو انہی دنوں یونیورسٹی میں انٹرنیشنل افیئرز کا ڈیپارٹمنٹ شروع ہوا۔شاید انہیں معلوم تھا کہ زندگی میں ان کے کافی افیئرز ہوں گے چنانچہ یہاں بھی داخلہ لیا اور انٹرنیشنل افیئرز میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ (DIA) حاصل کیا۔پھر اسکالرشپ لیا اور اعلیٰ تعلیم کے لیے ہالینڈ کے شہر ہیگ چلے گئے جہاں سے سوشل ویلفیئر میں پوسٹ گریجویشن کرنے کے ساتھ انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کا سرٹیفکیٹ لے کر وطن واپس آئے۔

زمانہ طالبعلمی میں ہی موسیقی سننے اور بالخصوص فلم بینی کے شوقین ہوئے۔فلم بینی تو ان کا جنون بن گئی تھی۔ بہت فلمیں دیکھیں چنانچہ ہالینڈ سے اعلیٰ تعلیم کے بعد واپس آئے تو ان کے اندر خود فلم بنانے اور کہانی لکھنے کے شوق نے انگڑائی لینی شروع کر دی۔اس سلسلے میں انہوں نے فلمساز خواجہ خورشید انور سے ملاقاتیں کیں اور انہی کے مشورہ پر''تان سین''پر فلم بنانے کا ارادہ کرلیا۔خود ہی سکرپٹ بھی لکھ دیا۔اداکار ندیم کو بطور تان سین کاسٹ کرنے کا فیصلہ کیا اور فلم بنانے کا باقاعدہ اعلان کر دیا۔لیکن ان کی اس خواہش کی راہ میں''جٹ ازم'' آ کھڑا ہوا۔جب ان کے والد میجر (ر) محمد زمان کو پتہ چلا کہ ان کا لختِ جگر فلم پروڈیوسر اور ڈائریکٹر بننے جارہا ہے تو انہوں نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ اب''جٹ فلمیں بنائیں گے؟''اس طرح فلم انڈسٹری میں جٹ دا کھڑاک ہوتے ہوتے رہ گیا۔فرمانبردار بیٹے نے فوراً راہ بدل لی مگر فلم سازی کی خواہش ان کے دل کے نہاں خانوں میں ابھی تک پنہاں ہے۔ ابھی بھی وہ اپنے محبوب سیاسی راہنما ذوالفقار علی بھٹو کی زندگی پر فلم بنانے کی خواہش رکھتے ہیں۔وہ خود تو فلم سازی کی طرف نہ آسکے مگر ان کے بیٹے فرخ زمان نے فلم سازی میں ہی کینیڈا سے پوسٹ گریجویشن کی ہے اور آج کل ایک نجی چینل کی پروڈکشن ٹیم میں ہے۔

فخر زمان کو موسیقی سے بھی رغبت ہے لیکن صرف سننے کی حد تک۔ روشن آراء بیگم، سلامت علی خاں، نصرت فتح علی خاں انہیں زیادہ پسند ہیں۔ کلاسیکل و نیم کلاسیکل کو پسند کرنے کے باوجود ان کے قلب و ذہن میں نئے پاپ سنگرز کے حوالے سے بھی کوئی تعصب نہیں۔ جل گروپ، فیوژن کے شفقت، مقال حسن، شوکت علی، حامد علی خاں اور ثریا خانم کے گانوں کو بہت شوق و انہماک سے سنتے ہیں آج کل عاطف کا گانا''یہ لمحے''انہیں بہت پسند ہے۔

ازدواجی زندگی:

پرکشش شکل وصورت اور رومانوی مزاج کے حامل فخر زمان کی شادی پھوپھو زاد سے ہوئی جو ۱۹۸۰ء میں انتقال کر گئی۔فخر زمان فکر و خیالات کے جھمگٹے میں تنہا زندگی گزار رہے تھے کہ انہی دنوں ریڈیو پاکستان سے منسلک پنجابی شاعرہ شائستہ حبیب اُن کی زندگی میں داخل ہوئی اور پھر انہی کی ہو کر رہ گئی انہی سے ان کی نرینہ اولاد فرخ زمان پیدا ہوئے۔شائستہ حبیب سرطان کے موذی مرض میں مبتلا ہو کر ۱۰/جون ۲۰۰۴ء کو داعی اجل کو لبیک کہہ کر فخر زمان کو داغِ مفارقت دے گئی شائستہ حبیب کی وفات پر فخر زمان نے خاص طرپ یہ نظم لکھی۔

''شائستہ واسطے اک نظم''

میں اوہنوں مٹھی وچ سنبھال کے رکھن دا
پوا پورا جتن کیتا
پر اوہ میریاں اُنگلاں دیاں وِرلاں وچوں
پل پل چھن چھن
ذرہ ذرہ کردی رہی
تے اج میں ہنجو کیردے
اِپنے خالی ہتھ نوں
پچھناں ہاں کہ دس
اوہ کیہہ سی؟
سراب؟
خواب؟
خشبو؟
کہ
ریت؟

جون ۲۰۰۶ء میں دہلی یونیورسٹی انڈیا کی معروف محقق اور تاریخ داں ڈاکٹر فاطمہ حسین سے ان کی شادی لاہور میں ہوئی۔ایک طرف تو یہ شادی فخر زمان کی زندگی کا نجی حوالہ ہے تاہم دوسری جانب پاک و ہند کی دوستی کی دعویداری کا ناقابل تردید ثبوت بھی ہے۔اس لیے اس شادی کو فخر زمان نے ''a ture metaphor of Indo-Pak friendship'' قرار دیا تھا۔

ملازمت وسیاست:

متمول گھرانے کے اس ذہین جوان کو''روزگار''اور ملازمت کی ضرورت نہ تھی۔ پھر بھی فخر زمان نے تعلیم سے فارغ ہو کر ملازمت کا تجربہ ضروری سمجھا اور کچھ عرصہ''تنظیم آبادی''کے محکمے میں ایگزیکٹو آفیسر رہے۔مگر ملازمت آزاد منش اور تخلیقی مزاج کے حامل شخص کے لیے محفوظ پناہ گاہ ثابت نہ ہوئی چنانچہ انہوں نے ملازمت ترک کر کے صحافت کے میدان کو چنا اور سیاسی گرما گرمی کے عہد میں گجرات سے انگریزی میگزین''Voice''شروع کیا۔ فخر چونکہ ترقی پسند سوچ سے تعلق رکھتے تھے لہٰذا انہوں نے ایوبی آمریت کی گرتی ہوئی دیوار کو دھکہ دینے والی سیاسی تحریک کی حمایت میں لکھنا شروع کیا اور

حکومت کو آڑے ہاتھوں لیا جس کا واضح نتیجہ ''Voice'' کی بندش کی صورت میں نکلا تو انہوں نے اردو رسالہ ''بازگشت'' شروع کر دیا۔ پالیسی پہلے والی ہی تھی چنانچہ نتیجہ بھی وہی نکلا اور یہ بازگشت زیادہ دیر سنائی نہ دے سکی۔ بعدازاں اُنہو ننے پنجابی صحافت کے اہم ماہنامہ ''ونگار'' کا اجراء کیا۔ ''ونگار'' کے پلیٹ فارم سے بھی ان کی للکار جاری رہی۔ یہ ماہنامہ پنجابی ادب وصحافت میں ایک سنگ میل کا درجہ رکھتا ہے۔ فلمساز ان کو بننے نہ دیا گیا، ملازمت انکا مزاج نہ تھی، صحافت میں وہ کامیاب نہ ہوسکے۔ تو پھر زندگی میں کامیابی کے لیے ان کے پاس ایک ہی راستہ بچا تھا اور وہ تھا سیاست کا۔ اس کے جراثیم ان میں خاندانی طور پر موجود تھے۔

شروع سے ہی ان کا ترقی پسند رجحانات کی طرف جھکاؤ تھا اس لیے وہ اس زمانے میں ذوالفقار علی بھٹو کی کرشماتی شخصیت سے متاثر ہوئے اور ۱۹۷۰ء میں انہوں نے باقاعدہ طور پر پیپلز پارٹی کی رکنیت اختیار کی اور پیپلز پارٹی کے جھنڈے تلے اپنی سیاسی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں وہ پارٹی کے لیے خاصے متحرک رہے اور ان انتخابات میں گجرات کے سیاسی حوالے سے متحرک کردار ادا کیا اور پیپلز پارٹی کے صوبائی امیدوار سید امیر حسین شاہ المعروف کاکوشاہ کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا۔ چند ماہ بعد کاکوشاہ کے انتقال کے باعث ۲۸/نومبر ۱۹۷۱ء کو منعقد ہونے والے ضمنی الیکشن میں حصہ لیا مگر کامیاب نہ ہوسکے۔

الیکشن میں شکست کے باوجود وہ سیاست میں خم ٹھونک کر موجود رہے اور آنے والے دنوں میں کامیابیوں پر کامیابیاں حاصل کر کے اپنے سیاسی وسماجی تدبر کا لوہا منوایا۔ سیاسی فکر کی بنیاد پر انہوں نے پیپلز پارٹی کو منظّم وفعال بنانے کے لیے عملی طور پر نظریاتی کام اس وقت شروع کیا جب برسر اقتدار جماعت حکمرانی میں مشغول ہو کر رہ گئی اور نومولود پارٹی کی تنظیم سازی ان کی پہلی ترجیح نہ رہ سکی۔ فخر زمان نے ۱۹۷۳ء میں اس حوالے سے ایک فکر انگیز مضمون ''پاکستان پیپلز پارٹی کو کیسے فعال بنایا جائے'' لکھا۔ یہ مضمون اور اس میں دی گئی تجاویز ان کے سیاسی فہم و فراست کو ظاہر کر رہی تھیں۔ چنانچہ ذوالفقار علی بھٹو نے بھی اس کا نوٹس لیا اور ملاقات کے لیے گورنر ہاؤس لاہور مدعو کیا۔ ملاقات سے پہلے انہوں نے اپنے عمرانیات کے ماہر دوست نظام الدین سے مشورہ کیا جو آج کل کو یونیورسٹی آف گجرات کے وائس چانسلر ہیں اور پاپولیشن کے شعبے میں ملازمت کے دنوں کے فخر زمان کے دوست بھی۔ ان کی مشاورت اور اپنی سوجھ بوجھ کی بنیاد پر انہوں نے ملاقات میں بھٹو کی پارٹی کو فعال بنانے کے لیے یہ پختہ تجاویز دیں اور کہا کہ پارٹی میں ویمن ونگ کا قیام عمل میں لایا جائے۔ بھٹو صاحب کو یہ تجاویز پسند آئیں وہ خود بھی پارٹی کو مضبوط بنانے کے لیے ہر سطح پر انتخاب چاہتے تھے انہوں نے پارٹی میں ویمن ونگ کے الیکشن کروانے کی ذمہ داری بھی انہی کو سونپ دی۔ بیگم نصرت بھٹو چونکہ ان دنوں پارٹی کی چیف آرگنائزر تھیں اس لیے فخر زمان کو ان کا پولیٹیکل ایڈوائزر بھی مقرر کر دیا گیا۔ فخر زمان نے کمال دانشمندی اور سیاسی تدبر سے پارٹی میں مرکزی سطح سے لے کر صوبے اور تحصیل کی سطح تک غیر جانبدارانہ الیکشن کروائے۔ انہوں نے دو، اڑھائی سال کے مختصر عرصے میں ویمن ونگ کے حوالے سے اپنی ذمہ داریوں کو خوش اسلوبی سے نبھایا کہ بیگم نصرت بھٹو بہت خوش ہوئیں۔ اس کامیابی پر ذوالفقار علی بھٹو کا ان پر اعتماد اور بڑھا اور انہیں پیپلز پارٹی کی جانب سے سینٹر منتخب کروایا نیز انہیں پارٹی الیکشن کروانے کا ٹاسک بھی دے دیا مگر قبل اس کے کہ پارٹی انتخابات ہوتے انہوں نے خود ہی ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات کا اعلان کر دیا۔

۱۹۷۷ء کے انتخابات کے بعد صورتحال یکسر بدل گئی اور جنرل ضیاء الحق کا مارشل لاء لگ گیا تو وہ ملک سے باہر چلے گئے کچھ عرصہ لندن میں رہے پھر اپنے کالج کے زمانے کے دوست ریاض چیمہ کے پاس سویڈن چلے گئے۔ اسی دوران سویڈن کی ایک یونیورسٹی میں لیکچر بھی دیتے رہے۔ بعدازاں وطن واپس آ کر پھر سیاست میں متحرک ہوگئے اور محترمہ بینظیر بھٹو کا اعتماد بھی حاصل کیا۔ ۱۹۸۹ء میں انہیں پیپلز پارٹی پنجاب کا صدر بنا دیا گیا، وہ تین سال تک اس عہدے پر فائز اور سرگرم رہے۔ ان دنوں پنجاب کے ۲۹ اضلاع تھے بحیثیت صوبائی صدر انہوں نے ۲۸ اضلاع کا دورہ کیا اور تمام اضلاع کی بار سے بھی خطاب کیا۔ انہوں نے ہر تحصیل کی سطح پر ورکرز کنونشن بھی منعقد کروائے اور ان میں ذاتی دلچسپی لی۔ ان کے ہمراہ سجاد بخاری، الطاف قریشی اور طارق خورشید و دیگر بھی ہوتے تھے۔ انہوں نے پارٹی معاملات میں اس قدر دلچسپی لی کہ صوبائی دفتر میں موصول ہونے والے ہر خط کا جواب خود دیا۔ ان کی انہی کاوشوں سے پیپلز پارٹی پنجاب میں مضبوط ہوئی۔ وہ پیپلز پارٹی پنجاب کی پالیسی پلاننگ کمیٹی کے صدر بھی رہے۔

پیپلز پارٹی ۱۹۹۳ء میں پھر برسر اقتدار آئی تو محترمہ بےنظیر بھٹو نے ان کی سابقہ خدمات کی بنا پر انہیں وفاقی وزیر کا درجہ دے کر نیشنل کمیشن آف ہسٹری اینڈ کلچر کا چیئرمین بنا دیا۔ وہ پیپلز پارٹی کی فیڈرل کونسل کے ممبر اور پی پی پی کلچرل ونگ کے صدر بھی تھے۔ ۱۹۹۴ء میں انہیں چیئرمین اکادمی ادبیات بھی بنا دیا گیا۔ اسی دور میں فخر زمان نے حکومت پاکستان کی جانب سے پاکستان کی پہلی کلچرل پالیسی کا اعلان بھی کیا۔ اس سے قبل ۱۹۷۲ء میں فیض احمد فیض ذوالفقار علی بھٹو کی کلچرل منسٹری میں ایڈوائزر تھے تو انہوں نے پوری تندہی سے کوشش کی کہ کلچر پالیسی بنائیں۔ اس حوالے سے انہوں نے کچھ رپورٹس بھی لکھیں مگر بیوروکریسی نے انہیں آگے نہ چلنے دیا جس کی وجہ سے وہ چھوڑ کر باہر چلے گئے۔ نوے کے عشرے میں فخر زمان نے اس کام کا بیڑہ اٹھایا۔ ان کے ساتھ احمد سلیم نے اس کا پہلا ڈرافٹ تیار کیا پھر مزید دانشوروں نے ڈرافٹ فائنل کیا جسے کابینہ سے منظوری کے بعد اسی دن ۲/اگست ۱۹۹۵ء کو نافذ کر دیا گیا۔ اس پالیسی کی جامعیت ہی تھی کہ یہی پالیسی نواز شریف کے دوسرے دور میں چلتی رہی۔

پھر جنرل پرویز مشرف نے بھی اسے اپنا لیا اور اب پی پی پی کی اتحادی حکومت بھی اسی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔

جنرل پرویز مشرف کے دور میں ۲۰۰۲ء میں عام انتخابات ہوئے تو فخر زمان نے ایک بار پھر الیکشن میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا اور قومی اسمبلی کے حلقہ این اے ۲۶ لاہور IX سے پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرین کے ٹکٹ پر الیکشن لڑا۔ ان کے مدِ مقابل ایم ایم اے کے لیاقت بلوچ اور مسلم لیگ قائد اعظم کے طارق بدر الدین بانڈے سمیت دس امیدوار تھے۔ یہ بات واضح ہے کہ ۲۰۰۲ء کے انتخابات بڑی حد تک انجینئرڈ تھے اور ان میں پی پی پی اور پی ایم ایل این کے امیدواران کی کامیابی کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔ اس لیے اس حلقہ سے جماعت اسلامی کے لیاقت بلوچ جو ایم ایم اے امیدوار تھے 43679 ووٹ حاصل کر کے کامیاب رہے۔ مشکل حالات کے باوجود پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرین کے امیدوار فخر زمان نے 14107 ووٹ حاصل کئے اور دوسرے نمبر پر رہے۔

اکادمی ادبیات:

فخر زمان کی قلمی وفکری کاوشوں کا ثمر تھا کہ ۱۹۹۴ء میں حکومت نے انہیں اکادمی ادبیات پاکستان کا چیئرمین بنا دیا۔ بطور چیئرمین وہ ادارے کے سہ ماہی ”ادبیات“ کے مدیرِ اعلیٰ بن گئے۔ انہوں نے ۱۹۹۴ء سے ۱۹۹۶ء کے مختصر سے عرصے میں ادب اور ادیبوں کو قومی اور عالمی سطح پر متعارف کروایا۔ ایک عالمی ادبی کانفرنس منعقد کروائی جس میں ۱۱۰ ممالک سے نامور ادیبوں اور دانشوروں نے شرکت کی۔ اس سے بھی بڑھ کر پاکستان کی تمام زبانوں میں لکھے جانے والے نصف صدی کے ادب سے نمائندہ تحریریں چن کر ان کا دنیا کی سات بڑی زبانوں میں ترجمہ کروایا۔ چھ زبانیں تو اقوام متحدہ کی تسلیم شدہ تھیں مثلاً انگریزی، ہسپانوی، ڈینش، چینی، فرانسیسی، روسی اور ساتویں زبان فارسی تھی۔ انہی کے دور میں خواتین کی نمائندہ تحریروں کو بھی ساتوں زبانوں میں ترجمہ کروایا۔ پھر چاروں صوبوں سے سولہ صوفی شعراء کے کلام کو لے کر عالمی سطح پر روشناس کروایا گیا۔ تراجم کے لیے یونیسکو اور دیگر ممالک کے سفارت خانوں سے مدد لی گئی۔ رائٹرز گیلری قائم کی گئی۔ سہ ماہی ادبیات کے چھ ضخیم عالمی نمبر شائع ہوئے۔ طویل وقفے کے بعد ۲۰۰۸ء میں پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہوئی تو اکتوبر ۲۰۰۸ء میں انہیں دوبارہ اکادمی کا چیئرمین بنا دیا گیا۔ انہوں نے پھر جوش و جذبے سے کام شروع کر دیا ہے۔

ادبی زندگی:

فخر زمان کا ”جٹ گھرانہ“ یوں تو پڑھا لکھا تھا اور اس میں اخبار ورسائل پڑھنے کے شوقین بھی موجود تھے مگر اس خاندان میں کوئی ادیب یا شاعر نہ تھا گھریلو ماحول نے انہیں پڑھنے کی ترغیب دی اور گجرات کی علمی وادبی فضا نے ان کے ذوق کو فروغ دیا اور زمیندار کالج نے انہیں بنیاد فراہم کی۔ چنانچہ انہوں نے پڑھنے کے ساتھ ساتھ لکھنا بھی شروع کر دیا۔ امرتا پریتم، شریف کنجاہی، کافکا، کامیو کے ساتھ ساتھ سعادت حسن منٹو ان کو ہمیشہ پسند رہے۔ ناول نگاروں میں شوکت صدیقی، قرۃ العین حیدر اور عبداللہ حسین انہیں اچھے لگتے ہیں۔ شاعری میں میر، غالب، اقبال اور فیض احمد فیض اور منیر نیازی فیورٹ ہیں لیکن علاقائی اور صوفی شاعری انہیں زیادہ بھاتی ہے۔ بلھے شاہ کا اینٹی مُلا ازم، شاہ حسین اور خواجہ غلام فرید کے کلام میں عشق کی سرمستی نے انہیں زیادہ کھینچا اور انہوں نے ان دونوں کا خوب مطالعہ کیا۔

فخر زمان کے شعور نے آنکھ کھولی تو ان کے اردگرد لوگ تقسیم کے عمل میں اشتراک کے ٹوٹنے پر نوحہ کناں تھے چنانچہ اس دور کے ترنجن کے بول اس لہو میں ڈوبے ہوئے اُبھرے جو دریا کے دونوں کناروں سے بہا۔ اسی فضا میں فخر زمان نے لکھنا شروع کیا۔ ان کے شعروں کا پہلا مجموعہ کلام اردو میں ۱۹۶۹ء میں ”زہراب“ کے نام سے ہوا۔ پنجابی میں لکھنے کی ترغیب انہیں ریڈیو پاکستان لاہور اسٹیشن کے مقبول دیہاتی پروگرام کی پروڈیوسر زریں نگار شاہد نے دی اور انہیں ریڈیو کے لیے نشریاتی پنجابی ڈرامہ لکھنے کے لیے کہا۔ اس سے قبل مادری زبان سے ان کا تعارف ضرور تھا مگر انہوں نے اس میں لکھا نہیں۔ انہوں نے پہلا پنجابی ڈرامہ ”اکھیاں دی لو“ تحریر کیا۔ ڈرامے کو پذیرائی ملی جس سے انہیں پنجابی لکھنے کا حوصلہ ملا اور انہوں نے مسلسل پانچ ڈرامے لکھے۔ ان کے ڈراموں کا پہلا پنجابی مجموعہ ۱۹۷۰ء میں ”چڑیاں دا چنبہ“ کے نام سے شائع ہوا۔ جس میں چار ڈرامے (۱) اکھیاں دی لو (۲) چانن (۳) ون دا بوٹا (۴) چڑیاں دا چنبہ شامل تھے۔ ۱۹۷۱ء میں ان کے نشری ڈرامے ”ون دا بوٹا“ کے نام سے چھپے جن میں پہلے چار ڈراموں کے ساتھ دو مزید پنجابی ڈرامے (۵) ایہہ پُتر ہٹاں دے نہیں وکدے“ اور ”زمین دے ساک“ شامل تھے۔ ان کے علاوہ انہوں نے ایک اور ڈرامہ ”زنجیر“ بھی لکھا۔ ان کا پہلا ناول ”ست گواچے لوگ“ تھا۔ اس کے بعد فخر زمان نے مسلسل لکھا جو مسلسل شائع بھی ہوتا رہا۔ ان کی شائع شدہ کتب کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

اردو کتابیں:

زہراب	(شاعری)
دیواریں	(ٹی وی ڈرامہ)
گردش میں پاؤں	(سفرنامہ)
کالعدم تحریریں	(پنجابی ناولوں اور شاعری کے اردو تراجم)
قیدی	(ناول: ترجمہ)
سات گمشدہ لوگ	(ناول: ترجمہ)
اِک مرے بندے دی کہانی	(ناول: ترجمہ)
بے وطن	(ناول: ترجمہ)
کم ذات	(ناول: ترجمہ)

پنجاب، پنجابی اور پنجابیت (انٹرویو)
تُو کہ میں (ناول: ترجمہ)
نصرت بھٹو: ایک عظیم لیڈر (چند یادیں، چند باتیں)
راستے کی دھول (شاعری)

پنجابی کتابیں

چڑیاں دا چنبہ (نثری ڈرامے
ون دا بوٹا (نثری ڈرامے
کنسو یلے دی (شاعری)
ونگار (شاعری)
ست گواچے لوگ (ناول)
اک مرے بندے دی کہانی (ناول)
بندی وان (ناول)
بے وطنا (ناول)
کمذات (ناول)
زوال دی گھڑی (شاعری)
توں کہ میں (ناول)
پنجاب، پنجابی تے پنجابیت (طویل انٹرویو)

انگریزی کتابیں:

پاکستانی رائٹرز (سروے رپورٹ)
بھٹو دی پولیٹیکل تھنکر (سیاسیات)
زیڈ اے بھٹو پورٹریٹ آف پرائم منسٹر (مرتب)
ڈیڈ مینز ٹیل (ناول: ترجمہ)
دی آؤٹ کاسٹ (ناول: ترجمہ)
دی لوبارن (ناول: ترجمہ)
پروفائل آف اے لیڈر (مرتب)
دی پرزنر (ناول: ترجمہ)
دی ایلین (ناول: ترجمہ)
دی لاسٹ سیون (ناول: ترجمہ)

فخر زمان کے انقلابی خیالات، جدید اسلوب اور جرأت مندانہ تحریروں کی وجہ سے جنرل ضیاء الحق کے دور میں ان کی کتب پر پابندی لگا دی گئی۔ ۸؍جون ۱۹۷۸ء کے روزنامہ پاکستان ٹائمز لاہور کے ایڈیشن میں اے پی پی کے ذرائع سے خبر شائع ہوئی کہ فخر زمان کی چار کتابوں (۱) ست گواچے لوگ (۲) اک مرے بندے دی کہانی (۳) کنسو یلے دی (۴) ونگار حکومت پنجاب نے مغربی پاکستان کے پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈیننس مجریہ ۱۹۶۳ء کے سیکشن ۳۹ کے تحت ان میں درج فحش مواد کی بنا پر ضبط کر لی ہے۔ عوامی مسائل کو ادب کا موضوع بنانے والوں پر فحاشی اور کفر کے فتوے کوئی نئی چیز نہیں تھی لیکن کسی ادیب کی بیک وقت چار کتب کی ضبطی انہونی سی بات تھی۔ اس کے خلاف برطانیہ، کینیڈا، روس سمیت کئی ممالک کے پنجابی حلقوں نے پرزور احتجاج کیا۔ اندرون ملک سے بھی نامور ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور ادبی تنظیموں نے آواز بلند کی۔ فخر زمان نے ۱۰؍جولائی ۱۹۷۸ء کو نامور قانون دان اور گجراتی سپوت چوہدری اعتزاز احسن ایڈووکیٹ کے ذریعے لاہور ہائی کورٹ میں رٹ دائر کی۔ ۱۴؍اکتوبر ۱۹۷۸ء کو ہائی کورٹ کے جسٹس اے۔ ایس۔ سلام نے رٹ درخواست باقاعدہ سماعت کے لیے منظور کر لی۔ یہ کیس عدالت میں لٹکا رہا اور بالآخر ۱۵؍فروری ۱۹۹۶ء جسٹس چوہدری خورشید نے ان کے حق میں فیصلہ دے کر مسئول الیہ کو ایک ہزار جرمانے کی سزا سنائی۔

فخر زمان کی نثر و نظم کا جائزہ لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ ان کی فکر و تحریر کے رجحان کا ایک سرا بابا فرید سے چل کر ہمارے زمانے تک آتا ہے جبکہ دوسرا ترقی پسند عالمی ادب کے ساتھ جُڑا ہوا ہے جس کے نتیجے میں سیکولر ہے چنانچہ کہا جا سکتا ہے فخر زمان کہ حقیقت پسندی اور نئی دریافتوں کا عاشق اور انسانی آزادی کا محرم راز ہے۔ وہ وجودیت پرست ہے لیکن پاکستانی سارتر نہیں، وہ کامیو کو پسند کرتا ہے لیکن اس سے فلسفیانہ تعلق قائم نہیں کرتا۔ دراصل فخر زمان کو لن ولسن کے نادریافت شدہ اجنبیوں میں سے ایک دکھائی دیتا ہے جو منزل سے آشنا ایسے تنہا مسافر ہیں جن کو کوئی نامعلوم اندرونی قوت ایسے مقام کی طرف لے جارہی ہے جہاں سے مراجعت ممکن نہیں۔

فخر زمان کی تحریروں کے تاریخی تجزیے سے واضح ہوتا ہے کہ وہ قلمکاروں کے اُس نژادِ نو سے تعلق رکھتے ہیں جنہوں نے عنفوانِ شباب میں ظہور پاکستان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس کے سایہ مہر و وفا میں پلے بڑھے۔ یہ وہی نسل ہے جس نے اس وطن کو اپنی امنگوں کا مرکز اور آرزوؤں کی آماجگاہ بنایا۔ مگر اے وائے کہ انہوں نے ایک چھوٹی سی اقلیت کو ریاست کے دستِ تعدی کے ذریعے تحکم اور بربریت سے ایک اقلیتی جابرانہ حکومت میں بدلتے دیکھا۔ فخر اس نسل کا لکھاری ہے جس نے خواب و حقیقت، وعدے اور ہیئت عملی، قول و فعل اور عمال کے راج کے تضادات کا عینی مشاہدہ کیا۔ تضاداتِ عمل اور جداگانہ پیمانوں کی عمل پذیری کے منظر نے ان کے حساس دل کو برہم کر دیا اور انہوں نے قلم کو نشتر بنانے کی ٹھان لی۔ یہی وجہ ہے کہ حقیقت کے چہرے سے پردہ کشائی کے لیے انہیں کبھی تو منکشف حالات کے دُکھ سہنے پڑے اور کبھی سر بکف نکلنا پڑا۔

ورلڈ پنجابی کانگرس:

مغربی پنجاب وہ بدنصیب خطہ ہے کہ جس کے باسیوں نے اپنی زبان و ثقافت کو ہمیشہ پس پشت رکھا۔ پنجابی اور پنجابیت سے دوری ہی کی وجہ سے وہ پنجابی کے کلاسیکل شعراء کے عظیم ورثے کے ملک ہوتے ہوئے بھی اپنی

پہچان سے تہی دامن رہے۔تقسیم ہند سے قبل پنجاب میں پنجاب اور پنجابی ادب سے محبت کی ایک لہر موجود تھی مگر تقسیم کے بعد محبت کی یہ لہر صوبائی تعصب کے الزامات تلے دب گئی۔فخر زمان نے جب ادبی میدان میں قدم رکھا تو اردو میں شروعات کے باوجود پنجاب اور پنجابی کے متعلق اُن کے خیالات بہت واضح تھے۔پنجاب اور پنجابی سے محبت شاید اُن کی گھٹی میں پڑی تھی۔فخر زمان کے دادا انجینئر چوہدری مولا داد جدید پنجابی ادب کے پہلے نقاد انجینئر بابا بدھ سنگھ کے قریبی دوست تھے۔دونوں دوستوں میں کئی اقدار مشترک تھیں، پیشے کے اعتبار سے انجینئر ہونے کے باوجود دونوں ڈھڈی گوت سے تعلق رکھتے تھے۔(یاد رہے کہ صوفی شاعر شاہ حسین بھی ڈھڈی گوت سے تعلق رکھتے تھے) بابا بدھ سنگھ جی سکھوں کے تیسرے گُرو گرو امر داس جی کی چودھویں پشت سے تھے۔اسی خاندانی پس منظر اور پنجابی تاریخ و ادب کے ساتھ گہرے خاندانی روابط نے ہی کہیں فخر زمان کے اندر پنجاب، پنجابی اور پنجابیت کی وہ جوت جگائی جو آنے والے وقت میں اُن کی پہچان بن کر رہ گئی۔فخر زمان نے پہلے تو پنجابی زبان میں متواتر لکھ کر پنجاب کے لکھاری اور دانش ور طبقے کو خوب جھنجوڑا اور آخر کار ۱۹۸۴ء میں خوابِ خرگوش میں مست پنجابیوں کو بیدار کرنے کے لیے چند ساتھیوں سے مل کر ورلڈ پنجابی کانگرس کا قیام ممکن بنایا۔

پنجابی اور پنجابیت عرصہ دراز سے بحران کا شکار ہے۔دنیا بھر کے کروڑوں لوگ یہ زبان بولتے ہیں۔پاکستان اور ہندوستان کے علاوہ کینیڈا، امریکہ، برطانیہ، جرمنی، ناروے، سویڈن، ڈنمارک، ہالینڈ، ملائیشیا، سنگاپور، تھائی لینڈ، متحدہ عرب امارات وغیرہ ہر جگہ پنجابی بولنے والے پائے جاتے ہیں اسے دنیا کی دسویں بڑی زبان ہونے کا درجہ حاصل ہے۔اس زبان یا ماں بولی کا تحفظ کرنے اور اسے جائز مقام دلانے اور اپنی مٹی سے جڑی ثقافت کو بچانے کا عہد کر کے چند ادیبوں و دانشوروں نے اکٹھے ہو کر فخر زمان کی قیادت میں پنجابیت کا چراغ روشن کیا۔ضیاء الحق عہد کے فسطائی تعصب، نفرت اور ہندوستان دشمنی کے سیاہ دور میں امن، محبت اور بھائی چارگی کا علم بلند کر کے ۱۹۸۴ء میں لاہور میں ورلڈ پنجابی کانگرس کا قیام عمل میں لایا گیا۔پنجاب کی تاریخ نویسی میں پیدا ہونے والے نفرتوں کے بگاڑ کا از سر نو جائزہ لینے کے لیے ۲۵ سے ۲۸ اپریل ۱۹۸۶ء تک لاہور میں پہلی عالمی پنجابی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں دنیا بھر سے پنجابیوں نے بھرپور شرکت کی۔اس کے بعد دوسری عالمی کانفرنس ۱۹۹۲ء میں ہوئی، دسمبر ۲۰۰۰ء میں چندی گڑھ میں، ۲۰۰۱ء میں لاہور میں، ۲۰۰۲ء میں لندن میں، ۲۰۰۳ء میں کینیڈا میں، ۲۰۰۵ء میں لاہور اور پھر ۱۸ سے ۲۰ جولائی ۲۰۰۸ کو یونیورسٹی آف گجرات میں منعقد ہوئی۔فخر زمان صرف پنجابی زبان کے علمبردار نہیں وہ علاقائی زبان و ادب کو فروغ دے کر ان سے گہرا، مضبوط اور بلیغ رابطہ قائم کر کے جذباتی اور روحانی ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ان کی پنجابیت دوسروں سے نفرت پر نہیں بلکہ محبت اور امن پر کھڑی ہے۔فخر زمان درست طور پر سمجھتے ہیں کہ زبان و ادب میں کوئی جبر و تسلط نہیں ہونا چاہیے۔کیونکہ زبان و ادب کی دنیا رواداری اور محبت کی دنیا ہے۔ادب باہمی خیر سگالی اور افہام و تفہیم کا نہایت مؤثر اور یقینی ذریعہ ہے اسی لیے اس نے اسے اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے۔

اعزازات:

فخر زمان کی خدمات کو عالمی سطح پر سراہا گیا ہے۔اس کی تصانیف کے دنیا بھر کی زبانوں میں ترجمے ہوئے ہیں۔کئی ممالک کے پنجابی نصاب میں ان کی کتب لازمی پرچہ کے طور پر شامل ہیں۔ان پر پی۔ایچ۔ڈی سطح کے مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ان کو عالمی سطح پر ایوارڈز بھی دیئے گئے۔ان کی ادبی خدمات پر حکومت پاکستان نے ۱۹۹۴ء میں انہیں ستارۂ امتیاز سے نوازا۔ناول نگاری ان کی خاص پہچان ہے۔انہیں بیسویں صدی کے بہترین پنجابی ناول نگار کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہوئے کئی اداروں نے ایوارڈ دیا۔دہلی میں ۲۰۰۰ء میں انہیں ”میلینیم ایوارڈ“ دیا گیا۔فخر زمان ادیبوں کی عالمی کانفرنس کے سیکرٹری جنرل رہ چکے ہیں۔وہ انٹرنیشنل انسٹیٹیوٹ آف سنٹرل ایشین سٹڈیز ثمر قند، ازبکستان کی اکیڈمک کونسل کے چیئرمین بھی منتخب ہوئے۔حکومت پاکستان نے ان کی مجموعی خدمات کو سراہتے ہوئے ۲۰۰۸ء میں ہلال امتیاز دیا۔۲۰۰۸ء میں ہی ہندوستانی سرکار (ایسٹ پنجاب) کی طرف سے ”شرومنی ساہتک ایوارڈ“ دیا گیا۔یہ کسی بھی پاکستانی کو ملنے والا سب سے بڑا ہندوستانی ایوارڈ ہے۔

مختصراً یہ کہ فخر زمان کی حیات و فن کا جائزہ یہ نمایاں کرتا ہے کہ وہ عوام کے متعلق لکھتے ہی نہیں بلکہ ان کے لیے ان کی زبان میں ہی لکھتے ہیں۔ان کا قلم جب بھی حرکت میں آتا ہے کوئی نہ کوئی عوامی مسئلہ یا قومی مشکل ان کے لاشعور، ان کے تخلیقی ابال، ان کی فنکاری کے پس منظر کی حیثیت سے ان کی تحریروں میں موجود ہوتی ہے۔لیکن ان کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی تخلیقات میں مسائل کو سماجیات، شماریات یا اقتصادیات کے ماہرین کے انداز میں بیان نہیں کرتے بلکہ عوامی مسائل کو اپنے جذباتی ذہنی اور وجدانی نظام میں رچا بسا کر اور اسے اپنی فکر کا جزو بنا کر پیش کرتے ہیں اس طرح ان کی تخلیقات کی زدکاری کے ظاہر کی بجائے اس کی روح پر پڑتی ہے۔کچھ نقاد انہیں متعصب فکر لکھاری سمجھتے ہیں۔پیپلز پارٹی سے ان کا تعلق ان کے نظریات کی مخالفت کے لیے کافی سمجھا جاتا ہے۔حالانکہ وہ عوامی مسائل کا اعتراف کر کے ایک ذمہ داری قبول کرتے ہیں۔ذمہ داری کمٹمنٹ طلب کرتی ہے اور کمٹمنٹ سے کسی بھی ادیب کی غیر جانبداری ختم ہو جاتی ہے۔فخر پر بھی جانبدار ادیب ہونے کا الزام ہے۔لیکن ادیبوں سے قطع نظر کر کے دیکھئے دنیا میں کون سا انسان غیر جانبدار رہ سکتا ہے سب اپنے اپنے نظریات اور تعصّبات کے اسیر ہیں۔اور جو شخص کسی نظریے، کسی تعصب میں مبتلا نہ ہو وہ اپنے ہوش و حواس سے دست کش ہو چکا ہوتا ہے۔ادیب تو معاشرے کی حساس ترین مخلوق ہے وہ غیر جانبدار کیسے رہ سکتا ہے۔۔۔؟

باقی صفحہ ۴۵ پر ملاحظہ کیجیے

براہِ راست

کرۂ ارض پر انسانی زندگی کا وجود زمین سے تعلق کی بنیاد پر قائم ہے۔ جس چیز کا زمین سے براہِ راست تعلق نہ ہو اُس کا زیادہ عرصہ برقرار رہنا ممکن نہیں تو دشوار ضرور ہوا کرتا ہے۔ وطنِ عزیز میں زمین سے جڑی تہذیب، ثقافت اور زبانوں کو ابتدا سے کڑے وقت کا سامنا رہا ہے۔ خوشی اس بات کی ہے کہ تمام تر نامساعد حالات کے باوجود علاقائی تہذیب، ثقافت اور زبانوں کو ہر دور میں جناب فخر زمان جیسے سرفروش، ادیب و شاعر دستیاب رہے ہیں۔ آنے والا وقت بھی روشنی کی بے شمار کرنوں سے معمور ہے۔

آج کی محفل ہم نے اردو اور پنجابی کے نامور دانشور، ادیب، شاعر، ناول نگار اور سیاستدان جناب فخر زمان کے قلمی، قلبی اور علمی تعاون سے آراستہ کی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اگر آپ کا تعاون اور خدائے ذوالجلال کی کرم نوائی شامل حال رہی تو یہ سلسلہ پاکستان کی دیگر علاقائی زبانوں تک بھی دراز سے دراز تر ہوتا جائے گا۔

گلزار جاوید

☆ نامور کھلاڑی اور طالب علم رہنما کو ادب کی جاگ کب اور کیسے لگی؟

☆☆ مجھے کالج کے زمانے سے ہی لکھنے لکھانے کا شوق تھا۔ ان دنوں میرا لکھنا لکھانا زیادہ تر کالج میگزین تک محدود تھا۔ جب میٹرک میں تھا تو پڑھنے کا شوق زیادہ رہا، جب ایف۔اے میں پہنچا تو گجرات میں آنے والے تمام رسائل اور کتب میرے گھر میں بک سٹال والا پہنچا دیتا تھا۔ لکھنے کا شوق کتابوں کو پڑھ کر ہوا کیونکہ میرے خاندان میں کوئی ادیب یا شاعر نہیں تھا۔ ویسے تو ماشاء اللہ سبھی پڑھے لکھے تھے اور انکا ایک مقام اور مرتبہ تھا مگر لٹریچر سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ صرف میرے اندر ہی کچھ ایسی چیز تھی جس نے مجھے لکھنے پر مجبور کیا۔ بی۔اے میں ایک افسانہ اُردو میں تحریر کیا جس کا عنوان پنجابی میں تھا ''مانواں ٹھنڈیاں چھانواں''۔ کالج میگزین، جس کا نام ''شاہین'' تھا، میں یہ پہلی بار چھپا۔ پھر کچھ انگریزی کی چیزیں بھی شائع ہوئیں۔ ان دنوں میں پنجابی میں بالکل نہیں لکھتا تھا اگرچہ پنجابی کا اثر ضرور تھا مثلاً بی۔اے میں امرتا پریتم کو بھی پڑھا اور موہن سنگھ اور شریف کنجاہی کو بھی۔ بہت سے صوفی شعراء کو بھی پڑھنے کا موقع ضرور ملا مگر پنجابی لکھنے کا خیال نہیں آیا۔ بنیادی طور پر شاعری اور افسانہ اُردو میں لکھا کرتا تھا۔

☆ لوگ اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ، برطانیہ کا رُخ کرتے ہیں۔ آپ کا انتخاب ہالینڈ کیوں ٹھہرا؟

☆☆ کوئی خاص وجہ نہیں' ایک معروف یونیورسٹی نے سکالرشپ دیا اس لیے وہاں پڑھنے چلا گیا۔

☆ کچھ روداد کوچۂ صحافت میں گذرے ایام بالخصوص ''Voice'' بازگشت' ونگار اور امروز کی ادارت کی بیان فرمائیے؟

☆☆ میرے والد جاٹ زمیندار تھے، جس کی وجہ سے ذریعہ معاش کی فکر نہ تھی۔ پڑھائی مکمل کرنے کے بعد سیاست میں آنے کا سوچا۔ میں نے لاء ضرور کیا مگر میں عدالت میں ایک دن بھی نہیں گیا۔ کافی سوچ بچار کے بعد گجرات سے انگریزی میگزین ''دی وائس'' نکالا۔ یہ وہ دور تھا جب بھٹو صاحب کی ایوب خان کے خلاف تحریک شروع ہو رہی تھی۔ ظاہر ہے ہم ترقی پسندی کے حوالے سے بھٹو کو پسند کرتے تھے اور فوجی ڈکٹیٹر شپ جس کا ایوب دعویدار تھا، اس کے مخالف تھے۔ ''دی وائس'' کے چار پرچے نکلے۔ میں ایوب خان کے خلاف کافی سخت لکھ رہا تھا۔ ''دی وائس'' چار پانچ ماہ بعد بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد اسی مناسبت سے ''بازگشت'' کے نام سے اُردو کا پرچہ نکالا۔ کچھ ماہ چلنے کے بعد اس پر بھی پابندی لگا دی گئی لیکن میری صحافتی زندگی میں پنجابی ماہنامہ ''ونگار'' کئی حوالوں سے قابل ذکر کہا جا سکتا ہے۔ اسے پنجابی ادب و صحافت میں ایک سنگِ میل کا درجہ حاصل ہے۔ روزنامہ ''امروز'' کی ادارت کبھی نہیں کی۔

☆ فلمی دنیا سے آپ کا رومانس اور فلم بنانے کی خواہش کے پیچھے کیا عزائم کارفرما تھے؟

☆☆ پاکستان کی سیاسی تاریخ ذوالفقار علی بھٹو کی طلسماتی شخصیت کا ذکر کیے بغیر نامکمل رہتی ہے۔ میری زندگی کی بہت بڑی خواہش رہی ہے کہ میں جناب بھٹو کی زندگی پر فلم بناؤں۔ اب میرا بیٹا فرخ میرے ناول بندی وان کو فلم کا روپ دے رہا ہے، جس کا بنیادی کردار جناب ذوالفقار علی بھٹو کی شخصیت ہے۔

☆ کچھ کے خیال میں آپ انقلابی، کچھ کی رائے میں انتہا پسند اور کچھ لوگ آپ کو باغی کے طور پر پیش کرتے ہیں جبکہ آپ کا خاندانی پس منظر ان باتوں سے میل نہیں کھاتا؟

☆☆ یہ تینوں حیثیتیں ایک مقام پر اکٹھی ہو جاتی ہیں یعنی سٹیٹس کو کے خلاف بات کی جائے تو آپ بیک وقت انقلابی' انتہا پسند اور باغی کہلاتے ہیں کیونکہ جامد اور فرسودہ نظریات کے حامل سیاسی نظام والے آپ کے خیالات سے اتفاق نہیں کرتے۔

☆ یہ سوال بجائے خود وضاحت طلب ہے کہ آپ دھتکاری ہوئی چیزوں کا ساتھ دیا کرتے ہیں؟

☆☆ سیاسی ورکر کے بطور میری کمٹ منٹ ہمیشہ افتادگان کے ساتھ رہی

ہے۔ذلتوں ماری عوام سے سیاسی وابستگی کا تقاضا ہے کہ ان کا ساتھ دیا جائے اور انہیں اس دلدل سے نکالا جائے جن کا وہ صدیوں سے شکار ہیں۔

☆ ''ماواں ٹھنڈیاں چھاؤں'' کن احساسات کے زیرِ اثر وجود میں آئی اور اُس کے بعد آپ کا ادبی سفر کس رُخ پر گامزن ہوا؟

☆☆ میں یہ دعویٰ تو نہیں کرتا کہ میں نے بہت زیادہ لکھا ہے۔میری اب تک چھپنے والی کتابیں تیس کے قریب ہیں۔میں پنجابی، اُردو اور انگریزی میں لکھتا ہوں۔میں اس طرح کا پروفیشنل رائٹر تو نہیں ہوں جو صبح اُٹھ کر ناشتے کے بعد کمپیوٹر پر بیٹھ جاتا ہے اور روزانہ چار گھنٹے ضرور لکھتا ہے۔میرا تو یہ ہے کہ بعض اوقات دو دو سال تک کچھ نہیں لکھتا کیونکہ میرے ذہن میں کوئی چیز پکتی رہتی ہے اور جب میرے کمپیوٹر ذہن میں سب کچھ محفوظ ہو جاتا ہے تو لکھنے میں دیر نہیں لگاتا۔میری پہلی کتاب 1970ء میں ''زہراب'' کے نام سے اُردو شاعری کی چھپی۔اس کے بعد اُردو کے ٹی وی ڈراموں کی کتاب ''دیواریں'' کے نام سے چھپی۔ایک دن ریڈیو کی ایک پروڈیوسر زریں نگار شاہد نے مجھے فون کر کے کہا پنجابی میں ایک ڈرامہ لکھوں۔میرے گھر میں یہی زبان بولی جاتی ہے۔میں پنجابی پڑھتا ضرور رہا تھا مگر اس میں لکھنے کا دھیان کبھی نہیں آیا تھا۔انہوں نے کہا لکھیں تو میں نے ایک ڈرامہ ''اکھیاں دی لو'' دیہاتی پروگرام کے لئے لکھا۔یہ میری پہلی پنجابی تحریر تھی۔ڈرامے کے آرٹسٹ بہت اچھے تھے، بہت اچھا پروڈیوس ہوا تھا۔ان دنوں ریڈیو بہت سنا جاتا تھا۔لوگوں نے تعریفی خطوط بھی لکھے اور یقین کریں مجھے بھی لکھ کر بہت مزہ آیا۔پنجابی لکھنے کا آغاز یہاں سے ہوا۔جس کے بعد میں نے لگاتار پانچ ریڈیو ڈرامے لکھے۔ایک ڈرامہ بہت مقبول ہوا۔بہت دفعہ چلا بلکہ اس کی ٹی وی پر بھی سیریز چلتی رہی۔''چڑیاں دا چنبہ'' اس کا نام تھا۔اس کے بعد 1974ء میں میری پنجابی شاعری کی پہلی کتاب ''کنسو ویلے دی'' آئی۔دوسری کتاب بھی شاعری کی تھی ''ونگار''۔پھر ایک میجر بریک تھرو ہوا، جب میرا پہلا ناول ''ست گواچے لوک'' چھپا۔اس سے نیا رجحان سیٹ ہوا۔ہندوستان میں اس کا بہت چرچا ہوا یہاں تک کہ امرتا پریتم نے ٹی وی پر آ کر بہت تعریف کی اور ایک بحث شروع ہو گئی۔اعلیٰ درجے کے نقّادوں نے اس پر تعریفی کلمات کہے پھر میرے اگلے پنجابی ناولوں کا سلسلہ چل پڑا۔

☆ آپ کی شاعری میں نفرت کی فضا کب اور کس طور در آئی نیز اس نفرت کا نشانہ کون ہے؟

☆☆ بدبودار ماحول' سیاسی تعفن اور منافقت کے ساتھ نفرت کرنا انسان ہونے کی دلیل ہے۔جو لوگ ایسے ماحول کے ذمہ دار ہیں وہی میرا نشانہ ہیں۔

☆ ہر طرح سے مطمئن اور خوشحال قلم کار کے ہاں انتظار کی کیفیت کا پایا جانا بھی سوالیہ نشان ہے؟

☆☆ خوشحال قلمکار کا وژن اور شدتِ مشاہدہ اُسے اُفتادگانِ خاک کی آسوں پیالوں، اذیتوں اور کسمپرسی کا ادراک بخشتا ہے۔دنیا میں نامور لوگ معاشی لحاظ سے آسودہ تھے لیکن اُنہوں نے غریب عوام سے کمٹمنٹ دکھائی اور اُن کی زندگیاں آسان بنانے کے لیے زندگی کا نذرانہ بھی پیش کیا۔مثلاً اینگلز، لینن، ماوزے تنگ، چے گویرا، ذوالفقار علی بھٹو، نہرو، فیض احمد فیض، پال سارتر نے اپنے ڈرامے ''کرائم پشینال'' میں یہی سوال اُٹھایا ہے اور اس کا جواب بھی دیا ہے۔

☆ بنیادی طور پر آپ کو چھوٹی نظموں کا شاعر گردانتے والے بادی النظر میں چھوٹے سانس کا شاعر تو نہیں کہہ رہے؟

☆☆ نظم نظم ہوتی ہے خواہ بڑی ہو یا چھوٹی' ٹو دی پوائنٹ بات کسی شکل میں بھی کی جاسکتی ہے۔ویسے بھی تحریر میں طوالت کا تصور انتہائی فرسودہ ہوتا ہے۔

☆ ''اینٹی نظم'' کے شواہد دینے والے کس جانب اشارہ دلا رہے ہیں؟

☆☆ ہر عہد میں نئے تجربات ہوتے ہیں' یہ معاشرے کا تقاضا ہے کہ تجربہ کاری اور نئے وژن' ٹھہراؤ کے خلاف جنگ ہوتی رہے۔

☆ آپ کے ہاں ڈرامائی عنصر کی نشاندہی کرنے والے کیا کچھ کہنا چاہتے ہیں؟

☆☆ میں جسے ٹھیک سمجھتا ہوں کہہ دیتا ہوں۔

☆ آپ کی تخلیقات میں جنوں، بھوتوں اور آسیب کا ذکر بڑی کثرت سے کیوں پایا جاتا ہے؟

☆☆ میرے خیال میں ایسی کوئی بات نہیں۔

☆ پنجابی کی لوک کہانیاں اور کلاسیکی مغربی ادب کی آمیزش کا آئیڈیا کس طرح آپ کے ذہن میں آیا اور اس کام کو کس نظر سے دیکھا گیا؟

☆☆ ادب میں خالصیت پسندی کا استعمال نقصان دہ ہے۔

☆ آپ کی ناول نگاری کو مغربی اہلِ قلم سے بریکٹ کیا جاتا ہے اس کی ایک وجہ اکادمی کی چیئرمین شپ کے علاوہ اور کیا ہے؟

☆☆ میں نے ساری دنیا کا ادب پڑھا ہے کافکا، کامیو، ہرمن ہیسے، لورکا میرے پسندیدہ ادیب تھے۔

☆ آپ کے بارے فلاسفر کا تصور بھی فروغ پا چکا ہے۔آج کی نشست میں اپنی فلاسفی اور اُس کے ماخذ کی نشان دہی فرمایئے؟

☆☆ ہر بڑا ادیب اور نسلوں کو متاثر کرنے والا لکھاری بنیادی طور پر فلاسفر ہوتا ہے۔

☆ آپ کی منتشر خیالی کے چرچے بڑی کثرت سے سنائی دیتے ہیں۔ایک طرف آپ صوفی ازم کے شیدائی ہیں دوسری طرف ترقی پسندی آپ کے طواف میں ہے۔سوشلزم اور چے گویرا سے بھی آپ کا رومانس جاری ہے؟

☆☆ ایک سطح پر یہ تمام رجحانات اور نظریات ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے ہوتے ہیں۔

☆ آپ پاکستانی عوام کی نجات جن صوفیائے کرام کی تعلیمات میں تلاش کرتے ہیں وہ تو بجائے خود ہوس کے مارے مجاوروں، گدّی نشینوں اور

قبضہ گروپوں کی گرفت میں ہیں؟

☆☆ صوفیا اور اولیاء کے مجاور اکثر اُن کے درس و تعلیم کی نفی کرتے ہیں۔ مجاوری کی اجارہ داری سے ماورا یہ بڑے لوگ عوام کے لیے روشن مینارہ ہیں اور رہیں گے۔ اُن کے نام پر مالی منفعت حاصل کرنے والے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ گدی نشینوں اور مجاوروں کا اشرافیہ سے تعلق ہوتا ہے لیکن یہ لوگ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

☆ آپ کی ڈرامہ نگاری کا جس قدر چرچا تحریری طور پر ملتا ہے اُس قدر ایکسپوژر الیکٹرانک میڈیا پر دکھائی نہیں دیتا؟

☆☆ میڈیا کے لیے لکھنا میرے لیے کبھی شوق نہیں رہا۔ اسے ادب کی اعلیٰ صنف نہیں سمجھتا۔

☆ اب تک آپ کی تخلیقات دنیا کی کتنی زبانوں میں منتقل ہو چکی ہیں اور مستقبل میں اس حوالے سے کیا امکانات ہیں؟

☆☆ میرے علم کے مطابق میری بیشتر تخلیقات کا ترجمہ ہندی' گورمکھی' فرانسیسی، جرمن، ڈینش، انگریزی' اردو' روسی' یوکرائنی' جرمن' سویڈش' بنگالی میں ہو چکا ہے۔

☆ آپ دو مرتبہ اکادمی کے چیئرمین ایک مرتبہ نیشنل کمیشن آف ہسٹری اینڈ کلچر کے صدر رہے مگر دونوں ادارے وہیں کے وہیں کھڑے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ پیچھے چلے گئے ہیں تو زیادہ درست ہوگا؟

☆☆ میں اس بات سے متفق نہیں۔ ڈھائی تین سال کے عرصے میں، میں نے اکادمی ادبیات پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار پاکستان کے پندرہ صوفی شعراء کی کتابوں کا پندرہ زبانوں میں ترجمہ کروایا۔ اسی طرح صوبائی زبانوں کا بہت سا ادب بھی سات زبانوں میں ترجمہ کیا گیا۔ اس کے علاوہ خواتین کے افسانوں اور شاعری کا ترجمہ کئی زبانوں میں کروایا گیا۔ اس سے پہلے پاکستان کے بارے میں تصور تھا کہ پاکستان ایک بند سوسائٹی ہے مگر دنیا کو پہلی بار پتہ چلا کہ پاکستان بھی کھلی سوسائٹی ہے۔ 40 سالوں میں فارن منسٹری نے جو کام نہ کئے وہ اس انٹرنیشنل کانفرنس سے پورے ہوئے۔ چاروں صوبوں کے چودہ صوفی شاعروں کے پہلے اُردو اور پھر انگریزی، فرانسیسی، عربی، روسی اور چائنیز میں تراجم کئے۔ میں تو کہوں گا کہ ان کتابوں کا ہی اثر تھا کہ مغربی ادیب یاسیت اور وجودی کے دائرے سے نکل کر مقصدیت کی طرف آ رہا ہے۔ ایک اور اہم کام پاکستان کا مزاحمتی ادب جو ضیاء الحق کے گیارہ سالہ دورِ حکومت میں لکھا گیا تھا وہ چھاپا گیا۔ پاکستان کی آٹھ سے زائد زبانوں کی شاعری اور افسانوں کا انتخاب بھی شائع کیا گیا۔

ایک اور قابل ذکر کام تراجم کا ہے۔ اکادمی نے ازبکستان، تاجکستان، ترکمانستان، قزاقستان، کرغیستان کی قومی شاعری کے تراجم کئے۔ میں تو کہوں گا کہ یہ ریاستیں پرو پاکستان نہیں تھیں مگر میری ذاتی کاوشوں سے ان کے رویے میں تبدیلی کے آثار نظر آنا شروع ہوئے۔

اس کے علاوہ میں نے اکادمی کا کانفرنس ہال مرمت کروایا جو کہ کباڑ خانے کا منظر پیش کر رہا تھا۔ یہاں میں نے 400-300 کے قریب ادیبوں کی تصاویر آویزاں کیں۔

یہاں میں یہ ذکر کرتا چلوں کہ میں نے ادیبوں کی مالی معاونت (وظیفے) کو 500 روپے سے بڑھا کر فوری طور پر پانچ ہزار تک کر دیا۔ حادثے کی صورت میں رقم 9,000 سے بڑھا کر 25,000 تک کر دی۔ اکادمی میں کمپیوٹر نصب کروائے، ہوسٹل کو فرنشڈ کروایا۔

☆ کمالِ فن ایوارڈ کا اجراء نیک شگون سہی مگر پہلا ایوارڈ ہی جیوری کے صدر کو دے کر اس کی کریڈیبلٹی ختم کر دی گئی؟

☆☆ کمالِ فن ایوارڈ میرے دور کی ایجاد نہیں اور نہ مجھے علم ہے کہ یہ ایوارڈ کب جیوری کے صدر کو دیا گیا۔ میرے حالیہ دور میں تین بہت اہم دانشوروں کو یہ ایوارڈ یعنی اجمل خٹک، عبداللہ جمالدینی اور لطف اللہ خان کو دیا گیا۔

☆ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ "کمالِ فن ایوارڈ" کی چند بڑوں کے درمیان بندر بانٹ ہو چکی ہے یعنی تو چل میں آیا والی کیفیت نظر آتی ہے؟

☆☆ اس کا جواب میں اوپر دے چکا ہوں۔

☆ آپ کے بعد آنے والے چیئرمین عالمی انٹرنیشنل ادبی کانفرنس پر اُٹھنے والے بے جا اخراجات کے باعث ادارے کو مقروض کرنے کا الزام بھی لگایا کرتے ہیں اور مذکورہ قرض کو ادا کرنے کا کریڈٹ بھی لیتے ہیں؟

☆☆ بعض اوقات انٹرنیشنل کانفرنس کے لیے مختص بجٹ سے زیادہ خرچ آ جاتا ہے لیکن اضافی گرانٹ مل جایا کرتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جتنی بڑی عالمی کانفرنسیں محترمہ بے نظیر بھٹو کے زمانے میں اور موجود حکومت میں منعقد ہوئیں ان میں پاکستان کی ساکھ کو ساری دنیا میں متعارف کروایا گیا۔ یہ کام وزارت خارجہ اور ہمارے سفارت خانے بھی نہ کر سکے۔

☆ بھارت کی تمام صوبائی اردو اکیڈمیز اس امر کی پابند ہیں کہ وہ اپنے بجٹ کا نصف تخلیقی کتب کی اشاعت پر صرف کریں۔ ہمارے ہاں اس قسم کی کوئی روایت کیوں نہیں ملتی؟

☆☆ بھارت میں کتاب کلچر ہمیشہ سے رہا ہے۔ ہمارے ہاں کتاب پڑھنے کا رواج بہت کم ہے اور حکومتوں کی ترجیحات میں کتابوں کی اشاعت شامل نہیں رہی۔

☆ آپ کے دور میں تراجم کا بڑا چرچا ہوا آپ کے بعد صورت حال کس طرح کی ہے؟

☆☆ اس کا جواب آپ موجودہ لوگوں سے دریافت کریں تو زیادہ مناسب ہے۔

☆ ایک تاثر آپ کے بارے یہ ہے کہ آپ تمام عمر دھڑے بندی

سے نکل نہیں پائے؟

☆☆ میں اس لحاظ سے دھڑے بندی کا قائل ہوں کہ جو ادیب فوجی آمروں کے ساتھ سمجھوتہ کرتے ہیں ان سے سول ایوارڈ حاصل کرتے ہیں میرے نزدیک ان کا کردار کسی بھی لحاظ قابل ستائش نہیں۔ میں نے ہمیشہ کھل کر کہا ہے کہ فوجی آمروں سے ایوارڈ لینے والوں کو ایوارڈ واپس کرنے چاہییں کیونکہ یہ ایک ادیب اور شاعر کے منصب کے خلاف ہے۔

☆ ضیاءالحق کے دور میں آپ کی کتابوں پر پابندی لگنے کے اسباب کیا تھے؟

☆☆ یہ 8 جون 1978ء کی بات ہے جب میں نے صبح کے اخبار میں پڑھا کہ میری پنجابی کی کتابوں (اک مرے بندے دی کہانی، ست گواچے لوک، کنسو ویلے دی اور ونگار) پر حکومت پنجاب نے ضبطی کا حکم لگا دیا ہے۔ یہ برصغیر کی تاریخ میں پہلا موقع تھا کہ ایک قلمکار کی اتنی کتابوں پر بیک وقت ضبطی کا حکم لگا یا گیا۔ اس ضبطی کے خلاف میں نے مشہور قانون دان اور اپنے دوست اعتزاز احسن بار ایٹ لاء کے ذریعے 10 جولائی 1978ء کو رٹ درخواست دائر کر دی۔ یہ رٹ اپنے طور پر ایک شاہکار ادب پارے کا درجہ رکھتی ہے۔ کتابوں کی ضبطی کے حکم کے خلاف اندرون اور بیرون ملک بہت احتجاج کیا گیا۔

ہندوستان، امریکہ، برطانیہ، کینیڈا اور روس کے پنجابی حلقوں نے وسیع احتجاج کیا۔ بی بی سی نے اپنے ادبی پروگرام میں اس کے بارے میں تبصرہ کیا۔ رسالوں اور اخباروں کے علاوہ اندرون ملک بہت سی تنظیموں اور کمیٹیوں نے اس فیصلے کے خلاف قرار دادِ مذمت پاس کی جن میں پاکستان پیپلز پارٹی کی سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی پنجاب، پیٹریاٹک لائرز ایسوسی ایشن پنجاب، مزدور کسان پارٹی، قومی محاذ آزادی، نیشنل سٹوڈنٹ آرگنائزیشن، ڈیموکریٹک وومن ایسوسی ایشن، یونائیٹڈ لیبر ایکشن کمیٹی، انقلابی پرولتاری پارٹی اور ہاری کمیٹی کے ممبران شامل تھے۔ انہوں نے اس ضبطی کے حکم کی مذمت کی۔

میجر اسحاق، معراج محمد خان، بیگم طاہرہ مظہر علی، ڈاکٹر اعزاز نذیر، حبیب جالب، رسول بخش پلیجو اور وقت کے دانشوروں اور سیاسی ورکروں نے اپنی حمایت کا اعلان کیا اور پنجابی کی ان چار کتابوں کی ضبطی کے فیصلے کو متعصب انتظامیہ کا غلط اقدام قرار دیا۔ پنجاب گورنمنٹ کے ضبطی کے اس حکم کے خلاف جس طرح اندرون ملک اور بیرون ملک احتجاج کیا گیا وہ اپنی جگہ پر ایک فتح تھی۔ 14 اکتوبر 1978ء کو ہائی کورٹ میں جسٹس اے۔ ایس سلام نے رٹ درخواست باقاعدہ سماعت کے لئے منظور کی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پاکستان میں اُردو کے ممتاز افسانہ نگار منٹو کے بعد ادب کا سب سے بڑا مقدمہ دائر کیا گیا۔ اس مرتبہ پنجابی زبان و ادب کے نمائندہ شاعر کی تخلیقات پر پابندی لگا کر پنجاب دشمنی کا ثبوت دیا گیا۔ ۱۹۹۶ میں ان کتابوں پر سے پابندی اٹھائی گئی۔ یہ دنیا کی تاریخ میں واحد موقع تھا جب کسی مصنف کی بیک وقت پانچ کتابوں پر پابندی لگائی گئی۔

☆ عالمی پنجابی کانفرنس کا اجرا کن مقاصد اور پروگرام کے تحت ہوا۔ اب تک یہ تنظیم کیا خدمات انجام دے چکی ہے اور مستقبل میں اس سے کیا توقعات کی جاسکتی ہیں؟

☆☆ عالمی پنجابی کانگریس کا قیام 1984ء لاہور میں پنجابی لکھاریوں اور دانشوروں کے تعاون سے ہوا۔ مجھے اس کا چیئرمین بنایا گیا۔ جہاں اس تنظیم کا مقصد پنجابی زبان و ادب اور ثقافت کا فروغ تھا وہیں پنجاب کی تاریخ پر پڑے ہوئے دبیز پردوں کو ہٹا کر نئے سرے سے پنجابی تاریخ کو مرتب کرنا بھی شامل تھا کیونکہ آج تک پنجابی تاریخ کو مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک عظیم مقصد یہ بھی تھا کہ پنجابی شناخت کے مسئلے کو حل کیا جائے اور احیائے پنجابی کیا جائے۔

☆ ایک طرف آپ پنجابی زبان و ادب کے علمبردار کے طور پر شناخت کے خواہش مند ہیں دوسری طرف آپ فرماتے ہیں کہ علم کی کوئی زبان نہیں ہوتی؟

☆☆ زبان اظہار کا ذریعہ ہے۔ انسان مادری زبان میں اپنا مافی الضمیر بہتر انداز میں ادا کر سکتا ہے۔ دنیا کا بڑا ادب مقامی زبانوں میں ہی لکھا گیا ہے۔

☆ ''ماں بولی'' سے محبت ہر ہوش مند انسان کا فرض ہے مگر تعصب کی حد تک اس جذبے کے اظہار سے قومی سطح کے بہت سے معاملات پر کئی سوالات سر اٹھانے لگتے ہیں بسا اوقات قومی تشخص کمزور یا دھندلا بھی جاتا ہے؟

☆☆ جن ملکوں نے مادری زبان کو قومی زبان قرار دیا ہے وہاں ایسے مسائل نہیں۔ پاکستان کی تمام چھوٹی بڑی زبانیں قومی زبانیں ہیں۔ لوگوں سے ان کی زبان میں اظہار کا حق نہیں چھینا جا سکتا۔ جب مادری زبانوں کی عزت کی جائے گی تو قومی زبان اردو خود بخود ترقی کرے گی۔

☆ ایک نظریہ ہے کہ عالمی سامراج قوموں اور ملکوں کو غلام رکھنے اور بنانے کے لیے نت نئے شوشے چھوڑتا اور اُن کی سرپرستی بھی کرتا ہے؟

☆☆ میں اس خیال سے اتفاق نہیں کرتا۔

☆ تحقیق کی بات ہے کہ آئندہ پچاس سالوں میں دنیا کی بیشتر زبانیں اور ثقافت کو شدید خطرات لاحق ہیں ایسے میں علاقائی زبان اور ثقافت کا نعرہ بلند کرنا خود کو کمزور کرنے کے مترادف نہیں؟

☆☆ پہلے کون سے ترقی یافتہ ہیں۔ مسئلہ نظام کا ہے اگر جمہوریت کی بجائے آمریت ہمارے سروں پر منڈلاتی رہے گی تو ایسے مسائل سر اٹھاتے رہیں گے۔

☆ اپنی بات کو ہم اس طرح آگے بڑھانا چاہتے ہیں کہ ایک طرف آپ سامراجیت کے انہدام کی خواہش میں ایک قدم آگے بڑھانا چاہتے ہیں اور دوسری طرف علاقائی زبان وادب کی بات کر کے دو قدم پیچھے ہٹ جاتے ہیں؟

☆☆ یہ بے مقصد اور تاریخ میں غیر منطقی حیثیت کی حامل باتیں ہیں۔

☆ پیپلز پارٹی سے آپ کا رومانس کب اور کس طور شروع ہوا اور اُس

کے اسباب کیا تھے؟

☆☆ 1973ء میں پارٹی سٹرکچر کے بارے میں ایک پیپر لکھا کہ پاکستان پیپلز پارٹی کو کس طریقے سے زیادہ فعال بنایا جاسکتا ہے۔ یورپ میں پڑھائی کے دوران میں مشاہدہ کر چکا تھا کہ وہاں سوشلسٹ اور دوسری پارٹیز کیسے کام کرتی ہیں اور ہمارے ہاں کیسے ہونا چاہئے۔ اس سے پہلے بھٹو صاحب سے کئی بار ملاقات ہو چکی تھی اور وہ مجھے گجرات کے متحرک کارکن کی حیثیت سے جانتے تھے۔ انہوں نے مجھے گورنر ہاؤس بلایا اور میرے خیالات کو سراہا۔

☆ اس تاثر میں کہاں تک حقیقت ہے کہ آپ جس شوق اور جذبے کے ساتھ پیپلز پارٹی میں شامل ہوئے تھے دوسری طرف سے وہ گرمجوشی آپ کو نہیں ملی جس کی خواہش آپ دل میں لے کر گئے تھے؟

☆☆ مجھے پیپلز پارٹی نے بہت عزت دی ہے۔ میں سینیٹر، صوبائی صدر، وفاقی وزیر، کلچرل ونگ کا صدر، اکادمی ادبیات پاکستان کا چیئرمین اور پارٹی کی سینٹرل ایگزیکٹیو باڈی کا رکن رہا ہوں۔ اور گرمجوشی کسے کہتے ہیں۔

☆ اس تاثر میں کس قدر حقیقت ہے کہ آپ جیسا مہذب اور پڑھا لکھا دانشور پیپلز پارٹی جیسے بڑے اور بے ترتیب جنرل اسٹور میں انقلاب کی تلاش کا دھوکہ کھا گیا؟

☆☆ میں نے پی پی پی میں اُس وقت شمولیت کی جب ذوالفقار علی بھٹو ایک ترقی پسند، روشن خیال سوشلسٹ بن کے سامنے آئے۔ بے نظیر بھٹو تک پیپلز پارٹی کا پیغام Undiluted رہا۔ اس کے بعد بہت گڑ بڑ ہوئی۔ پارٹی کے بنیادی اصولوں کو مسخ کیا گیا اور پارٹی طالع آزماؤں اور کرپٹ لوگوں کے نرغے میں آگئی اور ابھی تک اُس سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکی۔ لیکن مجھے یقین ہے وقت آئے گا جب پارٹی Phoenix کی طرح پھر بھرپور طریقے سے سامنے آئے گی اور موقعہ پرست خس وخاشاک طرح ہواؤں میں اُڑ جائیں گے۔ اس ملک کا مستقبل روشن خیالی، ترقی پسندی اور لبرل ازم سے منسلک ہے۔

☆ اگر آپ سے ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی، بے نظیر بھٹو کی پیپلز پارٹی اور آصف علی زرداری کی پیپلز پارٹی کا تجزیہ کرنے کی درخواست کی جائے تو آپ اس آزمائش پر کس طرح پورا اتریں گے؟

☆☆ ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی ایک عوامی پارٹی ہے جس کی بنیادیں بہت گہری عوام کے دلوں تک جاتی ہیں۔

☆ آنے والے دنوں میں پیپلز پارٹی کی قیادت اور پارٹی کا مستقبل آپ کے خیال میں کیا نظر آتا ہے؟

☆☆ پیپلز پارٹی عوامی پارٹی ہے۔ اس میں موقعہ پرست اور غیر نظریاتی لوگ بھی کبھی کبھار گھومتے گھماتے آن گھستے ہیں مگر میں سمجھتا ہوں کہ نظریاتی لوگ اور کارکن ہمیشہ اس پارٹی کا اثاثہ رہے ہیں اور رہیں گے۔ میں پیپلز پارٹی کا مستقبل نہایت روشن دیکھتا ہوں۔

☆ کہا جاتا ہے کہ یزیدیت آج بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ ہماری آپ سے درخواست ہے کہ آپ اُس کی نشان دہی بھی فرمایئے اور حسینؑ کے پیروکاروں کی خاموشی کا سبب بھی بتلایئے؟

☆☆ جب تک یہ دنیا قائم ہے اچھائی اور برائی کا وجود رہے گا۔

☆ ایک سے زیادہ صلاحیتوں اور شعبوں میں برسرِ پیکار شخصیات کو ہر شعبہ دوسرے شعبہ کا فرد جان کر استحقاق کے مطابق اہمیت اور توجہ نہیں دیتا۔ آپ ہمیں اپنے تجربات میں کچھ اسی طرح شریک کیجیے کہ ہم آپ کی وضاحت اور کامیاب شناخت سے آگاہی حاصل کر سکیں جسے آپ مستقبل میں بھی اپنانے کے خواہش مند ہوں؟

☆☆ میں سیاست دان اور ادیب ہوں۔ سیاست اور ادب کو الگ الگ خانوں میں نہیں رکھا جاسکتا۔ آج کا ادیب شتر مرغ کی طرح ریت میں سر چھپا کر اپنے ارد گرد کے حالات سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔ اُسے اپنے آپ کو بہر صورت involve کرنا ہے۔ جو ادیب انسانی زندگی کو purify کرنے کا کام نہیں کرتا میں اُسے ادیب نہیں مانتا۔ اعلیٰ سماج کی تشکیل کے لئے ادیب کو بندوق بھی اٹھانی پڑے تو گریز نہیں کرنا چاہیے۔ میں سیاست میں ادب کو اس لئے بھی شامل کرتا ہوں تاکہ سیاست صاف شفاف، اعلیٰ انسانی اقدار کی حامل ہو۔ سیاست کی اپنی جمالیات ہو۔ کومٹ منٹ کا لفظ بھی ایک cliche بن چکا ہے مگر پھر بھی کومٹ منٹ ضرور ہوتی ہے۔ وفاداری ہر حال میں رہتی ہے اور وہ عوام کے ساتھ۔ جتنا آپ کا نظریہ اور مقصد اعلیٰ ہوگا اتنی ہی کومٹ منٹ بھی شدید ہوگی اور وہ کومٹ منٹ آپ کو مقصد کے حصول میں کامیاب کرتی ہے۔

☆ نیو ورلڈ آرڈر اور ہمارے وطن کی بابت طرح طرح کی پیش گوئیاں اور قیاس آرائیاں کھلے عام ہو رہی ہیں۔ اس حوالے سے ہم اپنے دور کے نامور دانشور، ادیب، شاعر اور سیاستدان کے خیالات سے مستفید ہونا ضرور چاہیں گے؟

☆☆ پاکستان قائم رہنے کے لیے بنا ہے صوفیہ کی اس دھرتی کو دہشت گردی، راسخ العقیدگی اور فوجی طالع آزماؤں کے ظلم وستم ضرور درپیش ہیں مگر جمہوری عمل کا تسلسل رہے تو یہ مسائل جلد ختم ہو جائیں گے۔

☆ کچھ تفصیل مستقبل کے حوالے سے ارادوں اور مرادوں کی بیان کیجیے؟

☆☆ ان دنوں اردو غزلوں کا مجموعہ ترتیب دیا ہے جو عنقریب شائع ہوگا۔ پنجابی ناول لکھ رہا ہوں جو اُمید ہے ستمبر تک چھپ جائے گا۔ ایک ضخیم ناول انگریزی میں شروع کر رکھا ہے شاید اگلے سال کے آغاز میں مکمل کر سکوں۔ اب آئندہ لکھنے کا ارادہ نہیں (کم از کم ابھی تو یہی سوچ ہے)۔ فنکار کو اُس وقت لکھنا بند کر دینا چاہیے جب یہ احساس ہو کہ وہ اپنے آپ کو دہرا رہا ہے۔ جب Saturation آ جائے تو پھر رک جانا چاہیے۔ ساٹھ، ستر کتابیں لکھ کر کیا لینا۔ ایسے ادیب شاعر اکثر بھلا دیئے جاتے ہیں۔

''بے تاج بادشاہ''

(فخرزمان دے پنجابی کلام دی کھنڈ)

محمد انعام الحق (اسلام آباد)

ڈُلے بھٹی نوں اک سوال

توں ڈُلا بھٹی پتر فرید تے لدھی دا
توں لہور اندر نظام دین نوں بھاجڑ پاون والا
توں دلّی اندر مغل چغتے دی راجدھانی وچ
بھچال لیاون والا
توں ماڑیاں دا رکھوالا
توں سورما۔۔۔ انکھاں والا
ایہہ سب کُجھ منیا۔۔۔
پر اک گل دس دے
(ویکھ بُرا نہ منیں، میں ہیر داسطہ کڈھ کے اوہنوں پُوجناں)
تیری بہادری، جیداری، غیرت مندی
ماڑیاں، کمیاں، کامیاں دی لیڈری
کدھرے
ایس پاروں تے نہیں سی
پئی تیری ماں دا اکبر دے پُتر حیدری نے
دُدھ پیتا سی
تے اوہ شہزادہ۔۔۔ تخت دا وارث
تے توں اِک عام جیہا ہل واہن والا
(کتھے شہزادہ تے کتھے اک کسان)
کدھرے توں وی ایہناں غریباں دا
بے تاج بادشاہ بن کے
اپنی ماں دے دُدھ دی برو بر ونڈ
تے نہیں ساں چاہندا

○

چانن دی آس وچ

کہندے نیں ایتکی سیال بڑا سخت ہووے گا
بارشاں دی تھوڑ پاروں
گرڈ سسٹم تے پاور جنریشن ڈاہڈی گھٹ گئی اے
تے بجلی دا چنگا چوکھا صرفہ نہ ہویا تے
بجلی دا کال پے جاوے گا
دن رات لوکاں نوں اپیل کر رہے نیں
بجلی دا استعمال تھوڑا کر دیو
ہر گھر بلب اک گھٹ جے بلے
تے بجلی دا کافی بچاء ہو جائے گا
سانوں بجلی دے صرفے دی کیہ مت دیندے او
اساں تے ہنیریاں دے ورھیاں توں عادی ہاں
اساں تے بلب بجھا کے دیوے وی بالے
دیوے بجھا کے رت نوں جلایا
سٹریٹ لائٹ نہ ہون پاروں
ہنیرے وچ ڈُبیاں سڑکاں تے گلیاں وچ
اڈو کھوڑے کھاہدے
ایتکی سیال کوئی نواں تے نہیں ساڈے لئی
اسی ایہہ سیال کئی ورھیاں توں
ہنڈار ہے ہاں
ایس آس نال پئی کدے نہ کدے
گرڈ سٹیشناں دی جنریشن ودھے گی
تے ہر گھر چانن کھنڈ جائے گا

○

اتہاس دا ادھارا

کسے نہ کسے تے مرنا ہوندا اے
تاں جے دوجے زندہ رہ سکن
کسے نہ کسے دیاں سدھراں دے جنازے تے چُکے جانے ہوندے نے
تاں جے دوجے اپنے چاء ویاہ سکن
ایہہ مُڈھ قدیم توں ہوند آئی ہاے
تے اتہاس دا دھارا اپنی ٹورے ٹردا رہندا اے
جتھے جھوٹھ دا راج ہووے تے جہالتاں نال لوک آپھر گئے ہون
اوتھے عقلاں والیاں دا انجام ایہو ہوندا اے
کیوں جے دوجیاں نوں نجات دلان لئی
کسے نہ کسے تے سُولی چڑھنا ہوندا اے
تے اتہاس دا دھارا اپنی ٹورے ٹردا رہندا اے
تے کسے نہ کسے نے مرنا ہوندا اے تاں جے دوجے زندہ رہ سکن

عزم

آؤ ہُن عزتاں دا جھنڈا اچک لیویے
تے بے عزتیاں دیاں پاتالاں توں نکل آئیے
ایہہ ڈر ڈر کے رہنا
سسک سسک کے جینا
نہ لکھ سکنا، نہ پڑھ سکنا
ادرہنگے جذبیاں نال زندگی لنگھانا
پل پل چھن چھن جینا
نہ مرنا نہ جینا
ادھ واٹے دے مسافر بن کے
نہ ٹر سکنا نہ رُک سکنا

اخیرلی عید

دُنبیاں
بکریاں دیاں کھلاّں دی
کِیہ گل چھوہی جے
اسیں آپے وی بے زبان ھاں
اُسی جیبھاں لے کے جے
پر بے زباناں طراں عمراں کٹیاں
تُساں وڈی عیدا ڈیکن توں پہلاں
سال وچ ایک وار نہیں
سگوں ہر دیہاڑے
ساڈیاں گردناں تے چھریاں پھیریاں
چھریاں وی کھوہنڈیاں
تاں جے تُسی ساڈی شہ رگ نوں چسکے لے کے وڈھ سکو
تے ساڈیاں چھڑیاں چھنڈن دے منظر کولوں بھر سواد لے سکو
تساں جھاں مذھب دے ناں تے
سانوں گھڑی گھڑی ذبح کیتا
ساڈیاں کھلاں دے بیوپار کیتے
پر ہُن ۔۔۔
ہُن کندھ تے موٹیاں اکھراں وچ لکھیا پڑھ لو
ایہہ تہاڈی اخیرلی عید جے

○

امپائر

اُساں سِدھے پدھرے گول کیتے
تے امپائراں نیں ''آوٹ'' کہیا
تہاڈے گیند گولاں دے مُنیاں نوں لگ کے
پرار گئے
پر امپائراں دیاں سیٹیاں نیں
''گول'' وجائے
اُساں تہاڈیاں ڈیاں وچ ساری کھیڈ کھیڈی
پر گلّے گلّے ساڈے ''کیریڈاں'' دی
ساڈیاں ''سٹکاں'' دی
سیٹی وجی
پر جدوں گیند ساڈیاں ''ڈِیاں'' وچ اپڑیا
گلے کتھے تہانوں ''پلنٹی کارنر'' لبھے
اُسی جتدے رھے
پر امپائر ہمیش سانوں ھراندے رھے

○

ماواں جائے

اوہ بھجو بھج
خوشی نال ہفیا ہویا
سدھا پسار وچ بیٹھی اپنی بڈھی ماں کول آیا
تے اوہنوں چھا مار کے کہن لگا
''میں ریڈیو تے سنیا اوے ساڈے ہوائی جہازاں نے دشمن دے
شہر اُپر حملہ کر کے
ڈیڈھ سو ویری مار سُٹے نیں''
ماں نے اوہدے ول اک واری تکیا تے
اوہنوں پشاں ہٹا کے
کہن لگی
''بھیڑ ہویا پُترا اوہ بھی تے ماواں جائے سن''

○

ڈورے، انھّے تے گُنگے دی سانجھ

میں فلم ویکھ سکدا اھاں
میں ساؤنڈ ٹریک نہیں سُن سکدا
میں ساؤنڈ ٹریک سُن سکدا اھاں
میں فلم نہیں ویکھ سکدا
میں فلم ویکھ سکدا اھاں
میں ساؤنڈ ٹریک سُن سکدا اھاں
میں ساری کتھا داسِطہ کڈھ سکدا اھاں
پر میں بول نہیں سکدا

○

ڈرائینگ رُوم وچ چِڑی

سارے رستے بند کر دیوو
باریاں، بوھے، روشندان
ایہنوں پل لئی بہن نہ دیوو،
آپے ہف کے ڈگ پیوے گی

○

''چانن دی آس وچ''

شریف کنجاہی

(●)

فخر زمان دی پنجابی شاعری دے دوویں مجموعے میرے ساہمنے اک سوال بن کھلوتے نیں تے میں دو چار گلاں اوسے حوال نال کراں دا۔ ایہناں نظماں ول دھیان ماریاں اوہناں وچوں بوہتیاں دے انگریزی سرناویں سانوں اپنے ول متوجہ کردے نیں تے نال ای یونانی دیومالا تے مغربی رہتل دے حوالے نال کیتیاں ہوئیاں گلاں، ایہہ چیزاں مل ملا کے بھولے بھا اوس دے پڑھن والیاں دا گھیر موکلا کر جاندیاں نیں تے اوس دی شاعری نوں عام لوکاں دی بھیڑ وچوں کڈھ کے ''انٹلیکچو ال کلاس'' دے لان وچ لے آؤندیاں نیں۔ ایس لان وچ اوس دے آون تے اصولاً کوئی حق نہیں ہوسکدا اجے لان وچ بیٹھی ہوئی کلاس وی اوسے جغرافیائی خطے نال تعلق رکھدی اے۔ جس نے ایس لابی نوں جنم دتا سی تے شعر جے ساڈیاں بعض جانیاں انجانیاں وچلیاں لوڑاں پوریاں کردا اے تاں اوس کلاس کولوں وی اوس دی تریہہ بجھان دے، اوہدی اپنی مرضی دے حیلے وسیلے کھوہے نہیں جاسکدے تے ضروری نہیں جے اوہناں کول بلوری گلاس ہوندیاں مٹی دے پیالیاں وچ ای پین تے مجبور کریئے۔ جد پین والی شے نرا پانی ای نہ ہووے۔

میرے ساہمنے ایہناں گلاں دے سوال بن کے آکھلون دا کارن اک تاں میری عمر اے جس وچ آکے غیر مانوس توں الرجک ہونا ودھ جاندا اے تے اک میری سوچ دا اوہ ٹمرا اے جہڑا زبان تے ادب دے میرے مطالعہ نے مینوں دسیا اے جے زباناں جس ویلے سانجھی کُھل وچوں نکل کے ''لاناں'' وچ آجاندیاں نیں جھبدے ای ''سنسکرت'' بن کے اپنی ''آئی'' نوں اُڈیکن لگ پیندیاں نیں تے جے اوہ اردو وی بن جان تاں وی چار دہاڑے شاہ دا مصاحب بن کے پھرن دی ٹوہر دے باوجود جدوں ''شاہی لان وچوں نکل کے اوہ لکھنو وچ میر تقی بن کے اپنی غریب الدیاری دا اشتہار تے اعلان بن جاندیاں نیں''۔ اج پاکستان وچ اردو اوسے درباری مزاج پاروں سانجھی کُھل ول نہ آون دی سزا اپنی پناہ گزین کیفیت دی شکل وچ بھگت رہی اے تے سنسکرت وانگ راجکماری اکھوا کے اوس نوں وی ستی ہونا قبول اے پر کوئی ہور در قبول نہیں۔

ایسے کر کے فخر زمان دیاں نظماں وچ ورتیاں گیاں غیر ملکی اصطلاحواں دی کثرت توں میں تربھک گیاں جے کرے کل جویں غیر ملکی حکمراناں دی ریس کر دیاں اساں اوہناں دا لباس اپنا لیا جہدا ساڈی آب و ہوا دے نال کوئی میل نہیں سی اوسے طراں ای اوس غیر ملکی دیومالا دے تمدنی تے تہذیبی اصطلاحواں دی لٹک وچ اپنے جغرافیائی ماحول نوں اوسے طراں نہ بھُل جایئے جس طرح اردو نے شہری پنجابی شاعری نوں پنجابی سماج دے سُنیہا دین والے کاں نالوں تروڑ کے بُلبل دا عاشق بنا دِتا تے اج پنجابی شاعری اپنے دھریکاں تو تاں نوں چھڈ کے سرُو واں تے شمشاداں دی گل کرن لگ پئی۔

تے جس دی شاعری وچ بجلی بند ہو جان دے حوالے نال ایہو جئے سوال چھیڑے گئے ہون جے کدوں ہنیریاں کولوں ساڈی پُنڈ چھٹے گی تے ایہہ آس دلائی گئی ہووے جے:

اُچیاں بتیاں کھمبیاں نال
پوہڑیاں لاکے۔۔۔مُڑ ھکے چوندے جُثے
نویاں تاراں جوڑ کے چانن کر دیون گے۔

تے غزلاں وچ ایہو جہے شعر ملدے نیں

سارے لوکی مَل بیٹھے نیں رُکھاں دا پرچھاواں
بلدی دُھپ وچ بہہ کے سوچاں منجھی کتھے ڈاہواں
سانوں ڈاہڈا الوڑی دا اے اج اک دُلّا بھٹی ہور
بھنّے کنگرے دلّی دے تے بھا جڑ پاوے تخت لہور

پہلوں بعض گلاں فخر زمان دی پالی سماج نال نفرت بارے۔ اوس نوں ایس وِتھ پال سماج دا کوجھ باری وچوں وی دس رہیا اے جد اوس دے اپنے ساہمنے گھر وچ، سوئی گیس دے بھانبڑ اُپر رکھیا ککر شوں شوں کر رہیا ہوندا اے تے دوجے پاسے مٹی دی ہانڈی ہیٹھ گوہیاں دی اگ نوں بلدا رکھن والی پھوکاں مار مار کے اکھاں پانی پانی کر رہی ہوندی اے۔ پھوکاں مار مار کے اکھاں پانیو پانی کرن والے لوکاں دی تصویر ای سانوں اوس دی نظم ''نوزیادے لج پال'' وچ ملدی اے تے اک ہور بندی وان وی اوسے پونی دی تند اے۔ پر فخر زمان نوں دُکھ تے پیڑاں سہون لئی اوڑک مرن جان لئی اک ہور بندی وان دا آجانا وارا نہیں کھاندا تے ایس کر کے اوہ ایس رولے نوں بدلن دی سوچ دا ہویا نویں آئے بندی وان نوں ہلاشیری دیندا اے جے

کدتیک گوڈیاں بھار رِڑھ دا رہویں گا
اُٹھ ہُن ہُنبلی مار کے منجی دا پاوا پھڑ کے
اپنے پیراں اُپر کھلو جا

ایہہ ہُنبلی تے ایہہ اپنے پیراں اُپر کھلو جان دی گل وی فخر دی شاعری دی اسمانی پینگھ دا اک رنگ اے تے جتھے ایس دی جھلک سانوں ایس دی مشہور نظم چِر داسٹہ وچ ملدی اے اوتھے گیتو وچ وی اک لحاظ نال اوہو ڈلھک اے جے بھانویں اج ٹھنڈے سیت سیالے اندر ساڈے ڈنگ سُک سَڑ گئے نیں پر ایہہ سیال سَدا نہیں رہنا تے تُسی ''مڑ ھکے وگن دے دن تے پُرے دیاں

گھڑیاں آ جاون دیو مُڑ ساڈے کھکھر یں ہتھ پا کے دیکھنا‘‘۔

زندگی دے رولے اُنج نہ ہون تاں ای جویں ہونے چاہی دے نیں اوہ احساس وی پیدا ہو جاندا اے جس دیاں حداں کلاسیکی شاعری دی جبر دوستی نال جا ملدیاں نیں، فرق ایناں اے جے اج دا شاعر تے اوس دی شاعری جبر دوستی نہیں ہاں جبریت دا اظہار تے اعتراف کر دی نظر آ وندی اے تے فخر زمان دیاں بعض نظماں مثلاً ’’پھاٹک بندا ے، نوزیادے لج پال، زندگی دی ٹوٹل پرائس، چانن دی آس وچ تے لمبے ہوئے لوک‘‘ وچ وی ایہہ جھولا ملدا اے۔ جبریت ساڈے ساہمنے کجھ بُجھارتاں لے آ وندی اے جنہاں دا پکا پیڈھا جواب ساڈے کول نہیں ہوندا۔ کلاسیکی ادب وچ ایس نوں کدے رب دی بے نیازی تے کدے اسمان دی گردش تے متھے دے تارے دے حوالے نال ذاتی طور تے حل کرن دی کوشش کیتی جاندی سی۔

اج دے ادب وچ ایہناں ٹھاہراں توں کم نہیں لیا جاندا تے ہور کوئی ٹھاہر نہ ہون کر کے ای اسیں اج جبر دوستی دی تھاں محض جبریت دا اظہار کرنے آں تے ایہہ اظہار جویں میں دسیا اے فخر زمان دیاں نظماں دے ایہناں مصرعیاں راہیں ہوندا جاپدا اے۔

پھاٹک بندا ے۔
پھاٹک بند ہوون تے کُھلن دا حکم تے پچھوں آ وندا اے۔
(وڈے نیں دے اوپریشن روم وچوں)
ایہہ حکم کدوں آوے گا؟ ایہہ پھاٹک کدوں کھلے گا؟
خورے کون جِتے گا؟ خورے پھاٹک کدوں کھلے گا؟

....

نوزیادے لج پال
اساں لوکی
بند گلیاں دے اُلرے مکاناں دے ہنیر یاں کمریاں وچ
کئی سالاں توں بیٹھے ہاں......
تے ساہواں دے ہنگال تے گزارا کر دے ہاں
تے کئی سالاں توں اُباک رہے آں۔

....

چانن دی آس وچ
کہندے نیں ایتکی سیال بڑا سخت ہووے گا
بارشاں دی تھوڑ پاروں......
بجلی دا کال پے جاوے گا......
ایتکی سیال کوئی نواں تے نہیں ساڈے لئی
اسیں ایہہ سیال کئی ورہیاں توں
ہنڈا رہے آں

کلاسیکی دور دے لکھن والیاں نوں کدھروں ایہہ ہلا شیری کسے نہیں سی دِتی جے ڈولے بدلے جا سکدے نے ایس کر کے اوہ لوک جبر دوست ہون تے مجبور سن۔ اجوکے شاعر نوں ایہو جیہے تھاپڑے علم تے وقت نے دینے شروع کر دتے تے مارکسی نظریاں تے کامیاب عمل ہو جان پاروں تے کائنات نوں ہتھ وس کرن وچ کامیاب ہوندے جان پاروں اوہ جبر نوں مندا ہو یا وی اوس نوں اختیار دا ہتھاروکرن دی آس رکھدا اے تے جدید تے قدیم شاعراں دی سوچ وچ نکھیڑ واں فرق ایسے رویے دا اے تے ایہو وجہ اے جے جبریت بھریاں نظماں لکھن دے باوجود فخر زمان جبر دوست شاعر نہیں تے اوس دی شاعری پڑھن والیاں واسطے’’ چانن دا سجھا وی اپنی بکل وچ رکھدی اے تے حالات نال ٹکر لین دا اُدم وی، کھنباں دے تیر، میں مرزا ہاں ہور نہیں جرنا تے ہُن اسی جاگ پئے ہاں‘‘ جس دی گواہی دیندیاں نیں۔

فخر زمان دے دو آں شعری مجموعیاں وچ اطمینان والی گل ایہہ وے جے اوس نے غیر ملکی وَسکی دے نال نال ایتھے دی مٹی دے گھڑیاں دے ٹھنڈے پانی نال اپنی سانجھ نہیں تروڑی تے اوس دیاں نظماں وچ سانوں جتھے اینکل ایز۔ فینکس، ہرومیتھیس تے سی فس دا حوالا ملدا اے اوتھے شمس رانی تے ہیرا ہرن، دُلا بھٹی تے کھرل، شاہ حسین تے باہو وی اوس نوں وِسرے نہیں تے ایہناں ساریاں حوالیاں وچ اوہ سانوں پنجاب دوست، انسان دوست تے امن پسند دوست دے روپ وچ ملدا اے۔ اوہنے ایہہ بڑی وڈی حامی بھری اے تے میں دعا کرناں جے ویلا اوس نوں ایس آکھی دے پالن وچ کامیاب کرے۔

--- بکر انٹرنیشنل ---

۲۰۱۳ء کا بکر انٹرنیشنل ادبی ایوارڈ مختصر کہانیاں لکھنے والی امریکی مصنفہ لیڈیا دیوس نے جیت لیا ہے۔ لندن میں منعقد ایک باوقار تقریب میں انعام کے ساتھ ساٹھ ہزار پونڈ کی رقم بھی لیڈیا دیوس کی نذر کی گئی۔ ۲۰۱۳ء کے بکر ایوارڈ کی اہم بات پاکستان کے نامور اہل قلم جناب انتظار حسین اور بھارت کے اننتھ مورتی کی نامزدگی بھی ہے جو دنیا کے مختلف زبانوں کے ایک درجن کے قریب نامزد اہل قلم میں شامل تھے۔

جہنم کی آگ

امرتا پریتم (●)

ہنگری کا ادیب آرتھر کوئسلر یہودی تھا۔اس وقت کہ جب ۱۹۳۳ء میں ہٹلر کے دور میں جرمنی کے شہروں میں کئی لاکھ کتابیں جلائی گئیں اور پھر جب ۱۹۵۲ء میں سٹالن کے دور میں سوویت کے مقبوضہ جرمن شہروں میں نوے لاکھ کتابیں جلائیں گئیں تب بھی کوئسلر کی کتابیں اس آگ کے حوالے ہوئی تھیں اور اس دوسری آگ کی راکھ میں کوئسلر کو اپنی کتاب کا ایک ادھ جلا ورق ملا تھا جس پر اس کا نام پڑھا جا سکتا تھا۔اس آدھے جلے ورق کو کوئسلر نے فریم کروا کے اپنے کمرے کی دیوار پر آویزاں کر دیا تھا۔وہ کہتا تھا کہ زندگی میں دو دفعہ کسی کی کتابیں جلائے جانے کا شرف آخر کتنے ادیبوں کو حاصل ہے۔۔۔؟ دسمبر ۱۹۸۷ء میں جب اچانک دہلی سے پاکستانی ادیب فخر زمان کا فون آیا کہ برسوں کے انتظار کے بعد انہیں اب پہلی دفعہ ہندوستان آنے کا موقع ملا ہے اور وہ تین دن میرے گھر قیام کریں گے تو آرتھر کوئسلر کی زندگی کا وہ واقعہ میری نظروں کے سامنے آ گیا کہ جب فخر زمان کے دیس میں ان کی تصانیف ضبط قرار دی گئیں تھیں اور انہیں انڈیا کا ویزا ابھی نہیں دیا جا رہا تھا۔فخر زمان سے میری یہ پہلی ملاقات تھی وگرنہ ذہنی رفاقت تو برسوں پر محیط تھی۔ تین دن تک ہم نے ڈھیروں باتیں کیں۔ اس دوران انہوں نے بتایا کہ ان کی تمام کتابوں کا ایک مجموعہ چھپ رہا ہے۔ میں نے آرتھر کوئسلر والے واقعہ کی روشنی میں پوچھا کہ آپ کی تمام تصانیف ضبط قرار دے دی گئی ہیں۔ اگر ان سب کا ایک مجموعہ چھپ گیا تو کیا وہ ضبط نہیں ہو جائے گا؟ فخر نے کہا شاید ہو جائے گا۔ دوسری بار شاید نہ ہو کیونکہ سرکاری کاغذوں میں ان کتابوں کا جو نام درج ہے ان سے مختلف نام سے یہ کتابیں چھپیں گی۔ وہ ہنس دیئے، اندر تو وہی نام ہوں گے۔ قانون کے اس دلچسپ پہلو پر وہ ہنستے رہے پھر فخر نے کہا کہ میری کتاب ''بندی وان'' کی ڈرامائی تشکیل کی گئی ہے یہ کتاب ضبط شدہ ہے۔ ادھر چھپ نہیں سکتی لہٰذا اس کی ڈرامائی تشکیل پر اعتراض ہونا چاہیے یا نہیں۔۔۔ جب اوپر والے یہ فیصلہ نہ کر سکے تو اس پر پابندی لگا دی کہ یہ کھیل عوامی پلیٹ فارم پر نہیں دکھایا جا سکتا اسے اپنے گھر میں بیٹھ کے کھیل لو۔۔۔ سو ہم نے اس ڈرامے کو اپنے ایک دوست کی وسیع کشادہ کوٹھی میں تشکیل دیا جتنے لوگ اس جگہ سما سکتے تھے۔ بے نظیر بھٹو بھی آئی تھیں کوٹھی کے چاروں طرف سرکاری پہرا لگا ہوا تھا ادھر ایک دوست نے ڈرامے کی وڈیو ریکارڈنگ کر لی یہ ریکارڈنگ گھریلو کیمرے سے کی گئی تھی لہٰذا تکنیکی اعتبار سے اچھی نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی ایک دستاویز بن گئی ہے۔

فخر کا ناول ''بندی وان'' میں نے پڑھا ہے لہٰذا میں جان سکتی ہوں کہ اس ناول کی ڈرمائی تشکیل کتنے دل گردے والے شخص نے کی ہوگی۔ میری آنکھوں کے سامنے اس کا ایک ایک کردار آتا گیا اور درد کی چبھن بن کے آنکھوں سے بہتا گیا۔اس وقت فخر نے بتایا کہ میں وہ فلم تمہیں دکھانے کے لیے لایا ہوں۔ میری پہلی حیرانی ایک سوال تھا کہ انہوں نے لانے کی اجازت کیسے دی؟ پھر یہی یاد آیا کہ فخر سیدھا اپنے ملک سے نہیں آیا۔ پیرس سے ہوتا ہوا آیا ہے۔وہ فلم دیکھتے ہوئے مجھے آرتھر کوئسلر کی دیوار پر لگا ہوا اس کا ادھ جلا ورق یاد آتا رہا۔ میں نے دیکھا فخر مسکرا رہے ہیں جیسے کوئسلر کی طرح کہہ رہے ہیں دیکھو یہ ہے لوگوں کا وہ دکھ جو ضبط شدہ قرار دیا گیا ہے مگر وقت کے درد کو کاغذ پر اتارنے کا شرف آخر کتنے ادیبوں کو حاصل ہوتا ہے نہ کہ اسے ضبط شدہ قرار دینے کا فخر۔۔۔؟

اگلے دن ۲۶ر دسمبر کی شام کو دلی کی ''قلم زاد'' تنظیم کی طرف سے فخر زمان کو استقبالیہ دیا گیا۔اردو کے ادیب قمر رئیس نے صدارت کی۔ میں اس دعوت کی مہمان خصوصی تھی۔ میری آنکھوں کے آگے فخر کے کردار گھوم رہے تھے۔اس لئے جب بطور مہمان خصوصی مجھے چند حرف کہنے کے لیے بلایا گیا تو میں نے کہا کہ فخر زمان اپنے ناول ''بندی وان'' میں زیڈ کا کردار پیش کرتے ہیں تو زیڈ کہتا ہے ''کل جو انسان قتل ہوا تھا وہ بھی میں تھا آج جو قتل ہو رہا ہے وہ بھی میں ہوں۔ آنے والے کل میں جو قتل ہوگا وہ بھی میں ہونگا'' یہ کہتے ہوئے میرے دل کا یہ عالم ہے کہ وہ ''زیڈ'' فخر زمان بھی ہے اور میں بھی۔ یہ بات کرتے ہوئے مجھے فراق گھپوری بہت یاد آئے جو اکثر ایک بات سنایا کرتے تھے۔ میں نے ان کے حوالے سے دہرایا کہ ''ادبی تاریخ میں جنت اور جہنم کا مسئلہ اس وقت شروع ہوا جب دنیا والوں نے دیکھا کہ شاعر ادیب ہیں یہ پتہ نہیں عوام کا دکھ ایسے دلوں میں کیوں بسا لیتے ہیں کہ پھر ساری زندگی تڑپتے رہتے ہیں۔ وہ لوگ جنہیں عوام کے دکھ سے کوئی سروکار نہیں ہوگا انہوں نے زندگی کو دو نام دیئے، ایک جنت جو ان کی اپنی زندگی کے لیے اور ایک دوزخ جو شاعروں اور ادیبوں کے لیے تھی۔ پھر ایک دفعہ جنت میں ایسی ٹھنڈی ہوا چلی کے لوگ سردی سے کانپنے لگے۔ انہوں نے سوچا کہ جہنم میں بہت آگ جلتی بجھتی ہے اس لیے تھوڑی آگ جہنم سے مانگ لی جائے لیکن جب انہوں نے اہل جہنم سے آگ کی فرمائش کی تو جہنم سے جواب آیا کہ ادھر فالتو آگ نہیں ہوتی ادھر جو لوگ آتے ہیں وہ اپنی آگ ساتھ لے کر آتے ہیں تو ایسی ہی آگ شاعروں اور ادیبوں کے سینوں میں جلتی ہے اور یہ آگ کوئی دوسرا نہیں لے سکتا اور اس آگ کو حاصل کرنے کے لیے شاعر یا ادیب ہونا ضروری ہے۔

اس حوالے سے بات بڑھاتے ہوئے میں نے کہا کہ یہ جو آج کی منفی قوتوں کے اندھیرے میں شعور کی آگ فخر زمان کی صورت میں جلتی ہے آج ہم سب بھی اپنے اپنے سینوں میں اس کا استقبال کرنے کے لیے آئے ہیں۔ وہ تین دن فخر زمان سے میری طویل ملاقات کے دن تھے۔ جس سے نکلنے والی چنگاریاں منفی قوتوں کی اندھیری دنیا کو چیرتی چلی گئیں۔

ایک عہد کا استعارہ

پروفیسر ڈاکٹر محمد نظام الدین
(گجرات)

عہد حاضر کے ادب میں فخر زمان ایک ایسا خاص حوالہ اور منفرد شناخت کا حامل استعارہ بن چکا ہے جس سے ایک علمی و ادبی زاویۂ فکر کی وضاحت ہوتی ہے۔ ہر زندہ عہد میں کوئی تفہیم اور وضاحت بہت حد تک اختلافی ہوتی ہے اور جو شخصیات اس اختلاف کی ترجمان بنتی ہیں وہ مزاحمت کی علمبردار ہونے کی بناء پر اپنے زمانے کے جبر کا شکار بھی ہوتی ہیں۔ ''چیلنج اور ریسپانس'' کا یہی عمل انہیں منفرد اور سچا انسان بناتا ہے۔ ہمارا عہد پیغمبروں کا عہد نہیں ہے اس لیے آج ہر سوچنے، سمجھنے والے کو اپنی سچائیاں خود تلاش کرنا پڑتی ہیں۔ یہ سچائیاں اس واردات کی کوکھ سے جنم لیتی ہیں جو کسی کھرے شخص کو راہ حق میں درپیش آئیں اور وہ ان سے نبرد آزما ہو۔

فخر زمان ہمارے عہد کا ایک ایسا ہی سچا دانشور قلمکار ہے جس نے شعور کی آنکھ کھولتے ہی خود کو اس ملک کے سیاسی عمل میں گرفتار پایا۔ یہ سیاست کوئی نفیس کتابی سیاست نہ تھی اور نہ ہی یہاں کا سیاسی عمل، سماجی سرگرمیوں اور معاشرتی فعالیت سے برآمد ہوا تھا چنانچہ یہاں کے سیاسی منظر نامے پر ایسے دھارے معرض وجود میں آئے جو بظاہر نہ تو صداقت و دیانت پر مبنی تھے اور نہ ہی اپنی موضوعیت میں بہت انقلابی۔ تاریخی وجدان کے مطابق یہ سیاسی دھارے بہت پراگندہ، دھندلے، الجھے ہوئے اور بے سمت و بے مراد ہیں۔ ایسے انتشار انگیز دور میں ایک حساس اور صاحب فکر کی اٹھان میں انقلابی رویے ضرور جنم لیتے ہیں مگر ان پر مدبرانہ تفکر کی بجائے خیالاتِ محض کا غلبہ رہتا ہے۔ یہ متخیلہ یا خیال پسندی ہمارے عہد کے انقلابیوں کو قتل گاہوں تک لے گئی اور انقلاب کہیں پیچھے ہی کھو گیا، فیض احمد فیض نے کہا تھا کہ:

ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

تاریک راہوں کے یہ مقتول اپنی دانست میں راہِ وفا کے شہید تھے، بلاشبہ ماضی قریب میں سچائی کے مسافروں کی ہماری پوری نسل لہولہان ہوئی ہے۔ اس خون کے چھینٹے فخر زمان کے لباس پر بھی پڑے دکھائی دیتے ہیں مگر یہ کون گواہی دے کہ یہ وہی لہو ہے جس کے لیے فیض نے کہا تھا:

جو تیری یادوں سے مُشک بُو ہیں
جو تیرے عشاق کا لہو ہیں

یہ گواہی یقیناً فخر زمان کے جہدِ مسلسل سے ملے گی۔ حیات و قرطاس کے اوراق پر بکھرے الفاظ سے ملے گی جن میں ان کا خون جگر جلتا دکھائی دیتا ہے۔ ایک ایسا سیاسی و نظریاتی کارکن جو اپنی پارٹی کے کارکنوں کے کوڑے کھانے کا عینی شاہد ہو، جس نے اپنی محبوب قیادت کا خون ہوتے ہوئے دیکھا ہو، جس کے سامنے اس کی اُمیدوں، آرزوئں، امنگوں اور آسوں کو برباد کر کے اس کے خوابوں کو چکنا چور کر دیا گیا ہو۔ وہ عمل اور ردعمل کی اس دنیا میں اپنے لیے کون سا ضابطۂ حیات چنتا ہے یہی اس کے کھرے اور کھوٹے ہونے کی کسوٹی ہوتی ہے۔ فخر زمان ایک جماعت، ایک نظریے، اس کے کارکنوں اور قیادت کی قربانیوں کا گواہ ہے اس لیے یہ سوال کہ میدان فکر و عمل میں فخر زمان صرف مزارِ شہادت کا مجاور بنے رہنے پر اکتفا کرے گا یہ قتل گاہوں سے علم چُن کر داعی انقلاب ہوگا؟ اس سوال کا جواب بھی خود فخر زمان کے ذمے ہے حالانکہ یہ پتھر بہت بھاری ہے۔۔۔ کیونکہ ایک طرف حکومتی ایوانوں کی گلریز راہداریاں ہیں تو دوسری طرف بے آب راہ گزاریاں کہ جن پر کہیں بلوچوں کی لاشیں بکھری ہیں، کہیں پٹھان تڑپ رہے ہیں کہیں سندھی نامراد بیٹھے ہیں اور کہیں سچے پنجابیوں کو چپ لگی ہوئی ہے۔ فکر و آگہی کے اس دھول دھول سفر میں کتاب اور کہانی کے انقلابی سُر کہیں گم ہو گئے ہیں۔ اب تو یہاں آمروں اور ڈکٹیٹروں کی پروردہ سیاسی پنیری ہے یا خال خال وہ انقلابی رہ گئے ہیں جو اس گلے سڑے بکھرتے نظام کے اندر سے خزانے ڈھونڈ لانا چاہتے ہیں۔ کیا خبر سرکاری ایوانوں اور سیاسی ایوانوں کے آرام دہ ماحول میں بیٹھے فخر زمانے کی قبیل کے انقلابیوں کے ہاتھ بھی دو چار موتی آ جائیں۔ یہ موتی مل بھی گئے تو کون جانے کہ وہ لیلائے وطن کے ہاتھ میں سجیں گے یا زرداروں کی تجوری میں چلے جائیں گے۔

میدان ادب میں فخر زمان کی کلیدی شناخت ناول نگار کی ہے اور ناول نگار کسی نہ کسی شکل میں قصہ گو بھی ہوتا ہے۔ فخر نے ناولوں میں جو کہانی رقم کی ہے اس میں ایک بے تاج بادشاہ ہے۔ ایک شہزادی ہے۔ سارا راج سنگھاسن جنوں اور بھوتوں کے تسلط میں ہے۔ اس آسیب زدہ منظر میں شہزادہ کہیں دور دور تک دکھائی نہیں دیتا اور جب یہ کہانی کار پلٹ کر دیکھے گا تو شہزادی بھی غائب ہوگی۔ بدروحیں بادشاہ کا جسم نوچ نوچ کر کھا رہی ہوں گی۔ معلوم نہیں یہ کہانی کار ان پر ٹوٹ پڑے گا یا دور بیٹھ کر ماتم کرتا رہے گا۔

اپنی تاریخ کے پس منظر میں دیکھوں تو مجھے لگتا ہے کہ فخر زمان سمیت ہم سب لوگ سبیلیں لگائے جامِ آب ہاتھ میں لئے خلاء میں گھور رہے ہیں کہ کہیں سے امام حسینؑ آ نکلیں اور ہم انہیں پانی پیش کریں۔ اس بھولپن میں ہم یہ فراموش کر بیٹھے ہیں کہ امام حسینؑ تو یزیدیت کے ساتھ اپنے یُدھ کے اس مرحلے پر ہیں جہاں پانی کا پورا دریائے فرات کسی کام کا نہیں رہا۔ آج حق اور استحصال کی جنگ میں سماج اپنی تشنگی سے بہت آگے نکل گیا ہے۔ اب تو لاشیں کندھوں پر اٹھانے کا وقت ہے بصورت دیگر ہمیں چلّو بھر پانی بھی کافی ہے۔ ہمیں نہیں معلوم فخر زمان کے بندی وان کو پھانسی لگی ہے یا نہیں مگر آج انسان اور انسانیت گھُٹ گھُٹ کر مر

رہی ہے۔ یہ ایک مشکل مرحلہ ہے جہاں پر کہانی کار کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ وہ محض دم توڑتی انسانیت کا نوحہ لکھے گا یہ انسانوں کو اس طرز بغاوت سے آگاہ و آشنا بھی کرے گا جس میں فلاح انسانیت کا راز مضمر ہے۔فخر زمان کو خود ہی یہ فیصلہ کرنا ہے کہ وہ کہانی کار کی حیثیت سے پہلی منزل سے دوسری منزل کا سفر کیسے طے کرے۔ لیکن یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر گواہی، ہر فیصلہ فخر زمان ہی دے۔اس نے اپنے حصے کا کردار بخوبی نبھایا ہے۔سوال تو میرے اور آپ کے لیے ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے ۔مجھے اور آپ کو فخر زمان سے بہت کچھ کہنا ہے بلکہ اس کے ساتھ مل کر بہت کچھ کرنا ہے تاکہ فکر و قلم کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہو کر ہم بھی سماج کا فخر بن سکیں۔

فخر زمان سے میری شناسائی عشروں پر محیط ہے، ساٹھ کی دہائی کے وسط میں ہم ایک دوسرے سے ملے۔ میں تب سے جانتا ہوں کہ فخر زمان ایک ایسا اگوا کار ہے جو ہمیشہ سماج اور سماجی فکر کے اغوا کاروں سے نبرد آزما اور پائیدار ترقی کے لیے کوشاں رہا۔ بنیادی انسانی حقوق ہوں یا حقوقِ نسواں، اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ ہو یا پڑوسی ممالک سے دوستی کا سفر، دانشوروں کا احترام و شناخت ہو یا قومی یکجہتی کے مسائل، پنجابی زبان و ثقافت کی ترقی ہو یا سرحد پار پنجاب سے تعلقات، ورلڈ پنجابی کانگریس کا پلیٹ فارم ہو یا درسگاہوں میں فکر و آگہی کی واردات فخر زمان ہر محاذ پر پیش پیش رہا۔ آج کے نازک دور میں بھی وہ نفرت اور دشمنیوں کی سرحد پر امن اور دوستی کا جھنڈا لہرائے کھڑا ہے۔

اپنے احوال و کردار کے حوالے سے فخر زمان عہد جدید کا ایک کامگار صوفی ہے جو کسی درگاہ پر بیٹھنے کی بجائے حکومت کے ایوانوں میں نظر آتا ہے۔ ذرا سوچیئے مراعات یافتہ طبقوں کی حکومتوں کے پر شکوہ ایوانوں میں بیٹھ کر فقیری کتنا مشکل کام ہے۔ ہم میں سے بہت سارے اس کا تصور بھی نہیں کر پاتے۔

فخر زمان کی ادبی واردات کے حوالے سے نظر ڈالیں تو سیاسی ادب اس کا مضبوط ترین حوالہ ہے۔ سیاسی ادب کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ قاری کو پیچھے پیچھے آنے پر مائل کرتا ہے۔ اس سفر میں منزل کا تعین بھی پہلے ہی کرنا پڑتا ہے۔ یہ ادب شب و روزِ حیات کی سیاسی کرداریت کو رقم کرتا ہے، اس سے فرار ممکن نہیں۔ کوئی اس کا انکار کرے یا اقرار اس کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں۔

ہمارے عہد کی ایک مشکل یہ ہے کہ آج کا ادب جن لوگوں کی راہ عمل کا تعین کرتا ہے وہ اس تک رسائی اور پڑھنے کی استطاعت نہیں رکھتے اور ہم جیسے لوگ جنہیں پڑھنے پڑھانے کا شوق بھی ہے اور دعویٰ بھی، جنہوں نے فخر زمان کی تخلیقات کا مطالعہ کیا ہے اس کی نثر و نظم کو اس کے عہد کی روشنی میں دیکھا ہے، اس کے ناولوں، ڈراموں، شاعری، سیاست، عہدوں، مراتب اور اطوار حیات کو بغور دیکھا ہے، ہمارا خیال ہے کہ فخر زمان اپنے لفظوں اور جذبوں کو اس ان پڑھ لوکائی تک لے جانے کا حوصلہ بھی رکھتا ہے، اس کے لیے جتن بھی کرتا ہے اور اس کی سرحدیں بھی پھلانگتا ہے۔ وہ ایسا سرگرم پنجابی ہے جو دوسرے صوبوں کے حقوق، ان کی زبانوں اور ثقافتوں کے تحفظ کی بات کرتا ہے۔

فخر زمان کے ناول پڑھ کر واضح ہو جاتا ہے کہ اس نے اپنی تخلیقات کے کرداروں کا چناؤ عام طبقوں سے کیا۔ اس کے ناولوں کے کردار زندگی کے مارے ہوئے مفلوک الحال لوگ ہیں جو ہمارے ارد گرد گھومتے ہیں اس کی باتوں اور تحریروں میں سچ چیخیں مارتا ہوا نظر آتا ہے۔

فخر زمان کی ذات کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہ ساری زندگی دھڑے بندی کے دائرے سے باہر نہیں نکلا۔ آخر ''جٹ'' کی بھی اپنی ایک نفسیات ہے وہ ہر عہد، ہر دور میں اپنی شناخت کے دائروں میں قید رہا۔ درحقیقت ہمارا پورا عہد اور سارا سماج ہی اپنی حدود سے نہیں نکل پایا انہیں خود اس کا ادراک ہے فخر زمان کا ایک شعر دیکھئے:

کہنے کو تو ہر ملک میں گھوما ہوں پھرا ہوں
سوچوں تو جہاں تھا وہیں چپ چاپ کھڑا ہوں

کہا جاتا ہے کہ اس دھرتی پر زندگی بہت سُست رو ہے اتنی کہ اس پر جمود کا گمان ہوتا ہے۔ یہاں کے لوگ آج موہنجوداڑو کی تہذیب کی طرز کے برتن استعمال کرتے ہیں، صدیوں پرانی طرز کا لباس پہننا پسند کرتے ہیں، عظمت رفتہ کے گیت گاگا کر تاریخی نرگسیت کے اسیر ہو کر رہ گئے ہیں، یہاں کی سوچ اور فکر کا دھارا آگے کی بجائے پیچھے کی طرف بہتا ہے۔ ذرا سوچیئے تو سہی یہاں کے ادب میں ڈیڑھ سو سال پرانا شاعر غالب آج بھی انقلابی نظر آتا ہے، جوش اور جالب کی ولولہ انگیزی سے جنم لینے والی تڑپ اور بلھے شاہ اور سلطان باہو کی دھمال سب کچھ مل کر بھی ہمیں دروں بینی یا درکشی کے خول سے باہر نہیں نکال سکی۔ جہاں کا انسان بے عملی کا قیدی ہو وہاں کے ادیب و دانشور کی پُر سکون اور پُر مسرت تحریریں بے ثمر ادب بن کر رہ جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے اس سامراجی عہد میں مزاحمتی ادب ہی ادبِ عظیم کے درجے پر فائز ہے اور انقلاب آفریں حرف و لفظ کو ہی اس عہد کے ماتھے کا جھومر کہا جا سکتا ہے۔ بیداری فکر و عمل کا موجب بننے والے مزاحمتی ادب کی کرنوں سے تبدیلی اور ترقی کی لو پھوٹے گی، عشاق کے نئے کارواں نکلیں گے جب بھی ایسا ہو گا تو اس سفر کے مسافروں کے ذہنوں میں فخر زمان کی تخلیقات اور مزاحمتی مزاج کا ہیولہ بھی ہو گا۔

۔۔۔ کورے کاغذ ۔۔۔

کتاب سے بہتر دوست اور ساتھی انسان کو آج تک میسر نہیں آیا۔ ارجنٹائن میں البتہ اب ایسی کتاب شائع ہوئی ہے جو فقط ایک ماہ آپ کا ساتھ دے سکتی ہے۔ کتاب مذکور کی چھپائی میں کچھ اس قسم کی روشنائی استعمال کی گئی ہے جو ہوا اور روشنی کے باعث بخارات بن کر اُڑ جاتی ہے۔ آپ کے ہاتھوں میں کتاب کی شکل میں کورے کاغذ رہ جاتے ہیں۔

یک نفری فوج کا سپہ سالار

شاہ محمد مری

(کوئٹہ)

ہماری کوئی ملاقات نہ تھی، میں نے فقط ان کا نام سن رکھا تھا مگر وہ مجھے نام سے بھی نہیں جانتے تھے۔ان کی اہلیہ کا انتقال ہوا تو فخر زمان اس شاعر کا کلام میرے رسالے میں چھپوانے کے لیے بھیجتے رہے اور فون پر بہت ہی محبت اور عزت سے ان کا تذکرہ کر کے ان کی شاعری شائع کرنے کی درخواست رتاکید کرتے رہے۔ مجھے یہ شخص اچھا لگا۔اپنی اہلیہ کی عزت کرنا بہت ہی اشرف انسانی عمل ہے۔ بالخصوص ان کا تعلق تو فیوڈل طبقے سے تھا، زمین کی ملکیت بیوی کی عزت کرنے نہیں دیتی۔

اس سے قبل ڈاکٹر خدائیداد اور ماما عبداللہ جمالدینی سے فخر زمان کے تذکرے سنتا رہتا تھا۔ ماما اپنے نفیس وشیریں انداز میں ان کی تعریف کرتے تھے جبکہ ڈاکٹر خدائیداد اپنی روایتی ڈنڈے مارانہ اصطلاحات ایجاد کرتے ہوئے فخر زمان کو اچھا کہتے تھے۔ یہ دونوں اصحاب فخر زمان کی توصیف، ان کی جمہوریت نوازی اور ترقی پسندے کے حوالے سے کیا کرتے تھے۔

میں تعلیم کے سلسلے میں لاہور میں چار سال رہا اور وہاں بھی فخر زمان کا نام سنتا تھا، ملاقات وہاں بھی نہ ہوسکی۔وہاں ''پنجابی زبان وادب'' ان کا تعارف اور حوالہ رہا ''پنجابی بولو، پنجابی لکھو اور پڑھو'' انہوں نے عالمی پنجابی کانفرنس نامی Mass آرگنائزیشن بنائی اور ریوڑوں کے حساب سے اس پنجاب، اُس پنجاب او ریورپ میں آباد پنجاب کے دانشوروں کو ادھر جمع کرنا، اُدھر اکٹھ منانا ان کا معمول ٹھہرا۔خبر آتی رہی ان کی فلاں پنجابی کتاب پر پابندی لگ گئی۔فلاں ناول ضبط ہوگیا۔ان کی یہ ساری کتابیں، سارے ناول پنجابی میں تھے۔ پاکستان میں رجعت اور رجعتی حکومتیں قومی زبانوں کو اپنے باپ دادا کا دشمن سمجھتی ہیں، اس لئے نوائے وقت سے لے کر منصورہ تک، مال روڈ کے گورنر ہاؤس سے لے کر رائے ونڈ تک، مرید کے سے لے کر جاتی امرا تک، اور پنجاب یونیورسٹی سے لے کر ربوہ تک ہر طرح کا کفر والحاد فخر زمان سے منتھی کیا گیا اور کے جی بی سے لے کر را تک کی ایجنسی فخر زمان کے گلے میں لٹکائی گئی۔لیاقت علی والوں کے گھڑے ہوئے نظریہ پاکستان والے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے ٹھیکیدار صوبے میں رہ کر صوبائیت کی بات کرتے ہو؟ کعبہ میں رہ کر کفر ابھارتے ہو؟ ویسے بھی اگر وہاں کے عوام الناس دیکھیں تو من حیث القوم پنجابیوں کو پنجابی زبان سے کوئی خاص رغبت والفت نہیں۔اس لیے فخر زمان کی کوئی خاص تعریف نہ ہوتی تھی اور طعن وتنقید وناپسندیدگی ان کی شخصیت کی چادر رہی۔فخر زمان نے درست طور پر پنجاب کے عوام کی نجات کا راستہ پنجاب کے روایتی صوفی ازم میں تلاش کیا۔ میں ان کے تجزیے سے جزوی طور پر متفق ہوں۔ جہاں کوئی عوامی تحریک نہ چل رہی ہو، جہاں عوام کو راستہ اور مستقبل دکھانے والی جینوئن ومنظّم سیاسی پارٹی نہ ہو تو بابا فرید، گرونانک، بلھے شاہ، وارث شاہ، سلطان باہو، شاہ حسین اور میاں محمد بخش ہی جائے پناہ ہیں۔کم ازکم مُلایت کو دھتکارنے، فیوڈلزم کو مسترد کرنے اور مادری قومی زبان میسر آنے کی بہت بڑی باتوں کا سرچشمہ تو میسر ہوگا۔لیکن مسئلہ پھر ان آفاقی سچائیوں کو چن کر، دامن بھر بھر کر عوام الناس میں لے جانے اور انھی سچائیوں پر انہیں منظّم کرنے والی سیاسی پارٹی کے مفقود ہونے کا ہے۔عوامی پارٹی کی عدم موجودگی میں حاکموں نے عوام الناس کے اندر ہر مقبول ومحترم شخصیت کا جھنڈا خود اٹھا کر اسے عوام کے خلاف استعمال کیا۔اسلام کا معتبر نام استعمال کر کے ضیاء الحق جیسا بانجھ ہم پر بادشاہی کرتا رہا تو کل کیا ضمانت ہوگی کہ انھی صوفیا کو ان کی تعلیمات سے الگ کر کے عوام الناس کے خلاف استعمال نہیں کیا جائے گا۔ ان صوفیا کا عرس منانے، روضہ کو غسل دینے اور چادریں چڑھانے کی ٹھیکیداری پہلے ہی سے حاکم طبقات کے پاس ہے اور وہ تو عوام کے ساتھ وہی کچھ کریں گے جو وہ ابھی تک کرتے چلے آرہے ہیں۔ حاکم طبقات چاہتے ہیں کہ لوگ صرف صوفی کو جانیں، صوفی ازم کو نہیں۔ جبکہ فخر زمان کے قبیل کے لوگ صوفی کو اس کی تعلیمات کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ بھئی صوفی ازم کی خدمت کرنے والے فخر زمان کو کون جانتا ہے، بمقابلہ شاہ محمود قریشی اور یوسف رضا گیلانی کے کہ وہ اصل مجاور ہیں۔اس لئے خبردار ہو کر اس پاک مشن کو رواں دواں رکھنے کی ضرورت ہے۔دودھاری تلوار دشمن کے ہاتھ میں ہے سائیں!!

فخر زمان ناول، کہانی، شعر اور ڈرامہ کے لکھاری ہیں۔ پنجابی دان لوگوں کے بارہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ نچلے طبقات کا ترجمان ہے۔وہ مظلوموں محکوموں کی محنت لوٹے جانے کی شدید ترین مخالفت کرتے ہیں۔ وہ اس ظلم کو واضح کرتے ہیں، اس کی تشریح کرتے ہیں اور اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی تبلیغ کرتے ہیں۔فخر زمان اپنی دھرتی کے ان بہادروں کو ہمہ وقت توصیف وتکریم سے سامنے لاتے رہتے ہیں جنہوں نے بیرونی حملہ آوروں کی یلغار کے سامنے سجدہ ریز ہونے سے انکار کیا تھا۔ وہ خودرو کسان بغاوتوں کے راہنماؤں کو اپنی تحریروں کا موضوع بناتے ہیں۔فخر زمان اپنی دھرتی کی تاریخ کھنگالتے رہتے ہیں۔ وہ محبت کی وادی میں تباہ ہو کر امر ہونے والوں سے انسپریشن لیتے ہیں۔ وہ پنجاب کی عشقیہ داستانوں، ان میں موجود کرداروں، اور ان میں موجود فہم وعقل کے موتیوں سے خود کو مالا مال رکھتے ہیں۔فخر زمان ان موتیوں کو اپنے عوام میں اپنی تحریروں کے ذریعے بانٹتے رہتے ہیں۔ ان عظیم عاشقوں کی جائیداد وملکیت سے دشمنی کو اجاگر کرتے رہتے ہیں۔ المختصر وہ اشتراکیت کے مرکز کے آس پاس ہی اپنے قلم کا ٹھکانہ بنائے رکھتے ہیں۔

میں ملے بغیران سے اوران کی شخصیت سے ذرا ذرا آشنا ہوتا گیا۔ تب آگ وخون کے دریاؤں میں خود کو جھونک کر عوام ایک بار پھر کامیاب ہو گئے۔ ایک بار پھر آمریت کو شکست ہوگئی۔ ابلیس اعظم امریکہ البتہ اسی طرح سات پردوں کے پیچھے رہا اور اپنی کریہہ منصوبہ بندی جاری رکھی۔

آصف زرداری کی بے تاج وبے لذت بادشاہی قائم ہوئی اور فخر زمان ایک بار پھر اکیڈمی آف لیٹرز کے چیئرمین بنے اور تب ایک دن انہوں نے مجھے فون کیا اور ان کی سفارش پر وزیر اعظم نے مجھے اکیڈمی کے بورڈ آف گورنرز کا ممبر نامزد کیا ہے۔

اس طرح فخر زمان سے پہلی بار ۲۰۰۹ء میں ملا اور انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اسلام آباد میں دفاتر جاسوسی فلموں کے منظر نامے لگتے ہیں۔ ہر طرف کھسر پھسر، مونچھوں سے گفتگو، پچھلے زمانے کا کوئی گوشہ نشین اس دور میں وفاداری کے حصول میں لگا ہوتا ہے تو اس دور کا کوئی دھتکارا ہوا کسی احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان فتح کرنے پر اکساتا ہوا نظر آتا ہے۔ ترقی کی خواہش، تنزلی کا خوف، نظرِ کرم کی ہوس، احتساب کا ڈر۔۔۔اور پھر یہ ہیرو ''ٹن ٹن چھک چھک، ٹن ٹن چھک چھک'' کی بیک گراؤنڈ موسیقی میں داخل ہوجاتا ہے۔ چھوٹے قد کا بہت ہی فربہ شخص بہت نفیس لباس میں کلین شیو کیئے ہوئے مکمل رکھ رکھاؤ کے ساتھ داخل ہوتا ہے۔ غلام سازی کے دارالخلافہ میں ہر دفتر شہر کے عمومی ماحول کا عکس پیش کرتا ہے۔ ایک پر اسرار خاموشی، ہر کارے بلاوجہ پھرتی دکھاتے ہوئے، فائلوں کی بلاوجہ آمدورفت اور جی سر جی حضور کی تکرار۔۔۔اور فخر زمان بے نیاز۔ لگتا ہے سب کے کرتوت وکرامات سے آگاہی میں پی۔ایچ۔ڈی کیئے ہوئے ہوں (وہ اس سے پہلے بھی اکیڈمی کے چیئرمین رہ چکے تھے) میں بہت غور سے ان کی شخصیت کا مشاہدہ کرتا رہا ہوں۔ ایک بہت ہی مختصر عرصے میں، میں نے انہیں جس طرح کا پایا اس کا خلاصہ یوں ہے:

''فخر زمان فکری طور پر ایک سامراج دشمن ادیب ودانشور ہیں۔ ایمان کی حد تک طبقاتی جدوجہد پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ ایک برداشت والا، دلیل و استدلال والا اور ترقی پسند معاشرہ چاہتے ہیں۔ علوم وفنون کی ترقی کے آگے واحد رکاوٹ، فیوڈل ازم کو ختم کرنے کی آرزو میں لکھتے ہی چلے جاتے ہیں، یہاں وہاں دوڑے جاتے ہیں، ادیبوں دانشوروں کو جمع کرتے جاتے ہیں۔ وہ آفاقی انسانیت کا پرچم بہت اونچا لہرائے رکھنے کی تگ ودو میں خود کو وقف کیئے رہتے ہیں۔

انہیں پنجاب، پنجابی اور پنجابیت سے جنون کی حد تک پیار ہے۔ مگر وہ والی پنجابیت جس میں پنجابی کا ہاتھ اور بلوچ کی گردن والی موجودہ صورت نہ ہو۔ وہ پاکستان کی تمام زبانوں کو برابری کی حالت میں قومی زبانیں سمجھتے ہیں اور ہر زبان وثقافت کی ترقی وترویج کو اس قوم کا بنیادی اور انسانی حق سمجھتے ہیں۔ فخر زمان اس واضح اور مشرقی سوچ رکھنے والے شخص کا مجسم نمونہ ہیں جو اپنے ہم فکر لوگوں سے کٹا ہوا ایک بے سمت وبے منزل پیپلز پارٹی کے سہارے کھڑا ہوا اور اس سہارے کا مطلب ہے ''نہ سہارا''۔ فخر زمان کچھ بول رہا ہوتا ہے اور پیپلز پارٹی کچھ گا رہی ہوتی ہے۔ ''جن لوگوں کو فخر زمان کا سہارا بننا چاہیے وہ وہاں ہیں نہیں اور جن لوگوں میں فخر زمان کو ہونا چاہیے وہ ان میں موجود نہیں ہیں''۔

فخر زمان اس قابل ترس شریف ذہنوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے پیپلز پارٹی جیسے ایک بہت بڑے اور بے ترتیب جنرل سٹور میں انقلاب کی تلاش کا دھوکہ کھایا تھا۔ ایسی پارٹیوں میں انقلاب ڈھونڈنے کا نتیجہ ہم نے دنیا بھر کی ایسی پارٹیوں میں دیکھ رکھا ہے اور خود ان کے دوسرے ساتھی ''نکلے/نکالے گئے'' والے پراسیس کے نتیجے میں تاریک شاہراہ سے تاریک راہوں میں پٹخ دیئے گئے ہیں۔ مگر سخت جان فخر زمان ابھی تک سینے کے زور سے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔

فخر زمان A man in hurry کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ یہ شخص اسباب وعلل کی جمع تفریق سے بہت پہلے نتیجہ متعین کرنے اولے اُلٹے دماغ کے آدمی ہیں اور وہ نتیجہ بھی بہت بڑا مانگتے ہیں۔ عوامی فلاح سے انکار پہ مشتمل سرکاری قوانین کے ہر پیچ وخم کو ملیا میٹ کرتا ہوا فخر زمان بہر صورت اپنے مقرر کردہ ہدف تک پہنچنے کو روانہ ہوتا ہے۔ وہ کوئی ''اگر، مگر'' کی صدائیں نہیں سنتا اس لیے کہ دل ودماغ، کان، ناک، آنکھ، زبان سب کے سب ہدف تک رسائی کے لیے وقف ہو چکے ہوتے ہیں۔

ہمیں ان کا یہ قبائلی انداز پسند ہے۔ جب جدید سرمایہ داری طریقے رائج نہیں ہوتے تو کم از کم ہمارا اپنا دیہی طریقہ ہی چلایا جائے۔ جب کوئی منظم ساتھی ساتھ نہ ہو تو فخر زمان حق بجانب ہیں کہ وہ جلد از جلد وہ سب کچھ کر گزریں جو ایک بن سپاہ کا جرنیل کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

فخر زمان ایک رجعتی، فیوڈل اور غلامانہ ذہنیت والے سماج اور پارٹی کے اندر اپنی شناخت اور عوامی نظریات کی بقاء کی جو تگ ودو کر رہے ہیں وہ بے وقوفانہ طور پر غلط ہوتے ہوئے بھی ایماندارانہ ہے اور ہم اپنی شکستہ حال کشتی ترک نہ کرتے ہوئے اس دلچسپ اور باہمت شخص کی جو مدد کر سکتے ہیں، کر رہے ہیں۔

---پہلے کون ---

برطانیہ کی SHEFFIELD اور WARIWICK یونیورسٹیز کے سائنسدانوں نے طویل تحقیق کے بعد بالآخر یہ معمہ حل کر لیا ہے کہ روئے زمین پر انڈے سے پہلے مرغی کا وجود پایا جاتا تھا۔ سائنسدانوں کے مطابق انڈے کا چھلکا جس پروٹین سے تشکیل پاتا ہے وہ صرف مرغی کے اندر ہی موجود ہوتی ہے اور اس کی مدد سے انڈا وجود میں آیا ہے۔ لہٰذا آج کے بعد پہلے مرغی یا انڈا والی بحث ختم ہوجانی چاہیے۔

''جدآ پودھا پِ پے گئی''

ڈاکٹر امجد علی بھٹی

(لاہور)

گلوب لائزیشن کے دور میں عوام کے لیے خیر کا پیغام تو نہیں آیا البتہ مقامی زَر دوال اور سرمایہ کار، عالمی مالیاتی اداروں سے گٹھ جوڑ کر کے ان کے حصہ دار بن چکے ہیں۔ ایک جانب عوام استحصال اور استعماری لوٹ کھسوٹ کا شکار ہیں تو دوسری جانب سرمایہ دارانہ جبر کے پنجے ڈبلیوٹی او(WTO) کی شکل میں انہیں روز بروز اپنے شکنجے میں کستے جا رہے ہیں۔ بے روزگار، بیماری، افلاس، غربت، فرقہ واریت، عقیدوں کی جنگ اور نام نہاد روشن خیالی میں پھنسی عوام استحصالی طبقوں کا اپنے بڑے آقا (برطانیہ کے بعد موجودہ دور میں امریکہ سامراج کا نمائندہ ہے) کے سامنے پتلیوں کی مانند ناچنے کا صرف تماشا ہی دیکھ سکتے ہیں۔ دنیا عالمی گاؤں (Global village) تو بن گئی مگر استحصالی نظام ختم نہیں ہوا۔ شہروں میں بسنے والے نام نہاد شہری ''دنیا کو عالمی گاؤں'' کا نام دے کر دراصل یونی پولر نظام کی تائید کر رہے ہیں۔ استحصالی طاقتیں نئی نئی شکلوں میں سامنے آ رہی ہیں۔ حکمران طبقہ اپنے شراکت داروں (جن میں ادیب بھی شامل ہیں) کے ذریعے ایسے موضوعات اور نظریے فلسفیانہ سطح پر ابھارتے ہیں جن کا مقصد عوام میں جہالت، تعصب، تسلط اور تشدد کے اصولوں کو رائج کرنا رہ گیا ہے۔ رہی سہی کسر نام نہاد مذہبی ٹھیکیداروں نے پوری کر دی ہے۔ اُن کے دن رات کی تبلیغ انسان دشمنی کا کردار ادا کر رہی ہے یعنی عوام میں مایوسی اور بے مقصدیت کو جان بوجھ کے رواج دیا جا رہا ہے، ان کے ذہنوں میں ایسے نظریات راسخ کیے جا رہے ہیں جن کا ان کی حقیقی زندگی سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ''الف قاعدہ'' (القاعدہ) اور ''ب قاعدہ'' (بش قاعدہ) سے تنگ آئی عوام اب ''ز قاعدہ'' کی جمہوری بے قاعدگیوں کے باعث اپنے مسائل کو حل ہوتا نہ دیکھ کر راہِ فرار اختیار کر چکی ہے۔ عام آدمی اپنی حالت کو بدلنے کے احساس سے عاری ہو چکا ہے اور اپنی پسماندگی پر صابر شاکر بن کے قناعت جیسے بے مقصد اصولوں کے ساتھ چمٹ چکا ہے۔

پاکستان چونکہ ایک طویل عرصے سے نوآبادیاتی طاقتوں اور ان کے گماشتوں کے چنگل میں پھنسا ہوا ہے اس لیے یہاں سماجی وسیاسی تبدیلی اپنے اندر سامراجی خدوخال رکھتی ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد سے اب تک آزادی کے نام پر غلامی کا طوق ہی پہنایا گیا ہے۔ سامراجی غلبے کے دوران یہاں جو ادب تخلیق ہوا اس کا رجحان نوآبادیاتی جبر کے خاتمے کا مظہر رہا ہے۔ اس رجحان کے ساتھ ساتھ خودشناسی کا عمل بھی شعر و ادب میں نمایاں ہوتا رہا ہے لیکن چونکہ فوری ضرورت غلامی کی زنجیروں کا خاتمہ تھا اس لیے فخر زمان اور ان کی قبیل کے دوسرے دانشوروں نے ظالمانہ ہتھکنڈوں پر نہ صرف احتجاج کیا ہے بلکہ معاشرے کو چمٹے دیگر روگوں کا تذکرہ بھی ایک نظم ''ریسپوٹین'' میں وہ یوں کرتے ہیں:

ریسپوٹنا!\
لمی داڑھی تے موٹیاں اکھاں والیا\
نورانی چہرے والیا\
توں اپنے وِن سوّنے وسباں راہیں\
کیکن شاہوں دے محلاں اندر\
مُڈھ قدیم توں لے کے اج تیک\
داخل ہو کے حکومتاں کردا آیاں\
توں جہیڑا اپنے آپ نوں لہودے سکا ہرے وگن دے\
روگ دے علاج نوں\
اپنے سینے وچ لکائے پھرناں ایں\
توں جنھیں ہمیش شاہواں نال مل کے\
لوکائی اُپر دھرو کیتے، ظلم ڈھائے\
توں ہیموفیلیلا دے علاج دا جانو\
ہُن اساں تیری تے تیرے نویں شاہ دی\
رت وگاؤنی اے\
ایس طراں پئی اوہ ساری دنیا دے ریسپوٹیناں\
نوں وی سدا واہن گے\
پر اوہناں دا وگدا خون نہیں ڈَکیا جائے گا\
تے اوہ تے توں\
اُڈیاں رگڑ رگڑ کے مرجاؤ گے   (ریسپوٹین)

جدید پنجابی شاعری انسان دوستی کی شاعری ہے۔ اس میں جہاں ظلم اور جبر کی قوتوں کے مذمت کے حوالے پائے جاتے ہیں وہیں نسلی امتیاز، انسانی حقوق کی پامالی کی مذمت بھی ملتی ہے۔ پنجابی شاعری نے نہ صرف امن کی بات کی ہے بلکہ انہوں نے جنگ کی بھٹی کا ایندھن بننے والوں کو مختلف مثالوں کے ذریعے یہ سمجھانے کی کوشش بھی کی ہے کہ گولی کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ وہ آنکھوں سے اندھی ہوتی ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتی کہ اس کے سامنے ہندو کھڑا ہے یا مسلمان۔ لہٰذا جو لوگ عوام کو جنگی کاروبار کے لیے بطور ہتھیار استعمال کرنا چاہتے ہیں ایسے لوگوں کی پہچان کی جائے۔ اسلام شاہ اپنی ایک نظم ''پکے نشانچی'' کے ذریعے ماؤں کے لال اور بہنوں کے بھائیوں کو دہشت گردوں کی ہوس کا نشانہ بننے سے بچانا چاہتے ہیں اور خبردار کرتے ہیں کہ استحصالی حکمرانوں کی جلائی ہوئی

آ گ کا ایندھن نہ بنو:

کجھ گھبرو جوان
اِک باڈر تے خونی اکھاں دے وچ اکھاں پا کے
رائفلاں موڈیاں اتے سجا کے
اپنے بھانے اِک دوجے دے سینے اُتے
فائر پئے کردے سن
پر انہاں دے ایہہ فائر
اک دوجے دے سینیاں دی تھاں
اِک دوجے دیاں ماواں بھیناں دے
دلاں دے اُتے
وجدے سن

کچھ ایسے ہی جذبات اور احساسات فخر زمان کی نظم میں بھی پیش کیے گئے ہیں۔ ان کے نزدیک موجودہ دور میں جنگ، جیت یا ہار، کفر یا اسلام کا مسئلہ نہیں رہ گئی بلکہ انسان کو انسان نہ سمجھنے والا معاملہ ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انسان کو انسان تسلیم کر لیا جائے تو تمام مسائل مل بیٹھ کر حل کیے جا سکتے ہیں۔ ان کا جنگ سے نفرت کا ایک خوبصورت انداز دیکھیں:

اوہ بھجو بھجی
خوشی نال ہفیا ہویا
سدھا پسار وچ بیٹھی اپنی بڈھی ماں کول آیا
تے اوہنوں جپھا مار کے کہن لگا
''میں ریڈیو تے سُنیا وے ساڈے ہوائی جہازاں نیں دشمن دے
شہر اُپر حملہ کر کے
ڈیڑھ سو ویری مار سُٹے نیں''
ماں نیں اوہدے ول اِک واری تکیا تے
اوہنوں پشاں ہٹا کے
کہن لگی
''بھیڑ ہویا پُتر! او وی نے ماواں جائے سن''

فخر زمان کی شاعری ایک دلیرانہ تجربہ کی مثال ہی نہیں بلکہ یہ پنجابی ادبی تاریخ میں ایک شاہکار اضافہ ہے۔ وہ کمال فن کاری سے پنجاب کی لوک کہانیوں کی روایتی جزئیات، اس کی کلاسیکی شاعری اور مغربی فکر و ادب سے پیدا شعورِ جدید کی آمیزش سے نہایت خوبصورت فن پارے تخلیق کرتا ہے۔ وہ ارد گرد کی چیزوں کو حیران کن تازگی اور لطافت سے دیکھتا ہے۔ آلڈس ہکسلے کی زبان میں کہا جائے تو یوں اسے اُن کی اصل حقیقت جاننے میں مدد ملتی ہے۔

نظم ''حرامدے'' میں ایک امیر کبیر زمیندار اپنے مزارع کی غریب عورت کو اغوا کر لیتا ہے اور اسے اپنے ساتھیوں سمیت ہوس کا نشانہ بناتا ہے۔ یہ ایسا واقعہ ہے جو آئے روز اخبارات میں چھپتا رہتا ہے۔ جاگیرداری سماج میں بسنے اور تعلق رکھنے والا احساس طبیعت شاعر یہ منظر برداشت نہ کر سکا۔ اس کے نزدیک یہ عمل گویا پوری پنجابی قوم کی بے حرمتی کے مترادف ہے۔ اسی لیے تو وہ خود کو بھی اس واقعے کا ذمہ دار اور مجرم گردانتا ہے بلکہ مظلوموں کے جسم کا سودا کرنے والوں کے خلاف مظلوموں کے ساتھ کھڑا دکھائی دیتا ہے۔

اُسی اُدھالی ہوئی ماں دی
کوکھ توں جمن والے
حرامدے دھیاں پُتر
اوس ماں دے جنھوں
اِک وڈیرا اپنی ٹوہر ودھان لئی
تے اپنی انا نوں تسلا دین لئی
اُدھال لیایا
مُڑ اِک دن چُپ چپیتے
کئی کھسکا کے ہمیش لئی غائب ہو گیا
تے ساڈی ماں اجے تیک
اوہدے سنگیاں ساتھیاں دی ہوس دا
نشانہ بن رہی اے
تے حرامدے دھیاں پُتر جم رہی ہے
پر ساڈی ماں دا اصل خوند
ساڈا پیو (؟)
کد کوک روال سُنے گا
کد بوہڑے گا؟
کد بوہڑے گا؟

فخر زمان بنیادی طور پر مختصر نظم کے شاعر ہیں۔ اس کی بیشتر نظمیں کسی ایک واحد صورت حال کے گرد گھومتی ہیں اور یہ سیکنڈوں اور منٹوں پر محیط کم وقفہ کے ایک ہی تاثر کو بیان کرتی ہیں۔ ان کا ڈرامائی مگر جرأت مندانہ انداز انہیں ثابت قدمی کے ساتھ ساحل پر کھڑے سمندر کی بپھراں موجوں کا نظارہ کرتے ہوئے اس ٹوٹ پھوٹ کے شکار معاشرے کا مطالعہ کرنے کا حوصلہ دیتا ہے۔ نظم ''زندہ رہن دی ٹوٹ پرائس'' ملاحظہ کریں جس میں شاعر پریشان حال ہے۔ بلا شبہ اسے زندہ رہنے کی اجرت قبول نہیں۔ اسلوب بیان کے جدید تکنیکی تجربات میں اس نے حیاتی کی اجرت کو حساب کے فارمولے پر تولا ہے۔ پرچون قیمت، سرچارج، اضافی سرچارج اور سیلاب سے بچاؤ کے فنڈز کو درد و کرب، خواہشات آویزشیں، دیکھنے، سننے بولنے اور سوچنے پر مکمل پابندی کے برابر سمجھتا ہے۔

O ری ٹیل پرائس = پیڑاں، تھوڑاں، پواڑے
+ سرچارج = کتاں نوں چنگی طراں لوپٹ لو

\+ سُپر سر چارج= اکھاں تے گھٹ کے کالی پٹی بنھ لو

\+ فلڈ ریلیف فنڈ=سوچاں دے ڈیم دیاں ساریاں سُرنگاں
دے دروازے مضبوطی نال بند کرلو

\+ ٹوٹل پرائس= پیڑاں، تھوڑاں، پواڑے تے
سُننا، ویکھنا، بولنا، سوچنا
اُکّا بند

ایک اور نظم ’’لمبے ہوئے لوگ‘‘ میں وہ انسانوں کو مٹی کے بے ترتیب ٹکڑے سمجھتا ہے۔ بڑی موٹی موٹی تہوں والے جو بارش اور ہوا کے پرشور تھپیڑے سن تو سکتے ہیں لیکن انہیں دیکھنے بولنے اور اس سے بچ نکلنے کے لیے حرکت نہیں کر سکتے۔ ہم ایک عرصہ تنگ گلیوں کے تاریک مکانوں میں رہتے آئے ہیں جنہیں وقت کے بوجھ نے ایک طرف جھکا دیا ہے اور جہاں ہوا کے لیے دریچہ بندی کی کوئی گنجائش نہیں۔ اگر کبھی بھولے سے ہوا کا جھونکا کسی روزن سے در آئے تو آسودہ حال اسے بڑی تیزی سے اپنی سمت موڑ لیتے ہیں۔ ہر چند بعد ازاں کم آسودہ لوگ بھی اس سے فیض یاب ہو جاتے ہیں۔ تباہی کی طرف رواں دواں سماج کی اس سے بہتر تصویر کشی مشکل ہے۔ بجلی کے بہ کفایت استعمال کی نصیحت ایک ظالمانہ مذاق سے کم نہیں کیونکہ ہم نے تو بجلی کے بغیر ایک لمبا عرصہ گزر اوقات کی ہے۔ باوجود یہ کہ ہم اسی امید پر زندہ ہیں کہ ایک ایسا دن بھی آئے گا جب گرڈ سٹیشن سے بلا تخصیص سب کو بجلی مہیا کی جائے گی۔

فخر زمان کی شاعری معاشرے میں بدلنے اور تبدیل ہونے والے حالات و واقعات سے دل چسپی کی خاطر اس کے سفر اور سفری آرائشوں کے بھر پور اظہار و بیان سے مزین ہے۔ کسی ریلوے پھاٹک پر ٹرین گزرنے سے ذرا پہلے ’’ٹریفک جیم‘‘ میں وہ آگے آنے والی کسی بڑی سماجی تبدیلی کو رونما ہوتے دیکھ لیتا ہے جو عامتہ الناس کی پابند صلاحیتوں کی زنجیریں کھول دے گی اور ٹرکوں، کاروں، تانگوں، رکشاؤں اور ٹیکسیوں کا روکا ہوا سیل بے پناہ سماج کے بدبودار ٹھہرے ہوئے پانیوں کو اذنِ حرکت دے دے گا۔ دائیں ہاتھ اور بائیں ہاتھ چلو کے ٹریفک اشارات سیاسی مصلحتوں کے تابع ہوتے ہیں۔ ’’راستے کا حق‘‘ ٹریفک کی ایک خاص صورت و شکل میں بائیں ہاتھ سے آنے والے ٹرک کی بے وقت حرکت سے تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔ ’’بس سٹاپ‘‘ کوہستانی وادیوں میں سفر سے رغبت قلبی، بیمار تصور درد، تصوراتی خاکوں کے لیے خاص ہے کہ ایک وجودیت پرست اور درمیانے درجے کا جدید مضطرب ذہن فرد کی ذمہ داری اور تنہائی کے احساس کی شدت کرب سے بلبلا اٹھتا ہے۔ فخر زمان میں ایسے لمحات جذباتی عافیت کا موجب بھی ہیں جب وہ ایک لمبے عرصے پر پھیلی ہوئی زہرناک قطعی روایات کا سلسلہ روک دے گا۔ اسی پس منظر میں ایک نظم ملاحظہ کریں:

کیہ ساریاں چیزاں ضائع جان گئیاں   میرے بعد
دوجیاں شیواں دی گل چھڈو   لیکن میری لائبریری
میرے لیکھ تے میرے نوٹ اُن جمیاں لکھتاں دے
دوستاں، متراں، لکھاریاں، سوجھواناں، سیاسی کامیاں
تے لیڈر نال
بے انت تصویراں، انگوٹھا چوسن توں دھولیاں تیکر تصویراں
بیوی بچیاں، ماں باپ، بھین بھراواں تے رشتہ داراں نال
تصویراں
لیکن میری لائبریری   شیلفاں توں باہر ڈھلدیاں کتاباں
کجھ مٹی نال اَٹیاں ہوئیاں
کجھ بھُر دے ورقیاں والیاں
کجھ صاف ستھریاں   کتاباں
بڑے بڑے دانشوراں تے سکالراں دیاں لکھیاں ہوئیاں
اُچیرے خیالاں والیاں، اُگھے جذبیاں والیاں
کتاباں
اوہناں دیاں وی جہڑے لڑکپن جوانی وچ
بڑا متاثر کردے سن
پر ہُن پڑھیے تے اُکا نہیں بھوندے
(کیہ میریاں تحریراں دا وی ایہو مستقبل ہے)
کتاباں
جہڑیاں لکھاریاں نے اپنے آٹوگرافاں نال مینوں بھینٹ کیتیاں
تے میں ہس کے کہیا ایہناں اُپر کجھ ضرور لکھاں گا
پر کدے نہ لکھیا
کتاباں   جھاں سب کجھ سکھایا تے
سب کجھ کھویا
سُنج سکھن نوں بھرتا
تے بھرتن نوں خالی کیتا
پر اپنی ایس لائبریری نوں   جس وچ ہزاراں کتاباں نیں
میں ہُن کیہ کراں   ڈونیٹ کردیاں؟
یاں ساڑ دیواں؟   یا سیونگ لگن لئی یاں
ردّی وچ وِکن لئی رہن دیواں
اگلی پیڑھی تے فیر اگلی پیڑھی
کیہ ایہہ کتاباں پڑھے گی!
سائبر سپیس دے نویں کھلارو چ
کیہ ساڈیاں لکھتاں دا کوئی وکھر ویب سائٹ بنے گا
تاں جیے ساریاں کتاباں سنگو کے

کجھ ڈسکاں وچ قید ہو جاون
پر کیہ ایہہ اگلی نسل دی پرائی آ ریٹی ہووے گی؟
سوچ دیاں ایہناں گھمن گھیریاں وچ پھاتا
اکو گل سوچاں
یاں کتاباں ایس حالت وچ چھڈ کے بھل جاواں
یا فیر ایہناں دا اک وڈیان فائر کراں
تے راکھ بہاواں دریاواں وچ
یاں چھٹا ماراں اوہدا سار دیس دی بھوئیں اُپر
ہورے کدی نویں شکل وچ، نویں رنگ تے نویں واشنا نال
کتاباں
پُنگرن تے اوس ویلے دی پیڑھی
دے دل دی اواز بن سکن (کتاباں)

دراصل دنیا میں جتنے بھی جھگڑے جاری ہیں ان کا تعلق لوٹ کھسوٹ والے نظام سے ہے۔ عوام کو لوٹنے کے لیے ملٹی نیشنل کمپنیاں آپس میں اتحادی ہیں اور وہ انہیں لوٹنے کا کوئی بھی موقع ضائع نہیں کرتیں۔ پہلی اور دوسری عالمی جنگیں اس کا روشن ثبوت ہیں۔ موجودہ دور میں اقوام متحدہ کا کردار بڑا اہم بن چکا ہے کیونکہ یہ دنیا کا واحد ادارہ ہے جس کے پاس وسائل بھی ہیں اور عوام تک اپنی بات پہنچانے کا طریقہ کار بھی مگر بدقسمتی تو یہ ہے کہ اس پر چند وحشی اور ناعاقبت اندیش قوتوں کا قبضہ ہو چکا ہے۔ انسان دوست شاعر اس صورتحال کو ''زوال دی گھڑی'' گردانتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ خزاں بعد بہار ہمارا مقدر ضرور بنے گی۔

ایہہ گھڑی زوال دی ہے لوکو
ایہہ سمے چڑھتل دا ہر گز نہیں
ایہہ ویلا ٹٹ تے بھج دا ہے
ایہہ بنتر اُسرن دا لمحہ نہیں
ایہہ چھن ہے سائے دے ڈھلنے دا
ایہہ پل نہیں دھپ دے لشکن دا
ایہہ حشر دیہاڑ دی دستک ہے
ایہہ وقت جدائی تے برہا دا
ایہہ وصل ملاپ دا وقت نہیں (زوال دی گھڑی)

فخر زمان کی شاعری میں سماج کی بعض پابندیوں اور روایتوں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن زیادہ تر ان کی دنیا میں سماج احساس واضح شکل میں موجود ہے، وہ سماجی قیود جن سے محبت کی روح گھٹتی معلوم ہوتی ہے، ان کے غصے کا نشانہ بنتے ہیں، ورنہ ان کی کائناتِ عشق میں بالا دست طبقے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے، زیر دست پر زبردست کے مظالم کی مذمت، اقتصادی اور معاشی جھگڑے کی وجوہات، سماجی ناانصافیوں پر کڑھنا ان کا مقدر ہے۔ شاعر کے نزدیک طبقہ اشرافیہ کی دنیا ان کی گندگیوں، بے ایمانیوں، ریاکاریوں سے بھری ہوئی ہے، لیکن یہ کس قسم کی ناانصافیاں اور غلاظتیں ہیں کیا ان کا باعث کوئی سیاسی نظام ہوتا ہے یا یہ سب کچھ محض یونہی وقوع پذیر ہو جاتا ہے یقیناً اس کے پیچھے کوئی فلاسفی کام کرتی ہے، اس کا واضح شعور فخر زمان کے ہاں موجود ہے:

ایس گھر سمندر
اپنا اپنا جزیرہ بنائی بیٹھا ہے
ہر جزیرے دی اپنی آب ہوا
پھُلاں دی وکھری وکھری خشبو
تتلیاں دی اُڈان دے ڈھنگ ولیو ولی
پتھراں دی بُنتر ون سوّنی
مٹی دی واشنا وی نویکلی
ریت دے پیراں ہیٹھ کھسکس دا انداز نرالا
ریت دا بُکاں دیاں وِرلاں چوں رُلکن دا طریقہ اچرج
درختاں دے پنگران دا سمے وکھرا
درختاں توں پتے گرن دے موسم وکھرے
پتے زمین تے گرن دی رفتار وکھری
بندے ونڈے ہوئے، اَدھ ادھورے، ادر ہنگے
اجنبیاں وانگوں اک دوجے دی شناخت توں وانجے
اک دوجے نوں ہٹ ہٹ تکن
نہ بول سکن، نہ سُن سکن، نہ ویکھ سکن
نہ ہسّن، نہ رون، نہ سون، نہ جاگن
خشیاں، تانگھاں، آساں، اُمیداں توں کورے
پیڑاں، دُکھاں، غماں، تھوڑاں توں مُکت
پر ایس گھر سمندر دے ہر جزیرے دی
اِک گل سانجھی
ہر اک نوں، سمندر دی اُکھ دی تلاش
سمندر دی اُکھ
جزیریاں دی جُڑت
تے خیر دی علامت
کدوں ملے گی؟
کدوں ہٹے گی دکھانت دی تنی چادر
کدوں پھیلے گا ہر دِشا وچ
سکھ دا چانن
ہر اک لب تے ایہو سوال

فخر زمان دراصل انتہا پسند ہیں اور یہ انتہا پسندی تمام معاملات میں ان پر غالب رہتی ہے۔خواہ وہ حسن پرستی کا جذبہ ہو یا لذت کشی کا ،فرار کا جذبہ ہو یا گمشدگی کا، ہر جگہ ان کی انتہا پسندی غالب نظر آتی ہے۔اس کے سبب سے کہیں کہیں ان کی شاعری میں روانی روش اور مستی وادا کا حسن پیدا ہو گیا ہے تو کہیں کہیں لذت کشی آ گئی ہے۔ان کی شاعری کا رجائی اندازِ نظر ان کی شاعری کو ایک بے مثال نغمہ بنا دیتا ہے، کچھ کرنے اور کچھ کر گذرنے کا حوصلہ، زندگی اور زندہ دلی کا پیغام فخر زمان کی شاعری کے اہم پہلو ہیں، جو کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کیے جا سکتے:

دور پہاڑاں دے دامن تیک
پھیلیاں ہویا سمندر
جی کردا اے تیرا اکو ڈیک گھُٹ بھرلاں
پر مچھلیاں دے تڑفن دا منظر ویکھن دی ہمت نہیں مینوں
یاں مُڑ
کنڈھے تے پل پل بن دی ساری سفید چِکھ نوں ٹِک وچ بھر کے
چن وچ چرخہ کتدی بڈھی عورت وانگوں
سر دی کھاری وچ پُونیاں وانگ سجالاں
یاں ساری مچھلیاں دا پراگا سونی لئی کباب کراں
(پرتد تے سمندر سُک جاوے گا)
سمندر سُک جاوے گا تے چِکھاں دی برف یاں روں دے گولے
کویں سر دی چھچی اُپر سجاواں گا
شہر رہوڈز دے اکروپلس اُپر چڑھ کے
دور بیٹھاں سمندر، چِکھ، مچھلیاں نال گل کراں
تے اپالونوں پچھاں
توں پیوزیوس کولوں
اپنی مٹھی بھر زمین
کیویں خیرات لئی سی
ساری دھرتی کیوں نہ اپنے ناں کرائی
سارا کوجھ کیوں وکھرا چھڈیا آکٹوپس وانگ کلاوا مارے
بس اِک جزیرہ حسن دا اپنے ناں لوایا
اکروپلس نے سوہنیا سانجھا ہوندا اے
کیہ ہوندا جے ساری دنیا دا اکروپلس اِکو ہوندا
دور اُفق تیک کھنڈے سوہپن نوں ویکھن لئی

فخر زمان کی شاعری کسی مخصوص رد عمل کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ شاعر کے ذاتی تاثرات پر مبنی ہے۔ یہ خوابوں کا نہیں بلکہ خوابوں کی شکست کا زمانہ ہے۔ شاعروں نے خوابوں کی شکست کے المیے کو اپنی شاعری کا بنیادی موضوع قرار دیا ہے۔فخر زمان نے بھی خواب کی شکست کے المیے کو متعدد نظموں میں اپنے شعری تجربے کا موضوع بنایا ہے۔اس کی شعری فکر میں فن اور اس کی نزاکتوں کا شدید احساس پایا جاتا ہے۔اس کی شاعری میں وحدت تاثر پایا جاتا ہے اور وحدت تاثر پیدا کرنے کے لیے سادگی، تحریر میں بے ساختگی، روانی، عام فہم زبان، غیر ضروری آرائش سے اجتناب اور خیال کی صحت مندی ناگزیر ہیں۔ان کی بعض تخلیقات فن کی نزاکتوں ، لطافتوں ، خیال کی رعنائیوں، بیان کی رنگینیوں اور مناسب صنعتوں سے سجی ہوئی ہیں۔تخیل اور شعریت پر فکر و فلسفے کا غلبہ ہے۔اپنے خیالات کے اظہار کے لیے فخر زمان کو موزوں الفاظ اور موثر اندازِ بیان آسانی مل جاتا ہے۔ یہ اس کی زبان و بیان پر قدرت کی دلیل ہے جو قاری کے ذوق جمال کی تسکین کا باعث بنتی ہے اور خود فنکار کی تحریر میں تازگی، شگفتگی، رعنائی و دلکشی اور ندرت پیدا کرتی ہے۔فخر زمان کا اسلوب غنائی ہے۔اس کی تشبیہات و استعارات، اس کے اشارے و کنایوں مین خوبصورت الفاظ کا استعمال، ماحول اور موضوع کی مناسبت کے ساتھ جلال و جمال اور سبک روی اس کی شاعری کے اثر کو بڑھا دیتے ہیں۔ جنگ جنگ ظالم اور مظلوم استحصال کرنے والوں اور استحصال زدہ لوگوں کے درمیان ہو تو ایک سچے اور دیانتدار ادیب کو طرفداری کا اظہار کرنا ہی پڑتا ہے۔یہ ایک ایسا فیصلہ جس سے تیسری دنیا کے اہل قلم روگردانی نہیں کر سکتے۔فخر زمان بھی کسی سے پیچھے نہیں:

کنک دا جلوس
داتری دی اگوائی
کدے متھے لگے گی
سیساں دی کٹوائی
اکھوں انھے نظاریاں نال اشنائی
کنوں ڈورے سُراں دی نترائی
پھُل سوہنے نے باغ دے
خوشبو کھنڈی سارے اور
اتھرو گیس دا ذائقہ
بارود دا سنگھنا دھواں
ٹھنڈا فرش حوالات دا
زنگاری کڑی زنگاری بھیتروں دی
سڑکاں تے شور
دِلاں اُپر جندرے
پُلس مقابلے وچ ماریا گیا
ماں دا کلا پُتر
نہ اوہ چور نہ دہشت گرد
نہ قاتل نہ مفرور

''چہار سُو''

کملا جیہا سیاسی کاما
پھاوا ہو جائے لیڈر ویکھ کے
موڑا گئے ننگی پیریں بھجدا جاوے
کدی بونٹ نوں ہتھ لاوے
کدی شیشے تے انگلیاں پھیرے
''ہٹ اوئے پچھاں کم ذاتا''
ویرا کرم کر لیڈر ویکھن دے
''ہٹ اوئے پچھاں کم ذاتا''
ویرا مینوں صاحب ویکھن دے
موٹر دے ٹائراں دھوڑ اڈائی
''میری جندناں ایس دھوڑ دے''
ساڈا لیڈر آوے ای آوے
اوئے تیرے چم دیاں جُتیاں بناواں
تیرے والاں داوٹاں وان
بیٹھ جانٹھ کے زیویں اُپر
ایس دون دا پھایا بناواں
چڑھ جا بچہ سُولی رام بھلی کرے گا
گھر وچ دانے نہیں
بھکھ دی سیونک نے اُجاڑا کر چھڈیا اے
نعریاں نال تے ڈھڈ نہیں بھردا
کجھ تے بول تہہ خانے دا بوہا کھول
ساڈی واری آئی تے بتی لال ہوئی
میں جمیا اوس تریخ نوں
جدوں لگا چن گرہن سی
میرے جُسّے نیل نشان سی
میرے متھے چن محراب سی
میری بکّی اڑ گئی رستے وچ
میری نیلی راہ بھلا بیٹھی
میری ساوی نیں نونہہ لے لیا
میری ترکش چڑھ گئی جنڈ اُپر
میرے ٹٹ گئے تیر کمان اندر
مینوں گھریا میر شمیر نے
مینوں کیہڑا زہر پلا دِتا
میں لیڈر ویکھن چل پیا
اتہاس اپنا بُھلا دِتا

میں ننگی پیریں دوڑ پیا
میرا لیڈر بوہڑ رہیا سی
بوہڑا اوئے طبیبا نئیں تے میں مر گئیاں
''ہٹ اوئے کم ذاتا''
میتھوں میرا لیڈر کھوہیا
اتھرواں دا سمندر
ہیراں دا اجڑ تے کیدواں دی اگوائی
بالناتھ دے ٹلے کنھے کن پڑوائے سن
عیالی کیہ واج ماری سی
اوئے ظالمو، پنوں نوں کیہ پیا دِتا جے
میر شمیر نوں روکو، کلاشنکوفاں لہراندے آرہے نیں
مرزیا کتھے تیرے تیر؟
کتھے تیری بکی؟
کھرلا کتھے تیری ساوی؟
دُلیا کتھے تیری نیلی؟
سارے ہیروئین دیاں پُڑیاں نیفے وچ لکائے او؟
چغتیاں دی خیر؟
خیر برکلی دی
نواں عالمی نظام
نواں برکلی
کتھے مراد فتیانہ۔۔۔اُٹھ شوگر مل لگا
اُٹھ دُلیا، نیلے گنبد وچ نواں فوارا اُلیک
شاہ حسین۔۔۔چھڈ چرخہ نویں ٹیکسٹائل مل لگا
بُلھیا، گھر اڑے مارتے آلے دوالے کولوں بے خبر ہو
خواجہ فرید، رکھ انگریزی تھانے تے اوہناں دے افسر
پٹواری، تھانیدار، تحصیلدار، ڈی ایس پی سارے آ گو
چا کر ہاں اسی تہاڈے افسرو
تُسی چاہو تو الیکشن جتیئے نہیں تے ضمانت ضبط
خاکی وردی سر دے صاحب
اس نتانے، نمانے
دفتراں وچ نتیجے بنن
ووٹ صندوقڑیاں ست ماہیں جمن
ٹیلی شیٹ بناں دستخطاں
کورے کاغذ تے
کاشنکوف دے برسٹ

’’چہار سُو‘‘

اک،دو،چار،اٹھ،سولاں
قصائی دا چھڑا، پندرہ گل کٹے
اِک واری نہیں چھ واری پھیرا آیا
صاحب جی رحم کرو
انھی زنانی دا جُسہ کھدیڑیا
سزا وی ملے زنانی نوں
بچیاں تر کڑی توڑ دِتی
کلیاں اچکناں پپیاں روڑی اپر
پلس مقابلہ، ماریا گیا
اوہ کون سی
مال روڈ تے جلوس، اتھرو گیس
شیشے دکاناں دے بھج گئے، اوہ کون سی
پھُل کریدے تے رنگ نیلا
گلاب میتھوں ویکھیا نہ جائے
سورج مُکھی نوں موتیا ڈھلیا
چور تے کُتی ساجھے دار
لٹ گئے جھگے وار و وار
اُٹھ بندے تے اک زنانی
قیامت کیوں نہ آئی
کاراں ہیٹھ لگدی پھردی
منصف آکھے سب ٹھیک اے
سپیشل ٹریبونل نے فیصلہ دِتا
ملزم بری مدعی جیلے
لیڈر رو پکھن چلی سی کملی آپے لٹ پٹ گئی
کاراں دا قافلہ
آوے ای آوے
رشوت، زنا، ڈاکے، اغواء
آوے ای آوے
ننگیاں نچاواں گے بازاراں وچ
آوے ای آوے
بدمعاشاں دا راج
آوے ای آوے
غنڈیاں دی پردھانی
شہباز قلندر، مست مست
لطیف بھٹائی، مست مست
دمادم مست قلندر
تیرے عشق نچایا تھیا تھیا
می رقصم می رقصم
رب دِلاں وچ رہندا
باقی سب کچھ بھن دے
ہُو ہُو دا ورد
روم روم وچ جھوٹھ
لہو دے کئی رنگ ہوندے نیں
لال کالا تے ہرا تے سفید وی
پر کیہڑا اصلی رنگ؟
لال، کالا، ہرا کہ سفید
خون دے گروپ کئی ہوندے نیں
پازیٹو تے نیگیٹو
یونیورسل ڈونر، یونیورسل ریسی پی انٹ
وڈا دکھانت اوہدا جیہڑا سب نوں خون دیوے
پر آپ سہکے ڈونر نوں
ہسپتال دے باہر رش بلڈ ڈونراں دا
اندر ہڑھ ریسی پی انٹس
نفسا نفسی، آپا دھاپی، چھینا جھپٹی
’’دھی ماں نوں لٹ کے لے گئی
جدا آپو دھاپی پے گئی‘‘

فخر زمان کی شاعری میں انتظار کی شدت اپنے کئی رنگوں اور کیفیتوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ جس کے باعث اس کی شاعری میں نفرت کی ایک ایسی فضا تشکیل پاتی ہے جس میں خود سپردگی کا عالم نمایاں طور پر سامنے نہیں آتا ہے۔ ایسا انتظار ہرگز نہیں جو پلکوں پہ ستارے روشن کردے، گھر کا بھی یہ عالم نہیں کہ در و دیوار سے دیدار کی حسرت ٹپک رہی ہو، دریچے نیم وا اور کھلے ہوئے نہیں ہیں، نہ جانے کس کا انتظار ہے؟ دروازہ کھولنے پر اچانک محبوب سامنے کھڑا نظر نہیں آئے گا۔ یہ وہ صورتحال بھی نہیں کہ دن بھر کسی کا راستہ دیکھیں، یہاں تک کہ شام ہو جائے، آنکھیں دھندلا جائیں، یہاں تو صبح کا بھولا شام کو بھی نہ لوٹے گا۔ بلکہ یہاں تو صورتحال ہی دوسری ہے۔ ملاحظہ کریں انتظار کرنے کا یہ بیان کتنا دردناک ہے:

میری کُکھ وچ درد کا نگاں ہمک رہیاں نیں
میری چھاتی وچ دُدھ ہنیری جھل رہی ہے
میرے ڈھڈ وچ نومہیناں دا سوالیہ نشان
اجے صرف تن سینٹی میٹرا ے

تے یاراں سینٹی میٹر تیکر اپڑن لئی
پیڑاں دالماں پندھ میرے پیراں دیاں تلیاں
دے چھالیاں دی اُڈیک وچ پھاوا ہوریا اے
تے اجے رات لمی اے، کالی اے، ٹھنڈی سیت اے
یاراں منفی تن سینٹی میٹراں توں بعد
سر جنادا اصلی پیٹر سفر شروع ہوندا اے
تے میں یاراں منفی تن سینٹی میٹراں دی اُڈیک
دی کُنڈلی وچ پھاتھی
اک اک پل جیبھ شیشہ درد پتھر ہیٹھ دبا کے
پھاتی دی پھڑکن دی تصویر بنی سوچ رہی ہاں
کد میرے ڈھڈ وچ رُلکدا سوالیہ نشان
جگ اُپر ظاہر ہو کے
کتنے سارے اُڈیکدے جذبیاں دی لاج رکھے گا

(یاراں 11 منفی تن 3 سینٹی میٹر)

فخر زمان کی فکرافروزی نے انہیں فکر و دانش کی حد بندیوں سے بے نیاز کر دیا ہے اور وہ اقدار مایوس بھی نہیں کہ نتیجہ کے طور پر اشیا کو بے کار محض اور دوراز کار قرار دے دے۔ البرٹ کامیو سے وہ کسی طور پر فلسفیاتی رشتہ سے منسلک نہیں لیکن ہوسکتا ہے کہ کالن ولسن کے نادریافت شدہ اجنبیوں میں سے ایک ہو جو منزل سے ناآشنا ایسے تنہا مسافر ہیں جن کو کوئی نامعلوم اندرونی طاقت ایسے مقام کی طرف لے جا رہی ہے جہاں سے مراجعت ممکن نہیں۔ بقول پروفیسر زمر دایم ملک اس کی شاعری میں ''اینٹی نظم'' کے شواہد بھی ملتے ہیں۔ بچ اور شاشٹا پو جیسی نظمیں حسنِ تخلیق کی سرحدوں کو چھو لیتی ہیں مگر تخلیقی حسن کے معراج کو نہیں پہنچتیں۔ اس کی شاہکار نظمیں وہ ہیں جو خمیر الاصل ہیں اور جوان اشیاء سے تعلق فطری سے پیدا ہوئی ہے۔ ''رُکھ دا سوال'' ہمیں اپنے آخری دور کے والٹ وٹ مین اور بدلی ہوئی سمت کے زمین گز برگ کی یاد دلاتا ہے یہ ناانصافی ہوگی اگر اینٹینا، بیک پروجیکشن اور ڈیپ فریزر کا ذکر نہ کیا جائے۔ نظم ''رُکھ دا سوال'' ملاحظہ کریں:

میرے سر یرتوں پھٹیاں ہوئیاں
میریاں ٹہنیاں، لغراں پرنمبلیاں (میرے کئی ہتھ)
اسماناں ول مونہہ کر کے
اپنے سکے بُلاں تے جیبھاں پھیرن
میرے جُسّے توں نکلیاں ہوئیاں
جڑاں (میرے کئی پیر)
زمیں دے دُھر اندر جا کے
اپنی تریہہ بجھاون دا جتن کرن

تے میں کئی ہتھاں پیراں والا
کھوکھلی، کھاہدی مٹی والا (جس دی دِسنی کلاویوں ودھیک)
جِتّوں اُچی پگ والا چکی راہ ورمے وانگوں کُترے
جدے کھوڑاں وچ گاہلڑاں، کیڑیاں، سپاں گھر بنائے
سب کجھ ویکھاں کجھ نہ بولاں
میرے خون تے پنگراں ودھن والیو
میریو ہتھو پیرو، میریو بچیو، سدا جیوو پر
جے میں ٹٹ ڈِگا
تے اسمان تے زمین تہانوں جھولی پالیون گے؟

(رُکھ دا سوال)

ہم سب ادھورے لوگ ہیں کیونکہ ہم اس محاوراتی آدمی کی طرح اندھے بہرے اور گونگے ہیں جو فلم کو دیکھ سکتا ہے لیکن آواز سن نہیں سکتا اور دوسرا آواز تو سن سکتا ہے لیکن فلم کو دیکھ نہیں سکتا۔ سیاسی نظام پر چوٹ کا یہ انداز ملاحظہ کریں:

میں فلم ویکھ سکدا ہاں
میں ساؤنڈ ٹریک نہیں سُن سکدا
میں ساؤنڈ ٹریک سُن سکدا ہاں
میں فلم نہیں ویکھ سکدا
میں فلم ویکھ سکدا ہاں
میں ساؤنڈ ٹریک سُن سکدا ہاں
میں ساری کتھا داسِٹہ کڈھ سکدا ہاں
پر میں بول نہیں سکدا

(ڈورے، انھّے تے گُنگے دی سانجھ)

فخر زمان غالباً پنجابی کا پہلا شاعر ہے جو شہری زندگی کے عمومی واقعات کو شعر و ادب میں ڈھال دیتا ہے۔ فخر زمان میں ایک دانشور کے تجربات محض علامتی نہیں، ان میں سماجی حقیقتوں کی آمیزش بھی ہے۔ فرد اور سماجی تجربہ کے کامیاب تشخص کی صلاحیت نے اسے شاعر بلکہ ایک ایسا شاعر بنا دیا ہے جو تلخ کلامی کے باوجود زندہ رہے گا کیونکہ زمانے کے ساتھ ساتھ وادیاں شہری آبادیوں میں تبدیل ہو جائیں گی۔ نظم ''چر داسٹہ'' میں پنجاب کی ثقافتی تاریخ کے حوالے سے پنجاب کی صورتحال کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نظم ملاحظہ کریں:

ساڈا تے کوئی دوش نہیں جے
سارے شہر دی بجلی بند اے
تھوڑا جیہا ہوراڈیکو
کِنّاں کو چر؟ ایہہ تے دَسو؟
چِر دا کوئی گویڑ نہیں ساڈے کولوں ہوندا

بجلی تے دُھر پچھوں بنداے
اون لگے تے پلو پلی آجائے (جیویں مرزے نوں نیندر)
نہ آوے تو بھاویں گھنٹیاں تیکر نہ آوے
پر کجھ تے دسو...... کجھ تے بولو......
کدوں ہنیر یاں کولوں ساڈی چُنڈ چھُٹے گی؟
چنگا...... چر داسٹّہ کڈھ لینے ہاں
سُنو مُڑ کن توں کپڑ االاہ کے، پُورے گوہ نال
جِتّے چر وچ رانجھن اپنے کن پڑوائے
جِتّے چر وچ پُنّن کیچ ول جاندیاں راہ وچ
نشیوں اُبھڑ واھیا اُٹھیا
جِتّے چر وچ سوہنی دا کچ دا گھا گا گھلیا
جِتّے چر وچ دانا بارتوں کھیوے دے گھر تیک
بلّی اَپڑی
جِتّے چر وچ پورن نوں سلواہن نے انھّے کھوہ وچ
لتّاں بانہواں بھن کے سُٹیا
جِتّے چر وچ دُلّے اپنے گل وچ پھاہی پائی
نالے ہَس کے نظام دین نوں اکبر لئی سنیہڑا دِتا
میں بھنّاں دِلی دے کنگرے تے دیواں شکر وانگوں بھور
میں لیاواں اکبر دیاں رانیاں بنھ کے کھوتیاں وانگوں ٹور،
جِتّے چر وچ لہنے لوہار تیر نوں اَنی لائی
جِتّے چر وچ دُلّے دی نیلی
کھرل دی ساوی
مغل چغتیاں، انگریزاں دی ہٹھ توں
دور اڈے ونجی
جِتّے چر وچ شاہ حسین نے چرخہ ڈاہ کے تنداں پائیاں
جِتّے چر وچ باہو دل دریا دے اندر چُبھی ماری
جِتّے چر وچ میاں محمد ویلنے اندر گنّا بن کے
رس ڈھلوائی
جِتّے چر وچ بلّھے شاہ نے پچھیا پئی کیہ جاناں میں کون
جِتّے چر وچ روہی اندر نازک جٹیاں
راتیں کرن شکار دِلاں دے
ڈیہاں تاں ولوڑن مٹیاں
جِتّے چر وچ سانول مٹھل، رانجھن، پُنّل سک دیاں سانگاں
سولاں جرنیاں سکھیاں
اونے چِر وچ......

اُچیاں، تتیاں کھمبیاں نال
پوہڑیاں لا کے...... مہڑ کے چوندے جُسّے
نویاں تاریاں جوڑ کے چانن کر دیون گے

فخر زمان کی اصل شناخت ان کی پنجابی تحریریں ہیں۔ انہوں نے نظم ونثر دونوں میں قابل ذکر کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں۔ ان کی تحریروں کے دنیا کی دوسری زبانوں میں تراجم بھی ہو چکے ہیں۔ انہیں دنیا بھر میں پنجابی زبان کے حقوق کے ایک بڑے علمبردار کے طور پر جانا جاتا ہے۔ ان کے سیاسی نظریات میں مزاحمتی رنگ و آہنگ ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ ریاستی ظلم و جبر کے خلاف ایک زور دار آواز، پسے اور کچلے ہوئے عوام کے غصب کردہ حقوق کی بازیابی کا نعرۂ مستانہ اور مجبور ومقہور معاشرے کو درپیش مسائل ومصائب کے خلاف اعلانیہ جنگ، وہ اجزائے ترکیبی ہیں جن سے ان کی شاعری کا خمیر گندھا ہے۔ فخر زمان اور اس کی شاعری کو اس حوالے سے ایک نمایاں مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

جسے بھی شوق خود منزل نہیں ہے
وہ نا قابل کسی قابل نہیں ہے

جناب رب نواز مائل کوئٹہ، بلوچستان کے سینئر اور ثقہ شعرا میں نمایاں مقام کے حامل ہیں۔ پیرانہ سالی کے باوجود آپ شعروسخن کی نسبت عزم جواں رکھتے اور ہر دم تازہ دم کی مثال بن کر اردو زبان وادب کی خدمت میں تن من دھن سے کوشاں ہیں۔ حال ہی میں آپ کا تازہ شعری مجموعہ ''غزل بنایا اُسے جو نیا خیال ملا'' منظر عام پر آیا ہے۔ ہر غزل اور غزل کا ہر شعر اپنے اندر ایک نئی معنویت اور احساس لئے ہوئے ہے۔ ہمارے چند بے ترتیب جملے اگر آپ کے دل میں آتشِ شوق کو ہوا دینے میں کامیاب رہے ہیں تو مندرجہ ذیل پتہ پر رجوع کیجیے جہاں رب نواز مائل کا تازہ شعری مجموعہ آپ کا منتظر ہے۔

سکام ادبی اکادمی، 513/181، کوچہ قادر شہید، فقیر محمد روڈ، کوئٹہ

☆

''کعبہ مرے آگے!''

سید شبیر حسین شاہ

(گجرات)

فخر زمان پر الزام ہے کہ وہ ایک جانبدار سیاسی ادیب اور دانشور ہے۔اس الزام کے پس منظر میں پاکستانی سماج اور ریاست کا ایک گہرا بحران کھڑا ہے یہ بحران اس ٹکراؤ میں بھی نظر آتا ہے جو پاکستانی اہلِ دانش میں شدت سے محسوس ہوتا ہے یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ یہاں ایک دھڑے بندی موجود ہے اور ہر ادیب اور دانش ور جس کی کوئی حقیقی بنیاد موجود ہے کسی نہ کسی دھڑے میں کھڑا ہے یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بہت سے لوگ کسی بھی دھڑے میں نہیں ہیں، یہ نہیں کہ وہ غیر جانبدار ہیں بلکہ وہ مقتدر قوموں کے ساتھ ہیں۔فخر زمان میں شائد کچھ نظریاتی کنفیوژن ہوں گے مگر وہ ایک دھڑے کا بندہ ہے۔کبھی معتبر ہونا کبھی معتوب ہونا اس کا مقدر نہیں ہے بلکہ ایک دیدہ دانستہ Option ہے یہیں سے ہم ایک عہد کے ادب سیاست اور دانش کی قبیلہ بندی کرتے ہیں اور خود ہمیں تاریخ صرف ایک ہی حق دیتی ہے کہ ہم خود طے کریں ہم کس قبیلے کے لوگ ہیں میرے خیال میں فخر زمان نے اپنے ناولوں میں اپنی شاعری میں اور اپنے ڈراموں میں جن نظریاتی مسائل پر اپنی جانبداری کی شناخت حاصل کی ہے وہ قابلِ اختلاف تو ضرور ہے مگر قابلِ اعتراض نہیں ہے۔ایک وقت یہ سوال بھی پیدا ہوا تھا کہ پاکستان کی سیاسی تحریک کا ورکر اور لیڈر اپنے عہد کا تاریخی وجدان رکھتا ہے کہ نہیں اور کیا وہ تاریخی وجدان ہمارے عہد کے دانشور اور ادیب میں بھی موجود ہے کہ نہیں ہے یا پھر سیاسی تحرک کا اکا دکا سیاسی ورکر ہوتا ہے یا ادیب اور دانشور، بہت کم لوگوں نے اس سوال پر سوچا کہ آخر ہم تاریخی وجدان کہتے کسے ہیں۔اگر اس سے مراد اس عہد کے انسانوں کی تاریخ کی اگلی منزلوں تک کامیاب وکامران پہنچنے کے لیے لائحہ عمل بنانے کی صلاحیت سے ہے تو پھر فخر زمان کے حوالے سے پہلا سوال یہ اہم ہے کہ ایک طرف آپ سماج کو روشنی، نئے شعور اور سماجی اور سیاسی انقلابیت کی طرف لے کر جانا چاہتے ہیں دوسری طرف آپ پنجابیت کے تعصب میں گرفتار ہیں اور شعور پر سترھویں اور اٹھارویں صدی کے مقامی ادب کا آسیب مسلط کرنا چاہتے ہیں تو آپ کا یقیناً جواب ہوگا کہ جو پنجابی ادب آپ کو آسیب اور پنجابیت کا تعصب نظر آتا ہے دراصل وہ ایک انقلاب کا پیغام ہے، اس عہد کی فرسودگی کے خلاف ایک مسلمہ بغاوت ہے اور مظلوم لوکائی کے احساسات کا شاندار مظہر ہے۔آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ پنجابی شاعری آج کے انسان کو بھی انقلاب پر اکساتی ہے۔آپ کا دوسرا موثر جواب یہ ہو سکتا ہے کہ ماں بولی اور دھرتی ماں ہم پنجابیوں کا فخر ہے اور اگر اس سے پیچھے ہٹ گئے تو ساری شناخت ختم ہو جائے گی مگر انقلاب کی کیا قدر و قیمت رہ جائے گی۔ہر کوئی اپنی مرضی کا انقلاب چاہتا ہے مگر یہ عجیب بات نہیں ہے کہ آپ انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں پنجابی رہتل میں اور طریقے برطانوی سیاست کے اور فلسفہ روسی استعمال کرتے ہیں۔اگر پشکن، ٹالسٹائی گورکی اور دوستوفسکی وغیرہ ایک انقلابی آہنگ پیدا کرتے ہیں جس میں سے لینن، ٹراٹسکی اور سٹالن مارکسی انقلاب برپا کر لیتے ہیں تو یہ کیوں ممکن نہیں ہوا کہ بابا بلھے شاہ، شاہ حسین اور سلطان باہو ایک انقلابی آہنگ پیدا کرتے اور کوئی انقلابی قائد انقلاب برپا کر لیتا دراصل ہمارے سماج کی Introvert Psychy ان شاعروں کے درد کو گھونٹ گھونٹ پی گئی ہے اور نعرۂ انقلاب برپا نہیں کر سکی۔آج فخر زمان داعی ہے کہ ہماری دھرتی کی کوکھ ابھی انسانوں کی عزت کا کوئی نظم پیدا کرنے کی صلاحت رکھتی ہے۔کوئی دھرتی ماں بانجھ نہیں ہوتی اور لازماً پنجاب کی دھرتی بانجھ نہیں ہے اگر بانجھ ہوتی تو احمد خاں کھرل اور دُلا بھٹی جیسے سورما اور بلھے شاہ اور شاہ حسین جیسے اہلِ دل کیسے پیدا کرتی اور آج فخر زمان کا سر کیوں اونچا ہوتا۔مگر یہ اونچا سر مجھے گہری سوچوں میں ڈوبا ہوا دکھائی دیتا ہے۔وہ سماجیات میں پھیلے استحصال کی مختلف شکلوں کو اپنے ڈراموں اور اپنے ناولوں میں سوچتا ہے۔انسانوں کی ذلت اور بے بسی کو اپنے کرداروں میں اجاگر کرتا ہے اور قاری کو ان کی مدد کے لیے طلب کرتا ہے یہ رول کارل مارکس نے درمیانے طبقے کے لیے طے کیا تھا۔اپنی سماجیات کی ماہیت کو گہرائی سے دیکھنے کی دانشورانہ صلاحیت فخر زمان کو اس معاشرے کی حالت زار سمجھنے میں بہت مدد دیتی ہے۔یہاں وہ ایک حقیقت پسند ادیب کی حیثیت اختیار کرتا ہے اور انسانوں کے دکھوں کے پیچھے ذمہ دار طاغوتی طاقتوں کو تلاش کرتا ہے اور ان سے لڑنا بھی چاہتا ہے۔یہ اُس کے انقلابی ہونے کی دلیل ہے مگر وہ پنجابی وطنیت کے رومان میں بھی مست خراماں ہے یہاں اُن فلسفیانہ وضاحتوں کی ضرورت ہے جو اس وجدانی کیفیت کو کسی ممکنہ انقلابی تحرک سے دو آتشہ کریں۔اس فکری اور نظری بلوغت کو پالینے کا فریضہ فخر زمان سمیت ان تمام دانشوروں پہ بھی عائد ہوتا ہے جو جدید گلوبل سامراجیت کے اس عہد میں انسانوں پر استحصال کی انتہائی جدید حالتوں کو بدلنا چاہتے ہیں اور اپنے زمانہ وسطی کے قومی تشخص کو بھی برقرار رکھنا چاہتے ہیں اور اپنے حقِ زندگی و خوشحالی کو قوم کے دائرہ میں رہتے ہوئے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ہمارے عہد میں گلوبل سامراجیت کا پھیلتا ہوا آسیب اپنے ایجنڈے میں قومی شناختوں کی بربادی کا کوئی بنیادی پروگرام نہیں رکھتا۔اس کا بنیادی مفاد دنیا کے وسیع و عریض جغرافیے پر پھیلے ہوئے وسائل پر اپنا تسلط قائم کرنا ہے۔سامراجیت نے ان وسائل کی زمینوں پر بسنے والی قوموں، نسلوں یا ریاستوں کے حقِ ملکیت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔گلوبل مارکیٹ کا پھیلاؤ وہ اعلیٰ

ترین ہتھیار ہے جو قوموں کو ان کی اقتصادی اساس سے محروم کرتا ہے۔ اگر ایسا ہو جائے گا تو وہ تمام شناختیں خود بخود Dilute ہو جائیں گی جن کے لیے فخر زمان جیسے لوگوں نے جدوجہد شروع کر رکھی ہے۔ زبان، قومی شناخت، کلچر، ادب، شاعری اور موسیقی کو Property Concept میں رکھ کر زندہ نہیں رکھا جا سکتا۔ تاریخ کے بے رحم فیصلے ہمیشہ طاقت ور عناصر کے حق میں ہوئے ہیں۔ گلوبل مارکیٹ کا پھیلتا ہوا طاغوت گاہک کی زبان اور اُس زبان کے افسانہ نگاروں اور شاعروں سے کہیں خوفزدہ نہیں ہے۔ اس کی قوت Hi Tech Computer اور اعلیٰ سائنسز پر اس کی اجارہ داری میں ہے، اس کے عیسائی ہونے یا انگریزی بولنے میں نہیں ہے۔ لہٰذا اعلیٰ سائنسز کی Definations کو اپنے لہجے کی طاقت سے اپنے حق میں استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ لہجہ پتہ نہیں ماجھی ہو کہ پوٹھوہاری ہو جرمن ہو یا سنہالی ہو انقلاب کی بھی اپنی کوئی کلچرل شناخت نہیں ہوتی نہ بنائی جا سکتی ہے۔

بہر حال مجھے فخر زمان یا اس قبیل کے دوسرے ادیبوں پر کوئی اتنا بڑا اعتراض بھی نہیں ہے۔ کیونکہ جن انسانی احساسات اور درد کو وہ اپنی ادبی واردات سے شناخت کرتے ہیں جسے وہ اپنے قاری تک Communicate کرتے ہیں وہ بھی کافی ہے۔ ایسا بار بار ہوا ہے کہ بڑے بڑے دانشور اور ادیب لوگ کسی معاشرے میں موجود ہوتے ہیں مگر وہ معاشرے بڑے بڑے سیاسی لیڈر پیدا کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ تہذیبی اداروں کی یکساں ترقی ایک ترقی یافتہ عہد پیدا کرتی ہے۔ فخر زمان کے عہد میں اس کے اپنے خیال میں ایک بڑا لیڈر پیدا ہوا تھا جو بے رحم Tragedy کا شکار ہوا، حال ہی میں ایک لیڈر ظالمانہ ٹریجڈی کا شکار ہوئی۔ اس سے لازماً ایک Inspiration پیدا ہوئی ہے مگر ایک سوال بھی پیدا ہوا ہے کہ پھانسی چڑھنے والا لیڈر بڑا آدمی تھا کہ نہیں۔ ناول نگار نے تو ہم تک وہ درد اور جگر سوزی Communicate کی ہے۔ بڑا آدمی تو آمریت اور مارشل لاء نے کہیں Communicate نہیں ہونے دیا۔ نوحہ گری کرنے اور مسند شاہی پر دھاوا بول دینے سے فخر زمان بہت اچھی طرح واقف ہے اسی لیے تو وہ سیاستدان ادیب ہے۔ کہتے ہیں یزیدیت آج بھی موجود ہے پھر حسین کے وارث اس پر خروج کیوں نہیں کرتے اس کا جواب فخر زمان پر ادھار ہے ہمیں ادھار طلب کرنے کی جلدی اس لیے نہیں ہے کہ ہمیں تاریخ کے ایجنڈے پر سر دست کوئی بہت بڑا انقلاب دکھائی نہیں دیتا اور ہمارا معاشرہ جس قسم کی جکڑ بندیوں میں سانس لے رہا اور جو فخر زمان کے ست گواچے لوک میں ہمیں کسی حد تک دکھائی دیتا ہے۔ یہاں ہم پیش کی گئی کرداریت پر لمبی چوڑی بحث کر سکتے ہیں مثلاً ہم کہہ سکتے ہیں فخر زمان نے ان کرداروں کو جو حقیقی طور پر ہمارے اردگرد موجود ہیں اپنی سیاسی خواہشات کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ سیاسی پراپیگنڈے کی کچھ اپنی ضروریات بھی ہیں ایک جمود زدہ معاشرت میں کرداروں کی ہیئت کے بدلنے کا عمل زیادہ شدت کے ساتھ اس لیے بھی تخلیق کیا جانا ضروری ہے کہ آخر معاشرے میں تبدیلی کی قوت کا وجود تو نظر آئے اور ہماری نسل در نسل کی درماندگی نے کوئی بازی تو سر کرنی ہے، کیوں نہ وہ بازی سر ہو جس کا تعین فخر زمان نے کیا ہے۔ اگر ایسا نہ بھی ہو تو ہمیں اپنی اوقات کا تو پتہ ہونا چاہیے، ادیب کا کیا یہ کمال کافی نہیں ہے کہ وہ حقیقت نگاری کرتا ہے، چاہے یہ حقیقت بھی خود اس کی اختراع کیوں نہ ہو۔

سامراج کو گالی دے دینے والا لفظ بھی اپنی اوقات میں انقلابی ہونے کا داعی ہے، اسے یہ شعور ہی نہیں ہے، خود اس کی اوقات ہی تو یہ تعین کرے گی کہ وہ انقلاب برپا کر سکتا ہے کہ نہیں۔ بندی وان کا پھانسی کا قیدی ناول میں تو یہ کہتا ہے کہ:

''میں اکلا ایہہ سارا کُجھ کس طرح کر سکنا واں، ایہدے لئی لوکاں دی طاقت تے جاگرتی دی لوڑ اے''

مگر یہ قیدی حقیقت کی دنیا میں پھانسی کی کوٹھری سے بات کرتا ہے

کہ ''یہ ایک تاریخی غلطی تھی کہ ظالم اور مظلوم کو اکٹھے لے کر چلنے کی کوشش کی گئی''

ناول کے قیدی کا تجربہ ہمیں ایک ایسی پارٹی کی تشکیل پہ ابھارتا ہے جو اجتماعی تحرک کی اگوا کار ہے۔ حقیقت میں قیدی اس پارٹی کی ساخت پر انتباہ کرتا ہے جسے ہم انقلاب کی باگ سنبھالنے کو کہتے ہیں۔ مگر پھر بھی یہ ساری بات محض افسانوی اور لفاظی ہے۔ ہم کسی کو اُکسا کر ورغلا کر تو قتل گاہوں اور پھانسی گھاٹوں تک نہیں لے جا سکتے۔ کہتے ہیں چھوٹا ادب وہ ہوتا ہے جو بڑے المیوں، واقعات کی Inspiration میں لکھا جاتا ہے اور بڑا ادب وہ ہوتا ہے جس کی Inspiration میں بڑے واقعات پیدا ہوتے ہیں مگر یہ بات ادب تک ہی محدود ہے ادیب پر لاگو نہیں ہوتی۔ ادیب کی تاریخی مجبوری ہے کہ اسے گلی کوچوں میں ایسے سینکڑوں لوگ ملتے ہیں جن کی پشت پر آمریت کے کوڑوں کے نشان ہوتے ہیں۔ وہ ان کا دکھ نہ روئے تو کیا کرے! ناول ''بے وطنا'' میں ہمیں اپنے ادیب کا ایک المیہ نظر آتا ہے وہ اس دھرتی کا نوحہ پڑھتا ہے، بین کرتا ہے یا اس کے لیے احتجاج کرتا ہے، جس پر حملہ آوروں کی تہہ در تہہ نسلیں آباد ہیں۔ مجھے نہیں معلوم حملہ آوروں کی کس پرت کی وراثت اس دھرتی پہ قائم ہے یا اسے اصل وراث تسلیم کر لیا جائے۔ ایک ایسے ملک میں جہاں ہر ایک نسل کا جدِ اعلیٰ گم شدہ ہے، جہاں شجروں کا حقیقی ہونا مشکوک ہے، جہاں ظالموں کی اگلی ہی نسل مظلوم بن جاتی ہے، جہاں جو حکمران گھوڑے سے اترتا ہے اس کا سر اچھال دیا جاتا ہے۔ فخر زمان کی کیا مجال ہے کہ کسی کا ساتھ دے اور کسی کو چھوڑ دے۔ دھرتی کوئی پہاڑوں اور کھیتوں کا نام تھوڑا ہی ہے کہ اس پر حملہ آوروں کے گھوڑوں کی ٹاپوں کے نشان دیکھ کر سسکیاں بھر لی جائیں، دھرتی تو زیر تسلط انسانوں کی دور دور تک پھیلی رہتلوں کا نام ہے جن کا کبھی کوئی والی وارث نہیں رہا، جہاں قلعوں کی اونچی اونچی دیواریں تو ہوتی ہیں مگر صدر دروازے حملہ آوروں کے لیے ہمیشہ کھول دیے جاتے ہیں۔ تاریخ کے لمحے لمحے کا ادراک ہمارے پاس ایک ہی خود ساختہ

آپشن چھوڑتا ہے کہ ہم اپنی مرضی کے ظالم اور اپنی مرضی کے مظلوم بنالیں۔ آخر ادب بھی تو Creat کرنا ہے۔ میں چونکہ تاریخ کا طالب علم ہوں اس روئیداد میں میرے دماغ پر ناول اور ڈرامے اتنے اثر انداز نہیں ہوتے جتنا تاریخ کے ہولناک لمحے مگر پھر بھی فخر زمان مجھ تک ضرور Communicate ہوتا ہے۔ میں اس کی کہانی مان لوں یا نہ مانوں مگر کہانی زوردار ضرور ہے۔ اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا یہی ادیب کی کامیابی ہوتی ہے کہ وہ نظر انداز نہ ہو۔ جیسے ناول کا زوردار اور زندہ کردار کبھی اس میں سے خارج نہیں ہوتا اسی طرح ایک ادیب جو سیاسی دانشور بھی ہے چاہے Propogandist ہی کیوں نہ ہو (حالانکہ فخر زمان ایک اچھا خاصا ادیب ہے لہٰذا زوردار پراپیگنڈہ کرتا ہے) اس کے پراپیگنڈہ میں ایک دُھائی اور ہاہاکار ہے وہ اس Entity کے دائرے میں ہے جسے حکمران طبقوں اور اعلیٰ درمیانے طبقے میں منافع خور دوکانداروں میں اور دائیں بازو کے دانشوروں اور ان کے زیراثر بابوٹائپ کارندوں میں حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے جو اس دائرے کے اگوا کار سیاسی خاندان کی پوری ایک نسل کا خون کر کے بھی نفرت اور بغض کی غلاظت سے نہیں نکلی اور ساری قبیل ہماری مقتدر قوتوں کی قدرتی اور نظری اتحادی بھی ہے لہٰذا فخر زمان کسی بھی طرح قابل قبول نہیں ہے۔ وہ اس ماں بولی کا وکیل ہے جسے خود اس کے بیٹوں نے تیاگ دیا ہے۔ اصل میں فخر زمان دھتکاری ہوئی چیزوں کا ساتھ دینے کی کوشش کرتا ہے۔ پنجاب کی دھرتی کے اشراف اور معززین اور حکمرانوں کے سب دھارے اب پنجابی نہیں بولتے۔ یہ اب غریب ان پڑھ اور دھتکارے ہوئے انسانوں کی زبان بن کر رہ گئی ہے۔ فخر زمان پنجابی زبان کی عزت کے پردے میں ان لوگوں کی عزت اور سیاست کا داعی ہے اور اس کے لیے وہ پنجابی کے کلاسیکل شاعروں کی شاعری کو علمی بنیاد بناتا ہے۔ اس کا دوسرے بہت سے انقلابیوں کی طرح خیال ہے کہ اس کلام میں اتنا طاقتور پیغام موجود ہے جو انسانوں کی زندگی بدلنے کے لیے جدوجہد کا آدرش بن سکتا ہے۔ مجھے بہرحال خود اس سے قطعاً اتفاق نہیں ہے۔ میرا خیال ہے سماج اور وقت اتنی تیزی سے تبدیل ہوتے رہے ہیں اور ہورہے ہیں کہ پچھلے زمانوں کا کوئی بھی کتابی علم آج کے دور میں کوئی انقلاب پیدا کرنے کی خود کفیل صلاحیت نہیں رکھتا۔ خود مارکسزم کی بیسویں صدی کی Inspiration کم از کم تاریخی حرکت کے ایجنڈے سے Issolate ہو گئی ہے اور بہت گہرے اور پیچیدہ سوالات اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ کچھ نئے نظریہ دانوں جن میں پیش پیش نوٹراٹسکائٹ بھی شامل ہیں کا خیال ہے چونکہ سامراجیت گلوبل قوت متحرکہ بن گئی ہے اس لئے اس کے خلاف مقہور اور مظلوم انسانوں کی جدوجہد بھی گلوبل اکٹھ کے زیراثر ہی ممکن ہے۔ مقامی انقلاب اب ممکن نہیں رہا ہے لہٰذا زبان چاہے وہ پنجابی اور سندھی ہے یا ملاوی اور سنہالی ہے صرف مقامی انقلاب کی ہی مددگار ہو سکتی تھیں۔ فخر زمان کو اس سے اتفاق نہیں ہے۔ ایک جگہ انہوں نے کہا ہے ویسے بھی علم کی کوئی مخصوص زبان نہیں ہوتی، علم اور سائنس وٹیکنالوجی کی صورت مائع کی سی ہوتی ہے اسے جس زبان میں ڈھالنا چاہیں ڈھل جاتا ہے۔ اس کے لیے کسی سانچے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ فخر زمان کا خیال ہے کہ یہ مائع سی شے جسے وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا علم کہتے ہیں اگر پنجابی زبان میں ڈھالی جائے تو ڈھل جائے گی۔ یہ تصور ایسے ہی کہ ایک جدید ترقی یافتہ کمپیوٹر (جو کہ ایک ٹیکنالوجی ہے) اس میں پنجابی زبان کا سافٹ ویئر ڈال دیں تو مسئلہ حل ہو جائے گا اور ہمارا دیس پنجاب سائنسی علوم کی آماجگاہ بن جائے گا۔ سائنسی علوم کوئی پرچیز ایبل آئٹم تھوڑی ہے جو کسی بھی زبان اور کسی بھی قوم کی ملکیت بنا دی جائے یہ تو معروض کے ساتھ بہت گہرے Interaction کے نتیجے میں حاصل ہونے والی علمی صلاحیت کی کوکھ سے پیدا ہونے والا علم ہے۔ یہ اسی کا ہوتا ہے جو اسے جنم دیتا ہے۔ ہاں یہ درست ہے کہ اس کی کوئی مخصوص زبان نہیں ہوتی مگر اسے سائنسدان کی اپنی زبان سے زیادہ قربت ہوتی ہے۔ لوگ زمانہ وسطیٰ میں سوال اٹھایا کرتے تھے کہ قرآن پاک کی ''عربی'' زبان محض مخاطب لوگوں تک پہنچنے کی ایک Methodolgy ہے اور اگر قرآن فارسی یا ترکی زبان میں ترجمہ کر کے لکھ دیا جائے تو وہ بھی اتنا ہی مقدس اور محترم کتابی جلد بندی ہو گی جتنی عربی کی ہے۔ یہ سوال مسلمان پچھلے ایک ہزار سال میں حل نہیں کر سکے پھر سائنس کا علم سمجھنے کے لیے کوئی بھی زبان استعمال کی جاسکتی ہے (ترجمہ کرنے کے بعد) مگر سائنس کی اگلی ایجادات کرنے کے لیے زبان سے زیادہ سائنس دان کی ضرورت ہو گی اگر پنجابی بولنے والا سماج جدید دنیا کو Compete کرنے والے سائنسدان پیدا کرے تو وہ نئے بلھے شاہ اور نئے شاہ حسین پیدا کرنے سے بڑی بات ہو گی کم از کم اس گلوبل عہد میں تو ضرور ہو گی۔ اسی لیے انقلاب برپا کرنے کے لیے ہمیں دانش مند انقلابیوں اور عالمی سطح کے سائنسدانوں کی ضرورت ہے جو ایک سماجی جدوجہد اور معروض کے ساتھ Interaction کے ذریعے ہی پیدا ہوں گے۔ فخر زمان عالمی استعمار کی مظلوم قوموں کے خلاف جبر واستبداد کی پالیسیوں کو بھی بے نقاب کرتا ہے۔ وہ ساری مظلوم قوموں کے ساتھ یکجہتی اور اتحاد کی بات بھی کرتا ہے وہ اپنی زبان اور اپنا ادارہ لے کر ساری دنیا کے ادیبوں اور دانشوروں تک رسائی چاہتا ہے۔ اس کی یہ جدوجہد اس کے ادب شاعری، ڈرامہ اور ناول میں نمایاں نظر آتی ہے۔ لہٰذا وہ اپنی پہچان میں ایک انقلابی ادیب ہے مگر دو حصوں میں منقسم ہے پنجابی دوستی میں وہ پیچھے کی طرف سفر کرتا ہے سامراجیت کو منہدم کرنے کے لیے آگے کی طرف بڑھتا ہے۔

''یہ کعبہ میرے آگے، کلیسا میرے پیچھے'' والی بات ہے برصغیر پاک وہند کی لوکائی کا ایک مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنی نفسیات میں اندون بین ہے۔ یہ سماج باہر سے جتنے بھی زخم کھاتا، ظلم سہتا ہے انہیں لے کر اندر کی طرف بھاگتا ہے۔ کبھی کبھی تاریخ میں چیختا ہوا باہر بھی نکلتا ہے مگر بے سمت اندھادھند دوڑ پڑتا ہے اور پھر کسی دلدل میں پھنس جاتا ہے۔ ہندوستان میں پھوٹنے والے سارے

باقی صفحہ ۴۵ پر ملاحظہ کیجیے

’’اصحاب کہف کی تمثیل‘‘

ڈاکٹرشاہین مفتی

(گجرات)

فخر زمان کے ناول ایک قسم کا سکریچ ورک ہیں جیسے کوئی موبائل کا رڈخرید لے اور پھر آہستہ آہستہ احتیاط سے کُھرچنا شروع کرے، ہر روز پڑھے جانے والے عمومی نمبروں کی گنتی میں سے چند نمبرمل جل کر ایک نئے کوڈ نمبر میں ڈھل جائیں گے، نمبر فیڈ کیجیے اور اپنا رابطہ مطلوبہ دنیا سے جوڑ لیجیے، میں نے لفظ مطلوبہ فخر کی ذات کے خفیہ کوڈ نمبر کے لیے استعمال کیا ہے جسے مصنف نے بہت سوچ سمجھ کر اپنی ذات کی کسی گپھا میں چھپا رکھا ہے۔

ان ناولوں کو پڑھتے جایئے آپ پر کبھی نہیں کھلے گا کہ ان کے مصنف نے ایک باآسائش، پُرتعیش، صاحبِ اعتبار اور محفوظ زندگی بسر کی ہے، اس کے ناقدین نے اس کے ناولوں میں کافکا، کامیو، کانرڈ، ورجینا، وولف اور کولن وِلسن کی مشابہتی تلاش کرتے ہوئے ان ناولوں کو وجودی لاحاصلیت اور شعور کی رو کے زمرے میں لانے کی کوشش کی ہے۔ ایک آدھ نے انہیں رمزیت اور تمثیلیت کا اسیر پایا ہے اور کچھ انہیں منٹو کی جسمانی ترجیحات کے قریب پاتے ہیں، اپنے اپنے تناظر میں سب مطالعے ہی درست ہیں لیکن مصنف نے اپنی تحریر سازی کے دوران اپنے لیے جو پیغمبرانہ جگہ منتخب کی ہے اس کے ممدوحین کامل سطح پر اس مقامِ محمود کا احاطہ نہیں کر سکے۔ شعورِ ذات کے عمل میں تحریر نگار دو طرح کے رد عمل کا مظاہرہ کرتا ہے یا تو دوستوفیئسکی کا ایڈیٹ بن جاتا ہے محبوبہ کی جوتیاں سنبھالتا ہے۔ اس کے عشاق بھی اور اس کا قتل کیا ہوا جسم بھی لیکن اس سارے عمل میں خاکساری، معصومیت اور عفو درگذر کی ایسی مثال بن جاتا ہے کہ اس سے ہمدردی ہونے لگتی ہے دوسری جانب وہ اپنے ہر فعل کو خدائی امر کا درجہ دیتا ہے اور پھر لوگ اس کی تعلیمات کا پرچار کرتے کرتے اسے برگذیدگی کا تمغہ عطا کر دیتے ہیں اس کی مثال ’’زرتشت نے فرمایا‘‘ والے نطشے کی ہے۔ بنیادی طور پر فخر بھی ذکر ملامت میں اسی منزل کا تمنائی ہے اسی لیے اس کے ناولوں کا تمثیلی نظام ایک خطابیہ آہنگ رکھتا ہے اس نے اپنی ایک نظم ’’ایڈی پس‘‘ میں لکھا ہے

’’مائے توں کہیڑی گلے اپنے آپ نوں ماریں
مائے میں کیوں اپنیاں اکھاں انھّیاں کراں
اسی اک دوجے نال ویاہے ہوئے ہاں
اپنی مرضی نال
مائے نی توں بولدی کیوں نئیں
مائے۔۔۔۔دھرتی مائے‘‘

یاد رہے کہ فخر چار بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے لیکن یہاں فرائیڈ کا تذکرہ نہیں کیا جائے گا۔ آیئے اس کی ذاتی تعلیمات سے پہلے اس کے حاصل کردہ علم پر نظر ڈالی جائے۔ ایم۔اے سوشل ورک، ایل۔ایل۔بی ، سپیشلائزیشن افیئرز، اس تمام علم میں اس کی رسائی ایک استحصالی معاشرے اور انسانی بے بسی تک ہوئی ہے، یہ اندازہ بھی ایک مفروضہ ہی ہوگا تو آیئے اس کی تکلیف اس کے اکیلے پن ہی میں تلاش کی جائے

’’کون کِسے دا ٹھوٹھا بھر دا
کون ونڈا ندا بھار کسے دا
اپنا ٹھوٹھا آپے بھریئے
آپے چُکیے اپنی پنڈ‘‘

ذات کے اُبھار سے ظاہر ہونے والے ’’سات گم شدہ لوگوں‘‘ پر نگاہ ڈالیے اصحاب کہف کی تمثیل دھیان پڑے گی، وقت اور زمانے کے بھاری پتھر کو انہی کی لہروں کے سپرد کرتے ہوئے ساتوں آدمی دراصل ایک ہی آدمی کے سات رُخ ہیں جو مجازی حیثیت میں کلرک ہے، عاشق ہے، رومان پرور شاعر ہے، بغاوت کرنے والا دُلا بھٹی اور احمد کھرل ہے، کافی ہاؤس میں بیٹھنے والا دانش ور ہے اور پھر اسی کے پہلو سے جنم لینے والی روایتی عورت محبت کی متلاشی، محبت سے گریزاں اپنے تشخص کی خواہش میں مبتلا ہے، دوسری جانب یہی عورت تعلیم یافتہ، مردم بے زار، نشے کی دلدادہ اور زوال آمادہ ہے۔ فخر کے لاشعور کی آرکی ٹائپ نے اپنی ذات کے ہی سات سائے ترتیب دیئے ہیں اور پھر اپنے تجربات و مشاہدات کو اپنے سات حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

اُس کا دوسرا ناول ’’اک مرے ہوئے بندے دی کہانی‘‘ پہلے ناول ہی کی ایکسٹینشن ہے، استحصالی معاشرے کی ایک مستقل تصویر جہاں مصنف انسانی رشتوں کو سوچی سمجھی انویسٹ منٹ کا نام دیتا ہے، اُسے اپنے ہونے اور نہ ہونے کے درمیان اپنی واضح شکل اور چہرہ دکھائی نہیں دیتا، فلسفیانہ سطح پر وہ اپنی زندگی کے پہلے دن کو ہی موت کا دن قرار دیتا ہے، اس ناول کی کرافٹ میں پہلے ناول کی نسبت زیادہ تلخی اور بے زاری موجود ہے، خود رحمی، خود ترسی کے احساسات خودکشی کی خواہش جگاتے ہیں۔

کہے حسین نمانا مرنا چت نہ آئیو کیوں

یہیں سے ذات کی گمشدگی اور شعوری نظام کی القائی صورت جڑ پکڑتی ہے۔ ذات کا نشہ شراب کے نشے میں مل کر دوہری سچائی میں تبدیل ہوتا ہے، شخصِ غیر کی موجودگی دل پر بوجھ بنتی ہے اور مصنف انسانوں سے کٹ کر بھگت سنگھ، برکلے اور الفینسٹن کی خیالی دنیا سے ناطہ جوڑتا ہے، ناول کے آخری حصے میں شاہ حسین اشارہ دیتے ہیں ’’اس بندے نے جو یہاں دفن ہے میرے

ساتھ جھوک رانجھن جانے کی کوشش کی لیکن نہ جاسکا''۔

تشکیل ذات کے اس عمل میں ہم فخر کے تیسرے ناول ''بندی وان'' تک پہنچتے ہیں۔ یہ لفظ بھی اس کی ابتدائی سائیکی کا حصہ ہے ''کنسو ویلے دی'' میں ایک نظم کا عنوان ہے ''ایک ہور بندی وان'' اس کا خیال سارتر کے ناول ''The age of the reason'' کے بہت قریب ہے جس میں ہیرو بچے کی پیدائش سے متنفر ہے کیونکہ وہ آنے والے بچے کو زندگی اور اس کی مصیبتوں سے بچانا چاہتا ہے۔ فخر نے اپنی دوسری نظم کا عنوان ''چاقواں دا بندی وان'' رکھا ہے، جس میں موت اور ظلم کی ترساہٹ کے ملے جُلے جذبات موجود ہیں۔

''چاقوای چاقو
مینوں موت دے دندے اُپر
کھلوا کے آپے کِنے خوش او
کدے تے کوئی چاقو سدھا میرے دل نوں وِ ٹھے''

بندی وان کا ''زیڈ'' ''زمان'' کا مخفف ہے، لیکن زیڈ کی مشابہت ''ذوالفقار علی بھٹو'' اور پھانسی گھاٹ سے اس طرح جڑ گئی ہے کہ مصنف کی ذات پھیل کر اس کے محبوب رہنما کی ذات میں مدغم ہو گئی ہے، ''زیڈ'' جو قتل کے مقدمے کا سزایافتہ ہے پھانسی کے انتظار میں زندگی کے دن گذار رہا ہے، گبرئیل مارسیا کا ناول ''تنہائی کے سو سال'' دیکھئے انتظار اور برداشت کا منظر نامہ وسیع ہوتا چلا جائے گا، فخر نے استحصالی سیاسی نظام کی ایجنٹو کریسی کے توسط سے دانش وروں کی بے بسی، اشرافیہ کی عیاری، عشاق کی منافقت کا تذکرہ کرتے ہوئے پنجاب کے شاعروں، سورماؤں اور کلاسیکی محبت کرنے والوں میں پناہ ڈھونڈی ہے، ''زیڈ'' بنیادی طور پر تنہا ہے، اس نے ایک بلبل پال رکھی ہے جسے دھاگے سے باندھا گیا ہے، اس بلبل کی موجودگی ایک ساتھی، ایک موہوم سی امید اور ''زیڈ'' کی روحانی زندگی کی تمثیل ہے، پھانسی سے ذرا پہلے وہ اس بلبل کو آزاد کر دیتا ہے گویا اس کی روح نجات کے درجے پر پہنچتی ہے، دوسری جانب اس لمحے قید خانے کے زنانہ حصے میں ایک بچے کے پیدا ہونے اور رونے کی خبر آتی ہے ساتھ ہی ''زیڈ'' پھانسی گھاٹ اُتر جاتا ہے۔

''زیڈ'' کا عالم، فانی سے گذرنا اور ایک نئے بچے کی شکل میں جنم لینا اس امر کی دلیل ہے کہ مصنف بدترین حالات میں بھی زندگی اور نیکی کی فتح پر یقین رکھتا ہے بندی وان کو عوام کا قائد اور عوام کا نمائندہ بتایا گیا ہے، مزاحمت اس کا مذہب ہے اور سچائی اس کی طاقت، بلھے شاہ نے لکھا تھا

بلھے شاہ اساں مرنا ناہیں
گور پیا کوئی ہور

فخر اپنے نظریات کی ٹرانسفارمیشن کرتے ہوئے اس عالمِ شش جہت کو بھی ایک بندی خانہ سمجھتا ہے شاید اس کی انائے برتر اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ آدمی موت سے پہلے اس دنیاوی جنجال سے چھٹکارہ نہیں پاسکتا اور سولی پر چڑھے بغیر آدمی آدمیت کے درجے پر فائز بھی نہیں ہوسکتا۔

اس ناول سے ہم سوسائٹی کی اخلاقی اقدار کے بارے میں بھی وہ رویہ کشید کرسکتے ہیں جس میں طاقت ور کے لیے قانون میں طرح طرح کی موشگافیاں رکھ کر سہولت کا اہتمام کیا گیا ہے۔ فخر زمان کے اس ناول کو آزادی کا عہد نامہ کہا گیا ہے لیکن اس عہد نامے کو پنپنے کے لیے زیادہ وقت نہیں دیا گیا، عوامی رہنما کی موت نے عوام الناس کے لیے دو طرح کی ہجرتوں کے دروازے کھولے ہیں، ایک تو سیدھی سادھی ہجرت ہے جسے خود ساختہ یا عائد کردہ جلاوطنی کا نام دیا جاسکتا ہے اور دوسری ہجرت وہ ہے جس میں لوگ اپنے دیس، اپنے شہر، اپنی گلی اپنے گھر میں ہی اجنبی ہو گئے ہیں۔ ''بے وطنا'' اسی قسم کے احساسات کا ناول ہے ۱۹۶۰ء کے قریب قریب جب دوسرے صوبوں کی طرح اہل پنجاب نے بھی مادری زبان کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے پنجابی کلاسیکی شعرا اور ان کے کلام جمع بندی کے ساتھ ساتھ نوجوان پنجابی ادیبوں کے اجتماع اور پنجابی زبان کی ترقی اور ترویج کے لیے اسے سکولوں کالجوں میں متعارف کرانے کا بیڑا اُٹھایا تو صاحبانِ اختیار نے اسے علیحدگی پسندی کی تحریک سے جوڑ دیا، اس عہد کے ادیبوں شاعروں کو ترقی پسند تحریک کے ادیبوں کی طرح مشکوک سمجھا جانے لگا بلکہ ملک دشمنی کا الزام لگا کر ان ادیبوں کی کردار کشی کی گئی۔

فخر زمان ''ماں بولی'' کے لیے ہر طرح کی جنگ لڑنے والوں میں سب سے آگے رہے، ''بے وطنا'' ناول کا آغاز کچھ اس طرح ہوتا ہے ''میں اوہناں ساریاں لوکاں وچوں اک ساں جہڑے اپنے ہی وطن وچ بے وطن ہو جاندے نیں۔ ویکھن سُنن وچ تے ایہہ گل اچرج لگدی اے پر ہے ایہہ اصلوں حقی تے سچی۔ بدیس وچ بے وطنی تے سمجھ آوندی اے پر اپنی زمین اُتے بندہ کیوں اجنبی ہو جاندا اے، ایہہ گنجھل دارتے ون سونیاں پرتاں وچ لُکی لمی چوڑی کہانی اے''

اس کتاب کا انتساب ہی بے وطنی کی گنجھل کھول دیتا ہے۔

ناول کا سن تحریر ۱۹۸۷ء ہے، اسی ناول میں فخر عرفان کے درجے پر ہے اور اپنے پیغام کے اوراق کھولتا چلا جاتا ہے، اس کے نزدیک ہر تکلیف کا حل ''جمہوریت'' ہے ناول کے اختتام پر ہیرو پھانسی کی کوٹھری میں ہی ملتا ہے کیونکہ وہ ایک بار پھر سچائی کا زہر پی رہا ہے، اسی ناول کی اشاعت کے قریب قریب ڈاکٹر انور سجاد کے دو ناول ''جنم روپ'' اور ''خوشیوں کا باغ'' پاکستانی مارشل لائی صورت حال کے بارے میں لکھے گئے ہیں، لیکن پنجابی زبان میں فخر نے اپنا مدعا جس سہولت اور منطق کے ساتھ پیش کیا ہے وہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں۔ فخر کا اگلا ناول ''کم ذات'' مارکسی خیالات کے بہت قریب ہے، ناول نگار سوچتا ہے یہاں عشق کرنے والے سچے لوگوں کو کم ذات کیوں کہا جاتا ہے، آخر یہ لوگ ہی تو لیڈر بناتے ہیں، عام انسانوں کو خدائی درجہ دیتے ہیں اپنے لیڈروں پر قربان ہو جاتے ہیں، لیکن انہیں عزت و تکریم کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا مصنف سوچتا ہے

''ونڈیا ہویا بندہ کیویں لگدا ہے'' یہ ایک جذباتی ابال کا ناول ہے جس کے اختتام پر منصف نے نتیجہ نکالا ہے۔

''لوکائی ونڈی نئیں جا سکدی کیوں جے مٹی، نسل، قبیلہ، فرقہ، زبان، مذہب اک اے۔

مصنف کا آخری ناول ''توں کہ میں'' ''ست گواچے لوک'' کی طرح ایک آرکی ٹائپ ہے جس میں ایک کردار خیر بخش دوستی کی تلاش میں نکلتا ہے، خیر بخش کا جنم پاکستانی ہندوستانی تقسیم کے مشابہہ ہے اس لیے لوگ اسے دو سانکھی کہتے ہیں، خیر بخش وڈیرے کے ظلم سہتا ہے اور دوست کی تلاش جاری رکھتا ہے وہ کبھی دوست محمد سے ملتا ہے کبھی دوست لال سے کبھی دوست سنگھ سے اور کبھی دوست مسیح سے، آخر آخر وہ پانچ درختوں کی قلمیں زمین میں بوتا ہے جو پانچ قومیتوں سے مشابہ ہیں، ناول کے اختتام پر اس کی ملاقات نابری سے ہوتی ہے جو قومیتوں کی بھی قائل نہیں اور سرحدوں کو بھی نہیں مانتی بلکہ وہ اپنے آپ کو ساری دنیا کا باشندہ قرار دیتی ہے خیر بخش اس کے خیالات سے متاثر ہو کر اس کا ساتھ دینے کا عہد کرتا ہے۔ بھگتی، محبت، بھائی چارے اور امن کے اس پیغام کے ساتھ منصف کا ماورائی ہیولیٰ گوتم کے درجے پر فائز ہوتا ہے کیونکہ وہ جان چکا ہے۔

مآلِ سکندری کیا ہے

بقیہ۔ اپنے ہاتھ میں آئینہ

فخر زمان صداقت کا متلاشی ہے اور یہ صداقت انصاف و دیانت ہے، عدم احتیاج ہے، فراخدلی ہے، انسانیت کا احترام ہے اور بے شک صداقت کی طرف جانے والی شاہراہ عوامی مسائل میں سے ہو کر گزرتی ہے۔ عوامی مسائل کے لیے جانبداری ہی حقیقی غیر جانبداری ہوتی ہے۔

فخر زمان کی حیات وخدمات کا لُبِ لباب یہ ہے کہ قلمکار کو اپنے معاشرے، اپنے ماحول، اپنی قوم کے بارے میں سچ بولنا چاہیے اور اس کے لیے اسے سچ بولنے کی آزادی ہونی چاہیے۔ سچا لکھاری ہی قاری کی بصیرت میں اضافہ کرتا ہے۔ سچائی کے اس سفر میں فخر زمان عجیب وغریب خواب دیکھتے ہیں تو اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ وہ قومی زندگی کے بعض پہلوؤں سے غیر مطمئن ہیں۔ اس طرح وہ قومی مقاصد کے بھرپور حصول کا نمائندہ بن جاتے ہیں وہ انتشار اور پریشان نظری کے مقابلے میں سکون اور آسودگی کے پیامبر ہیں۔ اسی لئے تو تبدیلی کا مطالبہ کرتے ہیں اور جو لوگ تبدیلی نہیں چاہتے اُن سے فخر زمان کا اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ فخر زمان زندگی کی اقدارِ حسن وخیر کو نکھارنا، چمکانا اور آگے بڑھانا چاہتے ہیں اور محض خوب پر قانع ہو کر نہیں بیٹھ جاتے بلکہ خوب تر کی جستجو میں آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

☆

بقیہ۔ کعبہ میرے آگے

نام نہاد انقلابیوں کا یہی حشر ہوا ہے۔ یہاں تو اسلام کو بھی ہندوانہ لباس پہننا پڑا ہے۔ ہم نے کبھی نہیں سوچا کہ یہ محبت اور رواداری کا صوفیانہ پیغام بڑا حسین اور مدھ بھرا ہے مگر یہ انقلابی ہرگز نہیں ہے۔ اس کی اوقات میں یزیدیت کو گریبان سے پکڑنا ہے ہی نہیں۔ فخر زمان صوفی بھی ہے اور انقلابی بھی۔ وہ چیختا ہے تو انقلاب کی تلاش میں بھاگتا ہے، کبھی ماسکو کبھی بیجنگ کبھی چے گویرا اور کبھی ہیو گو شاویز کی طرف مگر اسلام آباد کی آمریتوں کی جکڑ بندیوں کا قیدی یہ ادیب واپس صوفی ازم میں پلٹ آتا ہے، شاہ حسین اور بلھے شاہ کی مدھر کافیاں، وارث شاہ کی نشیلی شاعری اس کے لیے پناہ گاہ کا کام دیتی ہیں۔

میرے خیال میں اس دھرتی کے انقلاب کو آمریت اور صوفی ازم نے مل کر برباد کیا ہے۔ ہاں یہ دونوں ایک دوسرے کے براہِ راست کبھی ساتھی نہیں رہے مگر ابن الوقت ادیب اور نام نہاد دانشور، دائیں بازوؤں کی بلیغ پرتیں اگر مارشلاؤں کی گود میں پھنسے رہے ہیں تو انقلابی دانشوروں کی ٹولیاں بھی صوفیائی مجاور بن کر سچائی کی تلاش کرتی رہی ہیں۔

کارل مارکس نے جس جمود کا ذکر کیا تھا وہ کسی نہ کسی شکل میں آج بھی اس دھرتی پہ موجود ہے۔ میری فخر زمان جیسے سوچنے والے ذہنوں سے اپیل ہے کہ آئیں ہم اپنی اگلی تاریخ کا ایک نیا لائحہ عمل تشکیل دیں جو گلوبل سامراجیت کے اس عہد میں ہمیں وہ اہلیت اور صلاحیت فراہم کرے جس سے ہم ایک مقابلہ کرنے والی معاشرت بن سکیں وگرنہ درماندگی اور بے کسی تو نصیب میں ہے ہی اور ہر عہد کا بھٹو پھانسی بھی چڑھے گا، بے نظیر شہید بھی ہوگی اور فخر زمان پنجابیوں کی عالمی کانفرنسیں بھی کرتا رہے گا۔ اسے ایوارڈ بھی ملیں گے اور ہم اسے سلام، مبارک بھی پیش کریں گے مگر یہ بات اب فخر زمان کے سوچنے کی ہے اور مجھے امید ہے کہ وہ سوچ سکتا ہے۔

''زردستارے''

(فخر زمان کے اردو کلام سے منتخبہ)

محمد اقبال بھٹی (برمنگھم)

○

لمحوں کا بھنور چیر کے انسان بنا ہوں
احساس ہوں میں وقت کے سینے میں گڑا ہوں

کہنے کو تو ہر ملک میں گھوما ہوں پھرا ہوں
سوچوں تو جہاں تھا وہیں چپ چاپ کھڑا ہوں

فٹ پاتھ پہ عرصے سے پڑا سوچ رہا ہوں
پتا تو میں سرسبز تھا کیوں ٹوٹ گرا ہوں

سر پھوڑ کے دیوار سے مر جائے گی آخر
گنبد میں بھٹکتی ہوئی اِک ایسی صدا ہوں

اُن چند اصولوں کو میں چھوڑوں بھی تو کیسے
جن کے لیے اِک عمر میں دنیا سے لڑا ہوں

ہر راہ پہ منزل کا گماں ہونے لگا ہے
میں زیست کے چوراہے پہ حیران کھڑا ہوں

شاید کبھی ہیرے کا گماں مجھ پہ بھی ہو فخر
پتھر ہوں اسی سوچ میں مدت سے پڑا ہوں

☆

○

فضا میں آج رات کیوں ہے درد سا رچا رچا
ستارے زرد زرد ہیں تو چاند ہے بجھا بجھا

نہ دھوپ ہے نہ چھاؤں ہے عجیب ساسماں ہے آج
اداسیوں کا زہر ہے فضاؤں میں گھلا گھلا

ملال کیا جو کر دیا ہے تو نے آ کے گل اسے
کہ مدتوں سے یوں بھی تھا چراغِ دل بجھا بجھا

گداگروں کے دیس میں ہم آ گئے ہیں دوستو
صدائیں ہونٹ ہونٹ پر، پھٹی ہوئی قبا قبا

خلش ہے کچھ عجیب سی، عجیب سا ہے درد بھی
لگا ہے آج تیر کوئی زہر میں بجھا بجھا

وصال ہو رہا ہے آج فخر کس حسین سے
جو بال ہیں بنے بنے تو پیرہن سلا سلا

☆

○

اشک بن کر غم دل پلکوں پہ آیا ہوتا
لاکھ اُسے ضبط کے پردوں میں چھپایا ہوتا

مجھ کو ہوتا نہ تری وعدہ خلافی کا گلہ
تو نے اک بار ہی وعدہ جو نبھایا ہوتا

یا خدا لوگ بنائے تھے اگر پتھر کے
میرے احساس کو شیشہ نہ بنایا ہوتا

تجھ کو منظور تھا گر ترکِ تعلق مجھ سے
اتنی تحقیر سے دامن نہ چھڑایا ہوتا

زینت دل کے لیے داغ تھے کافی پہلے
اس پہ اب داغِ محبت نہ سجایا ہوتا

☆

○

ابھی سناتا ہوں قصہ مکان گرنے کا
ذرا ہٹاؤ تو اُوپر سے ڈھیر ملبے کا

میں اپنے گھر کی سجاوٹ کے واسطے یارو
اُتار لایا ہوں اک گھونسلہ پرندے کا

گزر گیا جو دریچوں پہ دستکیں دے کر
گماں عجیب سا تھا اُس ہوا کے جھونکے کا

کھلے پڑے ہیں مرے سامنے نئے اوراق
بھلا دیا ہے سبق میں نے سارا پیچھے کا

پکارتی ہے مجھے پھر کوئی کڑی منزل
پھر آ پڑا مرے سر پر غبار رستے کا

وہ اپنے ہاتھ میں آئینہ لے کے پھرتا ہے
وہ شخص کہتے ہیں غنڈہ جسے محلّے کا

ہوا ہے ایک زمانہ لگے مجھے پھانسی
مگر نشان ہے اب تک گلے پہ پھندے کا

یہ بستیوں کا تعفن کچھ اور پھیلے گا
کہ بادلوں کا ارادہ ہے پھر برسنے کا

☆

○

لگتی تو ہے مضبوط مگر کچی بڑی ہے
یہ اونچی عمارت کہ جو ہڈیوں پہ بنی ہے

سینہ تو ہے کچلے ہوئے جذبات کا مدفن
چہرے پہ مہکتے ہوئے پھولوں کی لڑی ہے

انساں کو تو جینے کا سلیقہ نہیں آتا
اور آپ کو انسان کی عظمت کی پڑی ہے

ہیں فخر وہ منزل کے نشاں سامنے لیکن
حالات کی دیوار بھی رستے میں کھڑی ہے

☆

○

ہر سمت امر بیل میں ہم لوگ گھرے ہیں
خوش بخت ہیں جو گلشن ہستی میں کھلے ہیں

اس دُھوپ کی شدت سے نہیں کوئی مفر اب
دیوار کے سائے میں بڑے لوگ کھڑے ہیں

کس کس کو دکھاتے رہیں جیبوں کے یہ سوراخ
ہر موڑ پہ کشکول لیے لوگ کھڑے ہیں

اک روز ہمیں ہوں گے اُجالے کے پیمبر
ہم لوگ کہ مدت سے اندھیرے میں پڑے ہیں

یہ زیست کچھ ایسے ہے کہ اُلجھے ہوئے دھاگے
ٹوٹے ہوئے نکلیں جنہیں سمجھیں کہ سرے ہیں

بخیہ کوئی ہر روز اُدھڑ جاتا ہے پھر سے
ہم وقت کی سوزن سے کئی بار سلے ہیں

☆

"پنج دریاواں دامان"

صاعقہ مقبول

(اسلام آباد)

All the languages of Pakistan can achieve their rights in a democratic set-up, under a government which is committed to the poor and the down trodden. I am confident the day is not far when the oppressed people of this country will be the masters of their destiny and the mother tongue spoken by them will get its rightful place.

I wish the distinguished delegates very purposeful deliberations on the problems associated with the development of Punjabi language and culture.

I congratulate Mr. Fakhar Zaman, Chairman World Punjabi Conference for organizing this international moot.

(Mohtrama Benazir Bhutto)

بہت سے شاعروں کے برعکس فخر زمان کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ پنجابی ہی میں سوچتا ہے اور پنجابی ہی میں لکھتا ہے۔ اسی سبب اس کی شاعری توانا اور متحرک ہے۔

فیض احمد فیض

پنجابی ادب کی نئی لہر میں فخر زمان کی شاعری اور ناول نگاری ایک منفرد اور شاندار روایت کی حامل ہے۔

منیر نیازی

پاکستان اور ہندوستان میں بہت کم نظمیں فخر زمان کی نظم "کدھی سواری آرہی اے" سے مقابلہ کر سکتی ہیں۔ اس کی نظمیں ہماری منافقتوں، بناوٹوں اور کم مائیگیوں کے نقاب کو اس طریقے سے نوچ ڈالتی ہیں، جو کسی پنجابی شاعر نے اس سے قبل اختیار نہیں کیا۔

سلیم خان گمی

اس کی شاعری نے پنجابی ادبی روایت میں نئے راستوں کو کھول دیا ہے۔ وہ ان شاعروں کے ہراول دستہ میں ہے جو شاعری کو وقت کی آواز گردانتے ہیں۔

ڈاکٹر لئیق بابری

"کنسو ویلے دی" نے پنجابی شاعری میں ایک نئی جہت کا تعین کیا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ

"کنسو ویلے دی" نے پنجابی ادب میں جدید شعور کی بنیاد ڈالی ہے اور پنجابی زبان کو ایک نئی آواز دی ہے۔

یوسف کامران

"ونگار اور کنسو ویلے دی" کی نظمیں نئے تجربے، نئے مشاہدے اور نئے احساسات کی وجہ سے تاریخ کے صفحوں پر نقش چھوڑ جائیں گی۔

ڈاکٹر رشید انور

"ست گواچے لوک" پنجابی کا پہلا ناول ہے جس میں ناول نگاری کی نئی تکنیک ایمائیت اور کردار نگاری سے کام لیا گیا ہے۔

پروفیسر اختر جعفری

"پولی اینڈری"، "چلتراں والی"، "بدلہ" اور "زیرو بلب اتے"، "سمجھوتہ" جیسی نظموں کے ذریعے فخر زمان جدید زندگی کی فرسودگی کی نقاب کشی کرتا ہے۔

بشیر منذر

۱۹۷۴ء کی شاعری کی دھن میں فخر زمان کا سُر سب سے زیادہ دلپذیر ہے۔

ڈاکٹر جگتار

بودلیئر نے زندگی کا ایک خاص پہلو دیکھا اور نثری نظموں کا مجموعہ "گناہ کے پھول" تحریر کیا۔ فخر نے اس زندگی کو نثری نظموں کی شکل میں کردیا ہے۔

راحت نسیم ملک

پاکستانی پنجابی ادب میں دھماکے کرنے والوں کی فہرست میں فخر زمان کا نام سب سے اونچا ہے۔

مشتاق سنگھ

فخر زمان میں بغاوت کا شدید احساس پایا جاتا ہے۔ نئی نظم کے میدان میں وہ سب سے بڑا حقیقت پسند ہے۔

پروفیسر سرفراز حسین قاضی

فخر زمان وژن کے مختلف اظہار اور تجربات کا مجموعہ ہے۔ اس کی نظم "چڑ داسٹہ" کا تحرک اور "رکھ دا سوال" کی نامیاتی اہمیت اور اس قسم کی اور نظموں سے پنجابی شاعری میں نئے ٹرینڈ کی بنیاد پڑی ہے۔

پروفیسر اشفاق سرور

فخر زمان نقادوں کی نظر میں ایک جدید پنجابی شاعر ہے جس کا جدید لہجہ ہے، اس میں جدیدیت اور روایت کا ملاپ ملتا ہے۔ فخر زمان کے شعری مجموعے ''کنسو ویلے دی'' میں مجھے جو نظم سب سے زیادہ پسند آئی ہے وہ ہے ''ہینڈل ودھ کیتر'' ۔۔۔ نہیں تے ٹٹ بھج جائے گی۔

محمد ادریس

فخر زمان نے ناول ''ست گواچے لوک'' میں لفظوں، کرداروں، ہیئت اور موضوع کے حوالے سے نئے تجربات کیے ہیں۔

سجاد حیدر

''ست گواچے لوک'' کے سبھی کردار انسان دوستی کی قدروں کے علمبردار ہیں۔ یہ حقیقت نگاری کی شاندار مثال ہے جس میں علامت کا استعارہ ملتا ہے۔ یہ ناول غالباً پہلا جدید ناول ہے جو پنجابی میں لکھا گیا ہے۔

امین مغل

فخر زمان کی تحریریں ہمیں شیشہ دکھاتی نظر آتی ہیں۔ وہ ہمارے چہروں سے منافقت اور جھوٹی انا کا نقاب نوچ ڈالتا ہے۔

پروفیسر سجاد حیدر ملک

''ست گواچے لوک'' نے ناول نگاری کے فن کو معراج تک پہنچا دیا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ ناول محض ادب تک محدود نہیں رہے گا بلکہ دنیا بھر کے ادب کی بلندیوں پر پرواز کرے گا۔ اس ناول کی عمر اس صدی کی کسی تحریر سے کم نہیں ہوگی۔

حسین شاہد

مجھے یقین ہے کہ ''ست گواچے لوک'' مشترک پنجابی ادبی تاریخ میں ایک اعلیٰ مقام حاصل کرے گا اور ہر جگہ پنجابی اسے خوش آمدید کہیں گے۔ یہ ناول باقی تمام پنجابی ناول سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ یہ تاریخی سطح پر نہیں بلکہ اساطیری سطح پر کہانی بیان کرتا ہے۔

ڈاکٹر ہربھجن سنگھ

''ست گواچے لوک'' تجریدی فن کی عمدہ مثال ہے اس نے ادب کے بنیادی اُصولوں کو نیا انداز دیا ہے۔

ڈاکٹر عطر سنگھ

''ست گواچے لوک'' پاکستان اور ہندوستان کے پنجابی زبان کے ناول نگاروں اور تنقید نگاروں کے لیے ایک چیلنج اور ایک انسپریشن کی حیثیت رکھتا ہے۔

ڈاکٹر کرنیل سنگھ تھند

''ست گواچے لوک'' نہ صرف پنجابی ادب میں ایک اچھوتا تجربہ ہے بلکہ پہلی دفعہ ایسی ڈکشن کا استعمال ہوا ہے جو تازگی اور خوشبو سے لبریز ہے۔

منصور قیصر

''ست گواچے لوک'' فخر زمان کا ایک خوبصورت ناول ہے۔ اس ناول سے پنجابی ادب میں نئی تکنیک اور نئی ہیئت کی ابتدا ہوئی ہے۔ فخر زمان نے دوسرے نثر نگاروں کے لیے راستے کھول دیئے ہیں۔

ذوالفقار احمد تابش

''ست گواچے لوک'' کا پنجاب کی دھرتی سے گہرا تعلق ہے۔ ساری داستان پنجاب کی مکمل تاریخ کی نشاندہی کرتی ہے اور اس ضمن میں ہیر، رانجھا، مرزا صاحباں، دُلاّ بھٹی، شاہ حسین، بلھے شاہ، خواجہ کھرل اور بھگت سنگھ کا ذکر آیا ہے۔

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

فخر زمان ایک وجودی ہے۔ اس کے نزدیک زندگی بے معنی اور بے ربط ہے۔ انسان ایک زنجیر کی کڑی ہے جو وقت سے ماورا ہے۔ فخر زمان کے کردار بھی کسی غیر معلوم جرم کی پاداش میں اذیتیں اٹھا رہے ہیں۔ وہ سماج اور اس کی بناوٹی اخلاقیات پر احتجاج کرتے ہیں۔ وہ اسٹیبلشمنٹ کے مخالف ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ قوم پرستی، مذہبیت اور نسلی امتیاز کی بنا پر وہ استعمال کیے گئے۔ وہ روز مرہ کی زندگی کے تواتر سے اکتائے ہوئے ہیں۔ یہ کردار دُلاّ بھٹی اور بھگت سنگھ کے روپ میں اپنی شناخت کے متلاشی ہیں۔ ناول کی یہ دو قسمیں ایک دوسرے سے اس چابک دستی سے ہم آہنگ کرائی گئی ہیں کہ ناول نگاری کی اس قسم کی تکنیک ہمارے حال کے ادیبوں میں مفقود ہے۔

پروفیسر اشفاق سرور

مجھے اس بات کی بے انتہا خوشی ہے کہ میرے بھائی، میرے دوست اور قابل قدر ادیب، دانش ور، سابق صدر نشین اکادمی ادبیات پاکستان جناب فخر زمان کے ''فن و شخصیت'' کا احاطہ کیا جا رہا ہے۔ میں نے فخر زمان کو ہمیشہ سے متحرک اور مستعد پایا۔ میں سمجھتا ہوں کہ فنکار مزاج لوگ صرف اپنے سماجی فرائض اور سرکار و دربار کے عطا کردہ عہدوں سے بڑے نہیں ہوتے بلکہ یہ عہدوں کے لیے اعزاز ہوتا ہے کہ اُن پر ایسا معتبر اور متحرک شخص بیٹھ کر اُس منصب کا حق ادا کرتا ہے جو اپنی ذات میں مگن ایک چھوٹی اور محدود سوچ کا آدمی نہیں کر سکتا۔

دوستی اور تعلق سے بالاتر ہو کر بھی دیکھیں تو فخر زمان نے اکادمی ادبیات میں اپنے فرائض کی ادائیگی کو احسن طریقے سے نبھایا ہے۔ ترقی پسند سوچ اور قومی زبانوں سے محبت کا حق ادا کیا ہے۔ عالمی ادب کے بہت ہی معیاری تراجم اور انتخاب کرائے ہیں۔ برانچ آفسز کو یتیمی اور محرومی کے احساس سے نکالا ہے۔ میری دعا ہے کہ فخر زمان صاحب سدا جئیں، سدا خوش رہیں۔ میں بلوچستان کا ایک دکھ سہنے والا دعا ہی دے سکتا ہوں۔

پروفیسر عبداللہ جان جمالدینی

محترم فخر زمان صاحب ہمارے ادبی اور ثقافتی حلقوں میں با اثر صاحب مطالعہ اور باذوق تخلیق کار کے طور پر متعارف ہے۔ میں اس کا حق سمجھتا ہوں کہ اس کے علم و فن کے بارے میں کچھ لکھوں مگر افسوس ہے کہ لکھنا تو درکنار

میں قلم تک نہیں اٹھا سکتا۔ یہ چند الفاظ بھی اپنی ایک عزیزہ سے لکھوا رہا ہوں، زیر نظر کتاب کے بارے میں کچھ نہیں لکھ سکتا البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ ترقی پسند ثقافتی حلقوں کا وہ ایک روشن ستارہ ہے۔

فخر زمان نے ماضی میں اپنے طور پر ان اداروں، انجمنوں اور محفلوں کے ذریعے ملک وقوم کے ادبی ذوق کی بہت خدمت کی ہے۔ اسے اب بھی یہ فریضہ ادا کرتے رہنا ہوگا۔ خصوصاً آج ملک جن تشویش ناک بحرانوں میں گھرا ہوا ہے اس کو حل کرنے کے لیے صحت مند بنیادیں مہیا کرنے کی ضرورت ہے۔ فخر زمان یہ بنیادیں فراہم کرسکتا ہے۔ امید ہے کہ وہ ان بنیادوں کو قائم کرنے کے لیے کام کرتا رہے گا، میری دعائیں اس کے ساتھ ہیں۔

اجمل خٹک

میرے لیے یہ امر واقعی حیرت کا باعث ہے کہ کوئی بھی لکھنے والا اتنے وسیع پیمانے پر عملی کام کیسے کرسکتا ہے جیسا کہ فخر زمان تسلسل کے ساتھ کررہا ہے۔ وہ محض قلم کی طاقت پر ہی بھروسہ نہیں کرتا بلکہ ملک کی سیاسی زندگی میں بھی عملی طور پر برابر شریک رہا ہے۔ پیپلز پارٹی پنجاب کے سربراہ کی حیثیت میں اس نے حیرت انگیز تنظیمی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا، میرے سامنے ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ کوئی لکھنے والا عملی سیاست میں آیا یا روزانہ صحافت سے منسلک ہوا تو اس کے لکھنے کی رفتار مدھم پڑ گئی مگر فخر زمان ایسا لکھنے والا ہے جو غیر ادبی اور سیاسی اور سماجی سرگرمیوں میں پوری طرح سرگرم رہنے کے زمانے میں بھی اپنے اصل کام یعنی ادب تخلیق کرنے کے عمل سے کبھی غافل نہیں ہوا۔ گذشتہ صدی کے اواخر میں پیپلز پارٹی کی حکومت کے زمانے میں جب وہ پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز اور نیشنل کمیشن آف ہسٹری اور کلچر کے چیئرمین کے عہدے پر فائز ہوا تو اس نے ان ادارے خاص طور سے اکادمی ادبیات کو جو روایتی سرکاری اداروں کے طور پر سست روی کا شکار تھا انتہائی متحرک اداروں کی شکل دے دی، اکادمی کے سربراہ کی حیثیت میں اس نے اتنا کام کیا جتنا اس سے پہلے کے بیس پچیس برسوں میں بھی شاید نہیں ہوا تھا۔ پاکستان کی ثقافتی پالیسی مرتب کرنے کا اعزاز بھی اسے حاصل ہے۔ بدقسمتی سے اس پالیسی پر موثر عملدرآمد کی نوبت آنے سے پہلے پی پی پی کی حکومت ختم ہوگئی اور اس کی سفارشات پر مشتمل یہ رپورٹ کسی سرکاری دفتر کے ریکارڈ آفس میں پڑی رہ گئی۔

حمید اختر

میری شخصیت تین حصوں میں بٹی ہوئی ہے یعنی انگریزی میں سوچتا، اردو میں لکھتا اور پنجابی بولتا ہوں۔ فخر زمان کی شخصیت کے ان گنت روپ اور ان گنت انداز ہونے کے باوجود صرف ایک تاثر نمایاں ہے محبت۔ اپنی دھرتی، اپنے لوگ اور ماں بولی سے محبت جس کے لیے فخر نتیجے کی پرواہ کیے بغیر کوئی بھی قربانی دے سکتا ہے۔

ممتاز مفتی

فخر زمان کا شمار پنجابی کے صف اول کے جدید شاعروں، ناول نگاروں، ترقی پسند دانشوروں اور کامیاب سیاست دانوں میں ہوتا ہے اور اپنے نظریات کو عملی جامہ پہنانے کی جدوجہد کے حوالے سے شعر و ادب کی دنیا میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ ان کے بہت سے پنجابی ناول اردو اور پنجابی شعری مجموعے، ڈرامے اور سفرنامے شائع ہوچکے ہیں جن میں شعری مجموعے کنسو ویلے دی ''ونگار'' راستے کی دھول اور زہراب ناولوں میں ست گواچے لوک، اک مرے بندے دی کہانی، بندی وان، کم ذات اور بے وطنا بہت مقبول ہوئے۔ ان کے ناول گورمکھی رسم الخط میں بھی شائع ہوچکے ہیں اور بھارت کی پنجابی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہیں۔ خصوصاً ان کا معروف ترین ناول ''بندی وان'' اردو، ہندی، بنگالی، انگریزی اور بعض دوسری زبانوں میں بھی شائع ہوکر عالمگیر شہرت حاصل کرچکا ہے۔ انہیں ادبی تحریروں پر بہت سے ملکی اور غیر ملکی ادبی انعامات اور اعزازات مل چکے ہیں اور ورلڈ پنجابی کانگریس کے چیئرمین کی حیثیت سے پاکستان اور بھارت میں دشمنی، نفرت اور تناؤ کم کرنے اور دوستی، امن اور بھائی چارے کی فضا قائم کرنے میں انہیں فقید المثال کامیابی حاصل ہوئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ دور میں دونوں پڑوسی ممالک میں اختلافی امور اور تنازعات کو جنگ کی بجائے مذاکرات سے حل کرنے کا جو سلسلہ جاری ہے اس کے پیچھے فخر زمان کی مساعی کا بہت عمل دخل ہے۔

منشا یاد

The English translations of Fakhar Zaman's five celebrated Punjabi novels (sat Gwachey lok, Ik Maray Bandey Di kahani, Bandiwan, Bewatna, Kamzat) have recently been published in one volume in India.

His novels make a strong social and political statement which has taken the Punjabi novel to new heights of social and philosophical concern. The writing is characterized by an irreducible plurality of meaning which is the result of the narratives' associations, contiguities, allusions and inter-texuality. The narrative often moves diachronically is a stream casein vers backward and forward, rejecting the tendency of both modernism and post modernism to homogenous historical time.

Dr. Fatima Hussain

''نورِ وحدت''

نعت رسولِ مقبول ﷺ

اُجالا نورِ وحدت کا پڑھا دو یا رسول اللہ ﷺ
یہ تاریکی میرے دل سے مٹا دو یا رسول اللہ ﷺ

میرے اجڑے ہوئے دل کو خدا کے واسطے جلدی
بسا دو یا رسول اللہ ﷺ بسا دو یا رسول اللہ ﷺ

یہ سیم و زر نظروں میں میری سب ہیچ ہو جائیں
مجھے وہ گنجِ عرفاں تم دِکھا دو یا رسول اللہ ﷺ

مسافر ہوں میں گم گشتہ کوئی رہبر نہیں ملتا
مجھے تم راہ وحدت کی دکھا دو یا رسول اللہ ﷺ

ترستا ہے درِ اقدس پر حاضر ہونے کو مضطؔر
بلاتے کیوں نہیں اس کو بتا دو یا رسول اللہ ﷺ

سید محمد علی مضطر زیدی

(●)

نعت

یہ ہے تیرا کرم تو نے نویدِ زندگی دی ہے
اندھیروں میں بھٹکتا تھا بشر کو روشنی دی ہے

خزاں کا راج تھا ہر سو یہاں گلزار ہستی میں
بہاریں لے کے آیا تُو گلوں کو تازگی دی ہے

ملی حوروں بھری جنّت سبھی ایماں والوں کو
جو ہیں عاشق ترے اُن کو مدینے کی گلی دی ہے

ستی ہوئی تھی ہر ناری پتی کے غم میں بیچاری
ترے مذہب نے بیوہ کو نئی اک زندگی دی ہے

بہت ہی خوب تھی قسمت یقیناً فرش والوں کی
کہ تجھ کو عرش والے نے جہاں کی سروری دی ہے

جہالت کا وہ تھا موسم پڑھے لکھے بہت ہی کم
اُٹھایا علم کا پرچم شعورو آ گہی دی ہے

ترا جلوہ تری خوشبو ترا چہرہ ترے گیسو
خوشا! صدرشکِ یوسف تو خدا نے دلبری دی ہے

سجاؤں کائنات اے دل کہ لکھوں میں بھی نعت اے دل
خدا ہے مہرباں تشنؔہ کہ مجھکو شاعری دی ہے

تشنہ بریلوی (کراچی)

صبح کے قریب

ناصر بغدادی

(کراچی)

اور پھر کتنے ہی ایسے لمحے تھے جو انار کے درخت کی گہری ہری پتّیوں کے درمیان لگے ہوئے بے حد سرخ پھولوں سے اپنا دامن جھلساتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ وہ اس اجنبی کو نہ بھلا سکی، وہی وجیہہ شخصیت، سنورے سلجھے بال جن کی روغنی سطح پر نور کی دھاری سی تھی۔ اور پھر وہ بے حد کالی آنکھیں۔۔۔لوگ کس قدر آسانی سے آ کر دل کی پرسکون جھیل پر پتھراؤ کرتے ہیں، یوں ابھی لمحہ پورا بھی نہ گزرا تھا کہ برسوں کا مندمل شدہ زخم تازہ ہو کر پھر مہک اٹھا، برسوں کی ہم آہنگی سے گزرتی ہوئی زندگی ایک دھچکے کے ساتھ طوفان کی آغوش میں پسر گئی۔ وہ اجنبی گڑیا لڑکی! وہ تو سمجھی تھی داستان تکمیل کے سارے مراحل طے کر چکی ہے، اسے کیا پتہ تھا ایک دردناک انداز سے آج پھر اس داستان کی ابتداء ہو گی۔ تاریخ نے پھر اپنے آپ کو دہرایا۔۔۔تلخ حقائق کے بے حد طویل حصار سے وہ بھاگ آئی تھی، مگر قیاس غلط تھا، افق کی سرحدیں ہر بڑھتے ہوئے قدم کے ساتھ دراز ہوتی ہی چلی جاتی ہیں۔ سارے من پسند پھول جھلس کر رہ گئے، زندگی کے طربیہ صحیفے سے بے حد رومانی باب کے اوراق کسی نے پھاڑ دیے تھے۔

یوں لگا جیسے بڑے زور کا دھماکہ ہوا ہو۔ جیسے آسمانی روئی کی طرح دھنک دیا گیا ہو، اور بے حد چمکیلے ستاروں کی گرد ہر طرف پھیل گئی ہو اور وہ اپنی دنیا میں لوٹ آئی۔ خیالات پھلجھڑی کی طرح بکھر گئے۔ اس نے یوں ہی کار کے شیشے سے باہر دیکھا۔ کوئی اہم بات نہ تھی۔ سگنل کے قریب پہنچتے پہنچتے سرخ روشنی اُبل پڑی تھی، یوں ہی یہ سرخ روشنیاں دل کی دنیا میں پھیل کر سبز روشنیوں کو بارہا نگل لیتی ہیں۔ اس نے یوں ہی ایک طویل سانس لی۔ برابر اسٹیرنگ پر جھکے اس شخص کو دیکھتی رہی جو اسے مسلسل گھورر ہا تھا۔۔۔جیسے ہو اس لڑکی کو جانتا ہے، اس کے وجود کو خوب سمجھ چکا ہے۔ مگر یہ وہ تو نہیں۔ وہ تو بے حد پیاری ننھی منّی معصوم سی بچی ہے جس کی آنکھوں میں لڑکپن کی شرارت سے کوئی نتھری نتھری چمک ہر وقت چم چم کرتی رہتی ہے۔ لیکن یہ کیا! اب تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی بہار کی اُجلی اُجلی اُداسی تھی جو اس کی بجھی بجھی آنکھوں میں بھری تھی۔ ''یہ آدمی اُف میں اُسے کس قدر چاہتی ہوں''۔ آگے وہ کچھ نہ سوچ سکی۔ یہ اس کی پریشانی سے کس قدر بے چین ہو گیا تھا۔

شام کا نڈھال سورج کب کا غروب ہو چکا تھا اور اب تو ہر ہر شئے پر دونوں وقت ملنے کی نیلاہٹ پھیل چکی تھی، کار جھٹپٹے کے کاسنی رنگ میں رنگی سڑک پر پھسلتی رہی، پھسلتی ہی رہی۔ اس نے ایک بار پھر محبت کی تمام نرمی لیے اس شخص کو دیکھا جو آڑے ترچھے راستوں سے اسے منزل کی طرف لئے جا رہا تھا۔ اس نے بھی تو یہی سوچا تھا، کاش یہ مرد جس کے بازوؤں میں زمانے کے دُکھ درد نارسا ہی رہ جاتے ہیں ہمیشہ اسے زندگی کے بے حد الجھے راستوں سے منزل کی طرف لے جائے۔ لیکن۔۔۔وہ دو بے حد خوفناک آنکھیں، اجنبی کی آنکھیں، اسے یوں لگا اب اس کی کشتی کے کھیون ہار کا دل تیز و تند جذبات کا آتش کدہ بن چکا ہو گا اور شبہات کے تیر اسے انتقام پر اکسائیں گے۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' اس نے اتنی محبت، اتنی نرمی اور تقدس سے کہا جیسے وہ دودھ اور شہد سے بنی ہوئی کوئی بے حد نازک گڑیا ہو جو معمولی سی کرختگی سے بھی تحلیل ہو جائے گی، ایک یہ لہجہ تھا، اور دوسرا اس بارعب شخصیت کا جسے سنتے ہی وہ دہل کر رہ گئی تھی۔

خیالات نے پھر اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔

''کن خیالوں میں کھو گئی ہو تم'' اس نے بڑی نرمی سے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے پوچھا۔ مگر وہ کہاں تھی۔۔۔؟ اسے کچھ ہوش نہ تھا۔ خیالات ہی اس کا سارا سرمایہ تھے، بس اسے اتنا معلوم تھا، اس نے کچھ کہا ضرور ہے۔ کہا کیا ہے؟ یہ معلوم نہیں۔ اب وہ اجنبی کسی دن گھر آئے گا، پھر ڈرائنگ روم کے سارے دروازے بند ہو جائیں گے اور وہ دروازے کے پیچھے دھڑکتے دل کے ساتھ سب کچھ سُن رہی ہو گی۔ بے حد مدّھم سرگوشیوں میں راز ایک سینے سے دوسرے انسان کے سینے میں منتقل ہو جائے گا اور پھر اس کی زندگی۔۔۔؟ یا یوں نہیں تو پھر ایک شام جب سورج ابھی ابھی ڈوبا ہو گا۔ سرسراتے خوشبودار لمحے ایک دوسرے کے تعاقب میں سرگرداں ہوں گے تو ٹیلی فون کی گھنٹی بڑے زور سے بج اٹھے گی، پھر بجتی ہی چلی جائے گی اور پھر یہ شخص جو اس کے نزدیک بیٹھا ہے۔ بڑھ کر ریسیور اٹھائے گا اور پھر۔۔۔زندگی کے سارے راز، اثاثے، سب کچھ مٹ جائے گا۔

''کیوں گڑیا رانی، بہت پریشان ہو؟'' اسے یوں لگا جیسے اس نرم لہجے میں استہزا کے بہت سارے تیر ہوں اور ہدف اس کا دل۔ تو اس نے یک بیک چونک کر کہا تھا۔ ''نہیں۔۔۔میں ٹھیک ہوں ہاں بالکل ٹھیک'' اور وہ صرف مسکرا کر رہ گیا جیسے اس سب کچھ معلوم تھا کہ اسے صرف اس لمحہ یہی کہنا چاہیے۔

کار آہنی پھاٹک سے ہوتی، سرخ بجری کی سڑک کو کچلتی برساتی میں جا پہنچی۔ اب کیا ہو گا؟ اس کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا اور خیالات کا حصار بہت پیچیدہ ہو چکا تھا۔ یہاں تک کہ اُس نے اُتر کر دھیمے سے اس کی طرف والا

دروازہ کھولا۔اب اتر آؤ۔تم کہاں کھوگئی ہو؟'' تو اسے ہوش آیا گھر آ گیا ہے۔ گھر۔۔۔؟نہیں نہیں۔۔۔اب میں اس گھر میں کیسے رہ سکتی ہوں۔میں نے اس کے مالک کو فریب دیا ہے اسے اپنی زندگی کی بابت قطعی لاعلمی میں رکھا ہے۔اس گھر پر میرا کیا اختیار؟ مگر وہ اس کا بے حد نازک سا ہاتھ تھام چکا تھا ''گھر آ گیا ہے، چلو اندر چلیں''۔

تو چٹکیوں میں ساری کائنات بدل جائے گی، توبہ۔۔۔ابھی کتنے گھنٹے ہوئے ہیں جب ہم اس گھر سے شاداں وفرحاں نکلے تھے۔پھر اس نے نہایت بے دلی سے کپڑے بدلے اور بستر پر کسی ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح گر گئی۔ اس کے دل میں لاوا کھول رہا تھا۔اس کا جی چاہا اتنی بہت ساری الجھنوں کے حصار سے نکل کر کہیں دور کسی پُرسکون ٹیلے پر جا کھڑی ہو مگر الجھنوں کا حصار بہت طویل تھا۔میرے خدا! میں کیا کروں؟ اس شخص نے جو میری روح میرے جسم کا مالک ہے۔شائد سب کچھ جان لیا ہے اور اب۔۔۔؟ ایک دکھیا لڑکی جو بچپن میں متعفن فضا میں پلی بڑھی تھی، باپ ''گمنام'' اور ماں کا رات رات بھر محفلِ طرب سجانا۔۔۔اجنبی اجنبی۔۔۔کتنے بہت سے لوگ۔۔۔جیسے آدم کی ساری نسل تنہا ایک عورت کے تعاقب میں نکل پڑی ہو۔

اور اب اس شخص نے سب کچھ جان لیا ہے شاید اس اجنبی نے اسے ہر راز سے آگاہ کر دیا ہے۔اُف میرے خدا! تب ایسے ہی گراں لمحوں میں وہ اس کے بستر پر آ بیٹھا تھا ''کیوں تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ ڈاکٹر کو رنگ کر دوں'' اس نے نے اس ملائمت سے کہا تھا جو اس کی خصلت تھی لیکن وہ پریشانی میں اس درجہ بہک گئی تھی کہ ان الفاظ سے اسے استہزا کی بو آئی ''نہیں نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔آپ آرام کیجیے میں صبح تک ٹھیک ہو جاؤں گی'' اور بھلا ڈاکٹر اس کے درد کا کیا علاج کر سکتا ہے۔کیمیائی ادویات دل کے گھاؤ مندمل کر دینے پر قادر نہیں۔۔۔اور پھر بہت سارے لمحات بیت گئے۔رات کچھ اور بھیگ گئی۔کمرے میں ہلکی نیلی روشنی تھی۔معاً اپنے خیالات سے چونک کر اس نے دیکھا کہ وہ پائینتی سے لگا بیٹھا تھا ''ٹک ٹک'' سے لبریز بلوریں الماری پر ٹائم پیس کا ریڈیم ڈائل نیم شب کا اعلان کر رہا تھا۔۔۔تو وہ بڑے زور سے چونکی۔جیسے کسی نے دل کی دنیا تباہ کر کے رکھ دی ہو یہ شخص۔۔۔آخر کب تک میرے لیے پریشان رہے گا۔پھر اس نے بڑی لجاجت سے درخواست کی کہ ''آپ جا کر سو جایئے'' وہ بڑے بوجھل دل سے اٹھا اور برابر کے پلنگ پر جا پڑا۔

خیالات کا یہ حصار۔۔۔ساری رات وہ جنگ میں زخمی ہونے والے سپاہی کی طرح بے چینی سے پہلو بدلتی رہی۔کائنات پر اداسی پھیلنے لگی۔ باہر سرما کی ساری ٹھنڈک شاہِ بلوط کے سائے میں ہلکورے لے رہی تھی، خاموشی۔۔۔اتھاہ سناٹا۔۔۔اس نے آنکھیں بند کر لیں۔۔۔گھمبیر خاموشی میں ماضی کے ڈولتے ہوئے لمحے۔۔۔ان لمحوں میں اس نے ماضی کو چپکے چپکے جمع کرنا شروع کر دیا۔اس قدر راز داری سے کہ کہیں برابر میں سوئے انسان کو ان کی خبر نہ ہو جائے۔

اس شام وہ کس قدر خوش تھی، دعوت میں جانے سے پہلے اس نے کتنی ہی بار آئینہ میں اپنے سراپے کا جائزہ لیا تھا اور اس کے جھومر کا درخشاں ستارہ اس شخص نے کسی قدر ملائمت سے بار ہا اپنے ہاتھ سے چھوا تھا۔اپنے پیار بھرے ہاتھ سے! مسرّت اس کے جسم کے ہر حصے سے کھیل رہی تھی، جیسے دنیا میں ساری فرحت اور انبساط، سب کی تنہا وہی مالک تھی۔

پھر وہ دعوت میں پہنچے تھے، جہاں کتنے بہت لوگ تھے۔جانے پہچانے، بیگانے، نوجوان، خوب صورت، شادی شدہ جوڑے جن سے شناسائی تھی، اُن سے گھل مِل کر گفتگو ہو رہی تھی۔جو بیگانے تھے ان سے محض تعارف ''سب کی نظریں ہم دونوں پر ہی تھیں''۔اور جب وہ تھک گئی تو اس شخص کے ساتھ جو اس کا اپنا تھا، ایک دور دراز صوفے پر جا بیٹھی۔تھکن سے وہ نڈھال ہو چلی تھی۔دونوں نے ایک دوسرے کو بڑی محبت سے دیکھا پھر ہولے سے مسکرا دیے۔''دیکھا تم نے! یہ سب ہماری محبت کے امین ہیں''

مگر بڑی بے تکلفی سے کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔وہ چونکی۔اس کے سامنے بیش قیمت سوٹ میں ملبوس وہی اجنبی کھڑا تھا جس نے اس کے دل کی دنیا تہہ وبالا کی تھی۔ادھیڑ عمر کا ایک اجنبی باادب، باوقار مگر کس قدر سفّاک!

''فرمایئے۔۔۔؟'' مخاطب کرنے کا یہ طریقہ اسے بے حد ناگوار گزرا تھا۔آخر میرے نزدیک بیٹھا میرا مالک کیا سوچ رہا ہوگا۔یہ اجنبی کون ہے جو مجھ سے اتنا بے تکلف بننے کی کوشش کر رہا ہے، وہ بے تکلفی سے اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

''معاف کیجیے گا، کیا آپ ہی راحلہ ہیں؟'' اس نے یوں کہا جیسے آپ راحلہ ضرور ہیں مگر یہ کون تھا؟ میں نے تو اسے کبھی نہیں دیکھا اس نے نہایت احتیاط سے گھٹی گھٹی آواز میں کہا تھا ''جی مگر؟''

''اوہ۔شائد آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ہاں مگر آپ پہچانتیں بھی کیسے۔ان دنوں آپ بہت چھوٹی سی ہوں گی''

''بہت چھوٹی! وہ ٹھٹر گئی، سکتہ میں آ گئی۔اس نے اجنبی کی طرف دیکھا جو اسے کچھ ایسی بھوکی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے اس کی ساری زندگی کا رس، امرت چوس لے گا وہ کانپ کر صوفے پر بیٹھے ہوئے شخص کے اور نزدیک آ گئی۔

آپ کی والدہ۔۔۔خیر ہٹایئے ''یہ آپ کے شوہر ہیں نا؟ آپ تو اپنی والدہ کا ہو بہو عکس ہیں''۔اس کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی وہ پتلون کی جیب میں ایک ہاتھ اُڑسے، دوسرے میں یخ مشروب کا لہریئے دار جگ لئے بڑی عجیب نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔جیسے سوچ رہا ہو، سمجھ رہا ہو، پہچان رہا ہو۔۔۔پھر وہ دھیمے سے یوں مسکرایا جیسے اس کی ساری شخصیت اپنے تمام اسرار کا

لبادہ اتار کر کھال اُترے چوزے کی طرح بالکل ننگی ہو کر رہ گئی ہو۔ وہ یک لخت ان تیز بھالے کی طرح چھیدتی ہوئی نظروں سے ہراساں ہو گئی اور اس طرح اپنے سارے بدن پر عجیب اضطراری انداز میں ہاتھ پھیرا جیسے وہ اس اجنبی کے سامنے عریاں ہونے سے کترا رہی ہو۔ وہ گم صم ٹکٹکی باندھے اسے دیکھا کی ''لہریئے، سرمئی، ہلکے، کتھئی اور پھر بے شمار رنگوں کے لہریئے اس کے چاروں طرف پھیل گئے۔ لاشعور میں دھواں اٹھنے لگا۔ وہ اسے جانتی ہے پہچانتی ہے۔۔۔مگر اسے میں نے کہاں دیکھا ہے؟

دھواں، دبیز، اتھاہ دھواں، رنگین لہریئے، موجیں، دھاریں۔ یہ نوکیلی باریک کتری ہوئی مونچھیں، سنورے سلجھے بال۔۔۔سخت بے رحم مسکراہٹ! کہاں دیکھا ہے اسے میں نے۔۔۔کہاں دیکھا ہے؟ جانے پہچانے پیکر آپس میں الجھنے لگے۔ اوہ۔۔۔ ہاں تو یہ وہ ہے اسے بمشکل اعتبار آیا۔ وہ چیخ دیتی۔ حقیقت اس قدر تلخ بھی ہوتی ہے۔

دو جسم۔۔۔ہلکی ہلکی آنچ، اماں اور اجنبی۔۔۔کتنے ہی اجنبی مگر اس نے اسرار آمیز چیخ کو گھٹ جانے دیا۔ تو یہ یہاں کیوں چلا آیا ہے۔ بہت سی بھولی ہوئی باتیں، گزرے بیتے حادثے۔۔۔اُس کا شعور یک بیک تیز ہو رگیا۔ اماں اور اجنبی، منسلک جسم! عنابی پردہ اور ایک ہراساں ننھی بچی۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ مگر اب وہ جان چکی تھی، وہ سب کیا تھا۔ عنابی پردے کے عقب میں سب کیا ہو رہا ہے؟ یہی سب تو بارہا اس کے ساتھ بھی ہوا تھا۔ مگر کتنے تقدس سے محبت سے، خلوص سے اور اس شخصیت کے حضور جسے اس سے بے پناہ محبت تھی۔ اس میں گلی کوچوں، کوٹھوں والی بے حیائی نہ تھی، پیشہ نہ تھا۔ صرف تقاضوں کی بات تھی جنہیں بے پناہ تقدیس سے پورا کیا گیا تھا، صرف ایک مرد تنہا ایک عورت۔۔۔ اماں۔۔۔اور کتنے ہی اجنبی، ایک عورت کتنے مرد، فرق صرف یہی تھا۔

تب اس نے پھر اجنبی کی طرف دیکھا۔ وہ اب اجنبی کہاں رہا تھا؟ اس نے بھی جب اس کی خوفزدہ آنکھوں کا بدلا ہوا طور دیکھا تو سب کچھ سمجھ گیا۔ ان جھیل جیسی اتھاہ آنکھوں میں اب اجنبیت نہ تھی، وہ یوں مسکرایا، وہ یوں ہراساں ہوئی جیسے وہ دونوں ایک دوسرے کو بخوبی پہچان چکے تھے! اور اس کی روح اور جسم کا مالک یونہی چپ چاپ نظروں اجنبیت سے شناخت تک کے اس عمل کو دیکھا کیا۔ تب اس کی آنکھوں میں تاریکیاں پھیلنے لگیں۔ اس کا محبوب! چپ چاپ اس بھولی بھالی دکھیا لڑکی کے چہرے پر تیزی سے آنے جانے والے رنگوں کو دیکھتا رہا۔ اس نے ایک لفظ بھی نہ کہا، جیسے اسے معلوم تھا۔ اس نے اگر ایسا کر دیا تو اس کے دل کی دنیا جو تہہ و بالا ہونے کے قریب ہے واقعی تباہ ہو جائے گی۔ پھر وہ اٹھا، نہایت اعتماد سے اس کا ہاتھ تھاما اور اجنبی کو حیران چھوڑ کر اسے لے کر نکل گیا۔ وہ جاتے جاتے اُسے کن آنکھیوں سے دیکھتی رہی۔ اجنبی کی آنکھیں ان دونوں کا تعاقب کرتی رہیں۔ پھر جب، اس کی آنکھوں سے شعلے برسنے لگے تو اس نے ایک ہی سانس میں سارا مشروب حلق میں انڈیل لیا۔

یکا یک ماضی کی کتاب کے سارے اوراق ختم ہو گئے تو اس نے چونک کر برابر سوئے ہوئے انسان کو بڑے پیار سے دیکھا مگر وہ سو کہاں رہا تھا؟ اس کی ساری کیفیات کا جائزہ لے رہا تھا اور اپنی طرف اسے متوجہ پا کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔

عفونت میں پڑے ہوئے گلاب کے پھول کو نہایت تقدّس سے اٹھا کر سینے سے لگانے والے اس شخص کو اس نے اس کی محبت کا کیا صلہ دیا تھا۔ اُف توبہ، مرے خدا! کاش میں نے اسے پہلے ہی سب کچھ بتا دیا ہوتا۔ میں تمہارے لائق نہیں، تم تو دیوتا ہو اور میں ایک ادنیٰ داسی! مجھے تو تمہارے چرنوں کی مٹی اُٹھانے کا بھی حق نہیں! کاش میں نے اسے پہلے ہی سب کچھ بتا دیا ہوتا، پھر کسی دن آپ ہی آپ جب وہ اس راز کو جان لے گا تو۔۔۔؟ وہ اجنبی، اس کی آنکھوں کی بے رحمی میری دنیا تباہ کرنے کے درپے ہے! اُف توبہ! وہ اسے سب کچھ بتا دے گا، یکا یک اسے سینے میں بڑے زور کی جلن محسوس ہوئی۔ آج کی رات بھی کتنی طویل ہے۔ کیا صبح کبھی نہیں ہو گی، تب اس نے اٹھ کر پاس ہی محوِ خواب چہرے پر محبت میں ڈوبی ایک نظر ڈالی اور سرد رات میں ننگے پیر ہی باہر نکل گئی۔ وہ یک لخت اٹھا اور دروازے تک آیا۔ ''بیچاری دکھیا لڑکی'' پھر جب اسے اطمینان ہو گیا کہ وہ پائیں باغ میں ٹھنڈی اوس پر چہل قدمی کر رہی ہے اور کسی خطرناک ارادے سے باہر نہیں نکلی تو وہ بھی بستر پر آ کر گر پڑا۔ ''بیچاری دکھیا لڑکی!''

''نہیں نہیں، میں صبح ہوتے ہی اسے سب کچھ بتا دوں گی، میں اب اسے اور دھوکہ نہیں دے سکتی، میں اس سے سب کچھ کہہ دوں گی اور پھر چپ چاپ، ہمیشہ کے لیے اسے اور اس کے گھر کو چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔ میں اس کی بے لوث محبت کا مذاق نہیں اُڑاؤں گی۔''

لیکن اس فیصلہ پر بھی اس کی بے تابی کم نہ ہوئی، وہ اندر لوٹ آئی لیکن بڑے زور کا چکّر آیا اور وہی دھڑم سے فرش پر ڈھیر ہو گئی۔

''کون؟'' وہ پھر اٹھا۔ ''ارے تم'' اس نے فوراً اسے سنبھالا۔

''کیا بات ہے؟ تم شام ہی سے بہت پریشان ہو۔''

اس نے آنسو بھری آنکھوں کو گردش دی ''تم مجھے۔۔۔ ابھی تک۔۔۔'' میں نے تو کس بُری طرح آپ کی محبت کا مذاق اُڑایا ہے۔ میں بہت بُری ہوں۔ سچ بہت بُری۔۔۔ میری ماں ایک۔۔۔'' پھر اس کی قوتِ گویائی جاتی رہی۔ آنسو بے اختیار چھلک پڑے۔ اس نے بڑے غور سے اسے دیکھا۔ آگے بڑھ کر اسے سنبھالا۔ ڈبڈبائی آنکھوں سے پشیمانی کے موتی اپنی شب خوابی کے ملبوس میں اک شان کریمی سے جذب کئے اور پھر کھلکھلا کر ہنس دیا۔ ''پگلی لڑکی صرف اتنی سی بات، ناحق پریشان ہو یہ تو میں بہت پہلے سے جانتا تھا اور شائد یہ تمہیں معلوم نہیں کہ تمہیں اپنانے کا محرک تمہارا ماضی ہی تھا۔ بس چلو اب سو رہو، صبح ہم زندگی کی از سرِ نو ابتداء کریں گے''۔

ذوقِ اسیری

سید سعید نقوی

(نیویارک)

جب پہلی بار اس پر میری نظر پڑی تو وہ صوفے پر بیٹھا بہت تحمل سے کسی کی بات سن رہا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ وہ متوجہ تو ہے لیکن سن نہیں رہا۔ یقیناً آپ کو بھی نہ کبھی اس بات کا تجربہ ضرور ہوا ہوگا۔ وہ کچھ ایسا ترچھا بیٹھا تھا کہ اس کی شکل بھی پوری طرح نظر نہیں آئی لیکن اس ادھورے رخ میں بھی وہ اتنا پرکشش لگا اور کچھ ایسی اپنائیت محسوس ہوئی کہ میں آہستہ آہستہ کھسکتا ہوا اس کی جانب بڑھنے لگا۔ اس افطار میں کوئی پچیس کے قریب لوگ موجود تھے۔ میں کھانے کے کمرے میں ایک ہاتھ میں شربت کا گلاس اور دوسرے ہاتھ میں کھانے کی پلیٹ تھامے کھڑا تھا۔ روزہ افطار کرنے سے سوکھے حلق تر کیا ہوئے گرمئی بازار بڑھ گئی، باہمی بیزاری یگانگت میں بدل گئی۔ بھوک انسان کے جذبات اور تعلقات کی نوعیت متعین کرتی ہے۔ اب ہر شخص محوِ گفتگو نظر آ رہا تھا۔

میں بڑھتے بڑھتے صوفے کے نزدیک پہنچا تو وہ سننا ختم کر کے اب بہت سنجیدگی لیکن شائستگی سے تین چار لوگوں کی توجہ حاصل کئے بول رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ موضوعِ گفتگو سچائی ہے؛

’اہم بات یہ ہے کہ آپ اپنے آپ سے سچے ہوں‘ اتنی بڑی سچائی وہ کتنی آسانی اور روانی سے بیان کر رہا تھا شاید اسی لئے لوگوں کی توجہ قائم تھی۔ ’آپ کے افعال کو مختلف لوگ مختلف معنیٰ دے سکتے ہیں لیکن یہ فعل کس نیت سے کیا گیا ہے یہ تو صرف فاعل ہی بتا سکتا ہے۔ اگر انسان اپنے آپ سے سچا ہے تو اسے اپنی نیت، فعل اور اس کے نتیجے کا شعوری یا لاشعوری ادراک ضرور ہوگا‘۔ گفتگو بہت خشک مگر دلچسپ تھی، میں وہیں جگہ بنا کر بیٹھ گیا۔ وہ میرا ہم عمر تھا۔ جسم فربہی کی طرف مائل، گندمی رنگت ناک پر عینک دھری تھی۔ شاید یہ اپنی ذات سے مشابہت تھی کہ وہ مجھے اتنا پرکشش لگا۔ یہ شاید خود پرستی کی سب سے نچلی سطح ہے۔

’آدمی اپنے آپ سے سچا ہو بھی، لیکن بیرونی عوامل تو اس کے ہاتھ میں نہیں ہوتے، لہٰذا نتیجے کا ادراک اسے کیسے ہو سکتا ہے؟‘ میں نے اعتراض کیا اس نے مجھے بغور دیکھا، آنکھوں میں دلچسپی ابھر آئی۔

’آپ درست کہہ رہے ہیں لیکن یہ ردِعمل متوقع ردِعمل سے مختلف ہوگا، لیکن متوقع اور اصل دونوں ردِعمل کا ادراک تو ضرور ہوگا، مجھے اپنی بات کی پہلے ہی وضاحت کر دینی چاہئے تھی، میرا مطلب متوقع ردِعمل سے تھا‘۔

ہم لوگ مزید تقریباً ایک گھنٹا گفتگو کرتے رہے، ادھر اُدھر کی بے ضرر سی گفتگو جس کا بظاہر کوئی معنیٰ و متن نہیں ہوتا لیکن حقیقتاً اس بے معنی گفتگو کے دوران کہیں مستقبل کے تعلقات کا زاویہ قائم ہو جاتا ہے۔ میرے ذہن کے کسی گوشے نے یہ بات قبول کر لی تھی کہ یہ ملاقات یہیں ختم نہیں ہوگی بلکہ ہم دوبارہ ملیں گے اور بار بار ملیں گے۔

ہماری دوسری ملاقات میرے گھر پر ہوئی۔ وہ ایسی آسانی سے میرے ماحول میں گھل مل گیا جیسے یہ اس کے لئے بالکل اجنبی نہ ہو۔

’کیا کام کرتے ہیں آپ؟‘۔ کتنا بے ضرر عام سا سوال تھا اسکا۔ میری تمام گفتگو اس سوال سے کوسوں دور رہتی تھی۔ پھر بھی یہ خدشہ کہ کسی وقت یہ سوال ہوگا ضرور۔

’فی الحال تو کچھ نہیں کرتا۔ دراصل پاکستان سے ایم بی بی ایس کا امتحان پاس کرنے کے آٹھ مہینے بعد ہی یہاں امریکہ آ گیا تھا۔ شادی کے ذریعے گرین کارڈ مل رہا تھا تو یہ ہجرت بھی کر ڈالی۔ اپنی ایک سال کی انٹرن شپ بھی مکمل نہیں کی۔ اب یہاں بغیر ایک سال کی انٹرن شپ کے میں یہاں قانوناً ڈاکٹری بھی نہیں کر سکتا۔ یہاں کے سارے امتحان تو پاس کر لئے ہیں۔ لیکن کیوں کہ پاکستان میں صرف نو ماہ کی ہی انٹرن شپ کی تھی، جس کا سرٹیفیکیٹ بھی موجود ہے، لیکن صرف تین ماہ کی کمی کی وجہ سے معاملہ الجھ گیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟‘

’ہوں‘ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگا کہ جیسے اس کا لہجہ معنی خیز ہو گیا ہے، لیکن مجھے برا نہیں لگا۔ میں اس سے کتنی آسانی سے دل کی بات کہہ گیا۔ حالانکہ یہ ایسی دکھتی رگ تھی کہ جسے میں بہت کم لوگوں کے سامنے عریاں کرتا تھا۔

’تو پھر آپ نے کیا سوچا ہے‘ اس نے صوفے پر ذرا آگے ہو کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

’کیا سوچوں، ایک سال کی انٹرن شپ تو یہاں کی بنیادی شرط ہے، جس سے مفر ممکن نہیں۔ یہی ممکن ہے کہ طب سے متعلق کسی اور شعبے میں کام کروں، ڈاکٹری تو یہاں یہ نہیں کرنے دیں گے۔‘

’کوئی طریقہ تو ہوگا؟‘ وہ نجانے کیا پوچھنا چاہ رہا تھا۔

’نہیں، اور کوئی طریقہ نہیں‘ میں نے قطعیت سے جواب دیا۔

’اور آپ بتائیے، آپ کے کیا مشاغل ہیں‘ میں نے گفتگو کا رخ اپنی طرف سے پھیرنے کی کوشش کی۔

’ارے صاحب، میں بھی اتفاق سے شعبۂ طب سے ہی متعلق ہوں، بس ڈاکٹر نہیں ہوں‘۔ اس نے زیادہ تفصیل نہیں بتائی تو میں نے بھی کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔ بس ایک عجیب سا احساس ہوا جسے میں کوئی نام نہ دے سکا۔

اس کے جانے کے بعد بیوی نے آڑے ہاتھ لیا۔

’جب وہ پوچھ رہے تھے کہ کوئی اور طریقہ ہے کیا تو بتایا کیوں

نہیں؟' اس نے غصے سے میرا راستہ روکا

'تم ہماری باتیں سن رہی تھیں' امیر کہ آنے کے بعد سے مجھے غصہ بہت جلد آنے لگا تھا

'باتیں نہیں سن رہی تھی۔ ایک کمرے کے اپارٹمنٹ میں باتیں سننے کی ضرورت نہیں ہوتی، باتیں نہ سننے کی کوشش کرنی پڑتی ہے۔ منہ سے ادا ہونے والا ہر لفظ بند کمرے کی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر نقارۂ خدا بن جاتا ہے۔

یہ ایک کمرے کا اپارٹمنٹ مجھے دن میں کئی مرتبہ یاد دلایا جاتا۔ میرے دوسرے کئی دوست جو ڈاکٹر تھے بہت آسائش کی زندگی گزار رہے تھے۔ بس میں ہی اس جنجال میں گرفتار تھا۔

'انہیں بتایا کیوں نہیں کہ دوسرا طریقہ ہے مگر خود ساختہ اصولوں کی بھینٹ چڑھا ہوا ہے' بیوی کی آواز میں طنز بھی تھا، شکایت بھی۔ میرا اکڑا رویہ اسے کسی وقت بھی رلا سکتا تھا۔ میں جہاں اپنی مدافعت میں غصہ ور ہو گیا تھا، وہ روہانسی رہنے لگی تھی۔

'کیا بتاتا، کہ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ایک جھوٹا سرٹیفیکٹ بنوا لاؤں پاکستان سے؟' یہ بحث اتنی بار ہو چکی تھی کہ مجھے دونوں جانب کے دلائل زبانی یاد تھے۔

'نہیں آپ کیوں دوسرا سرٹیفیکٹ بنوا کر لائیں۔ ہم لوگ جو ہیں قربانی دینے کے لئے۔ ایک کمرے کا اپارٹمنٹ، باوا آدم کے زمانے کی گاڑی۔ کوئی نئے کپڑے بنوائے سالوں ہو جاتے ہیں۔ اسکول کے جونیئر اسسٹنٹ کی تنخواہ ہوتی ہی کتنی ہے کہ اس سے میں یہ گھر چلاؤں۔ آپ کبھی پٹرول پمپ یا ڈالر شاپ پر کام کر کے کچھ پیسے بنا لیتے ہیں، مگر اس سے کہاں کام چل سکتا ہے۔ شرم نہیں آئی ڈاکٹر ہو کر یہ کام کرتے ہوئے؟'

'زیادہ شرم کی کیا بات ہے، کسی کے پٹرول پمپ پر گاڑیوں میں پٹرول بھر کے ایمانداری کی روزی کمانا، یا جھوٹے سرٹیفیکٹ کے سہارے دوبارہ اپنے کیریئر کا آغاز'۔ یہ بحث شادی کے چند ماہ بعد ہی شروع ہو گئی تھی اور اب اس کی عمر پورے دو برس کی ہو چکی تھی۔ 'میرا ضمیر نہیں مانتا۔ ایک دفعہ یہ بے ایمانی شروع ہو گئی تو کہاں جا کر رکے گی؟' میں کوٹ اٹھا کر گھر سے باہر نکل گیا۔ عموماً تو گھر میں عافیت ملتی ہے لیکن زندگی میں اکثر ایسے دور آتے ہیں جب عافیت گھر کے باہر نصیب ہوتی ہے۔

میری اس سے اگلی ملاقات بس اتفاقیہ ہی ہو گئی۔ میں نیچے اسٹال پر کھڑا اخبار کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ وہ آ گیا۔ اخبار خریدنا ایک غیر ضروری خرچہ تھا جس سے بچنے کا طریقہ یہی اپنایا تھا کہ اسٹال پر کھڑے کھڑے ہی چند منٹوں میں سرخیاں پڑھ لیں۔

'میں یہاں سے گزر رہا تھا آپ کو دیکھا تو رک گیا' وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر گویا ہوا۔

'بہت اچھی کیا' اس سے دوبارہ مل کر مجھے واقعی خوشی ہوئی تھی۔

'چلیئے کہیں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں'

'یہ چائے میری طرف سے ہو گی' شاید میری ہچکچاہٹ سے وہ کچھ اور سمجھ بیٹھا تھا۔

'یہ ہجرت بعض دفعہ بہت قربانیاں مانگتی ہے۔ سہولتیں ایسے ہی بے قیمت نہیں ملتیں، بڑا اخراج دینا پڑتا ہے' اس نے میری آنکھوں مین دیکھتے ہوئے کہا۔

'مجھے کیا بتا رہے ہو، میں تو روز اسے جی رہا ہوں' میرے لہجے میں تلخی گھل آئی۔

'مجھے یقین ہے آپ ایک بڑے امتحان سے گزر رہے ہیں۔ آپ کے ساتھی دوسرے ڈاکٹر سب پریکٹس کر رہے ہیں، اس سے یقیناً بہت ذہنی کوفت ہوتی ہو گی۔' کچھ دن پہلے تک میں اس موضوع پر بات کرنا پسند نہین کرتا تھا۔ لیکن شاید مجھے خوشی ہوئی کہ اس نے یہ موضوع نکال لیا۔

'ہاں آپ صحیح کہہ رہے ہیں، پھر شریک حیات کا دباؤ الگ۔'

'ہاں آدمی اکیلا تو نہیں جیتا۔ مرتا ضرور اکیلا ہے۔ لیکن آپ نے بہت ثابت قدمی سے اس صورت حال کا مقابلہ کیا ہے'۔

'کیا ثابت قدمی مفلسی سے بہتر ہے؟'

'لیکن آپ اور کر بھی کیا سکتے ہیں؟'

'خیر کرنے کو شاید کچھ ہو تو سکتا ہے' میرے لہجے میں ہچکچاہٹ تھی۔

'ارے واقعی، کچھ ہو سکتا ہے اس سلسلے میں' وہ دلچسپی سے کرسی پر آگے سرک آیا۔ دونوں کہنیاں میز پر تھیں، چائے کی پیالی اس نے میز پر رکھ دی۔ اپنا چہرا ہاتھوں پر رکھے وہ مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔

'بات دراصل یہ ہے کہ میری بیوی کے ماموں کا لاہور میں ایک پرائیوٹ ہسپتال ہے، اور وہ پچھلی تاریخوں میں مجھے پورا ایک سال کا سرٹیفیکٹ دینے کو تیار ہیں، جس سے میرا مسئلہ حل ہو سکتا ہے' میں نے ذرا ہچکچاہٹ کے بعد اسے مسئلے کا حل کیسی روانی سے بتا دیا، حالانکہ یہ تذکرہ از خود کسی بدعنوانی سے کم نہیں۔

'ارے واقعی۔ تو پھر آپ نے کیا سوچا؟' اس کے جسم کے کسی حصے میں کوئی حرکت نہیں ہوئی تھی، آنکھیں آنکھوں میں ڈالے، نجانے لب بھی ہلے تھے یا نہیں۔ میرا خیال تھا کہ میری بات سن کر وہ کچھ سوچے گا، پیچھے ہٹے گا، ناراض ہو گا، کوئی مشورہ دے گا۔ وہ تو بدستور چہرے پر نظریں گاڑے بت بنا مجھے دیکھ رہا تھا۔

'میں نے کیا سوچا ہے؟ میرے حالات آپ نے دیکھ ہی لئے ہیں۔ اگر میں جعلی سرٹیفیکٹ بنوا لیتا تو دو سال پہلے ہی اس پل کو عبور کر لیتا۔ مگر میرا ضمیر گوارا نہیں کرتا کہ میں فریب سے کام لوں' دیکھیں میرا لہجہ پھر تلخ ہو گیا۔

'مجھے آپ سے یہی امید تھی، میں یہی سننا چاہتا تھا' اس کی آواز میں جوش تھا، تعریف تھی۔ 'یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں، اس کے لئے بہت صبر چاہئے، اپنی ذات پر یقین، سچائی پر یقین۔ آپ جھوٹے سرٹیفیکٹ سے دوسروں کو

دھوکہ دے بھی دیں، لیکن خود سے کیسے جھوٹ بولیں گے'۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر میز پر رکھے میرے ہاتھوں کو تھپتھپایا۔ میرے چہرے پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اندر کہیں دل کے نہاں کانے میں مجھے امید تھی کہ اس کا مشورہ اس کے برعکس ہوگا۔ وہ کہے گا 'رہنے دیجیئے یہ دقیانوسی باتیں۔ ایک ذرا سے سرٹیفیکٹ سے اتنا فرق پڑ رہا ہے تو بنوا کیوں نہیں لیتے وہ سرٹیفیکٹ۔ اگر مقصد نیک ہو تو اس تک پہنچنے کے راستے غیر اہم ہو جاتے ہیں'۔ مگر اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ وہ میری مشکل آسان کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

'کوئی نہ کوئی طریقہ نکل آئے گا، میں بھی ذہن میں رکھوں گا' اس نے مجھے تسلی دی۔ میں اٹھ آیا۔ یہ کیا ذہن میں رکھے گا۔ ایک آدمی کے لئے قانون بدلوا دے گا۔ لیکن میری تسلی کا اسے پاس ہے، اچھا دوست ہے یہ میرا۔

گھر پہنچنے تک میرا موڈ پھر بحال ہو چکا تھا۔ ایک اجنبی شخص کتنی تیزی سے میرے قریب آ گیا تھا۔ مگر اہم بات یہ تھی کہ اس نے روایتی آسانی کے بجائے مشکل راستہ چنا تھا۔ مجھے میری ذمہ داریوں کا واسطہ نہیں دیا تھا۔ اور میرے طرزِ عمل سے متاثر ہوا تھا میں ایک جھوٹے سرٹیفیکٹ کے سہارے زندگی نہیں گزار رہا۔ ہم میں سے کتنے لوگ کسی نہ کسی معنی میں یہ دعویٰ کر سکتے ہیں؟ ایک دفعہ سلسلہ شروع ہو جائے تو قدم قدم پر جھوٹے سرٹیفیکٹ آپ کے لئے دروازے کھول سکتے ہیں، آسانیاں فراہم کر سکتے ہیں، کچھ سالوں میں آپ بھول جائیں گے کہ آپ کا سرٹیفیکٹ جھوٹا ہے۔

گھر پہنچا تو بیوی بستر میں لیٹی تھی۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ جب معاملات زیادہ خراب ہو جائیں تو وہ نیک بخت بستر پر لیٹ کر چادر سر پر اوڑھ لیتی۔ آج بھی یہی منظر تھا۔ آثار اچھے نہیں تھے۔ میں بلا وجہ چیزیں ادھر ادھر اٹھاتا پٹختا رہا۔ مجھے معلوم تھا وہ جاگ رہی ہے، اسے علم تھا میں آ گیا ہوں۔ آخر ہار مان کر میں بہت پیار سے اس کے برابر میں بیٹھ گیا، اور چادر اس کے منہ پر سے ہٹا کر پوچھا:

'کیا ہوا؟'

اس کے آنسو رواں تھے۔ وہ مجھ سے لڑی بھی نہیں، دیکھتی رہی، بس دیکھتی رہی اور روتی رہی۔

'بھئی بتاؤ تو کیا ہوا، پاکستان میں تو سب خیریت ہے؟ میں نے پریشان ہو کر اسے جھنجھوڑا۔ منہ سے کچھ نہ بولی صرف اشارے سے ڈاک کی طرف متوجہ کیا جو اس کے سرہانے رکھی تھی۔ سب سے اوپر شاید کوئی بینک کا خط تھا جو کھلا ہوا تھا، اس سے نیچے کے لفافے ابھی کھولے نہیں گئے تھے۔ مجھے اندازہ تھا کہ بینک کے خط میں کیا ہوگا، دو مہینے سے گھر کے قرض کی قسط نہیں گئی تھی، اس قسم کا خط تو جلد یا بدیر آنا ہی تھا۔ اس خط میں دو ماہ کی مہلت دی گئی تھی کہ اب تک کی قسطیں ادا کی جائیں ورنہ مکان قرق ہو جائے گا۔ اس تحریر نے میری ساری دفاعی فصیلیں منہدم کر دیں۔

'اب کیا کریں' میں نے نیک بخت سے آنکھیں ملائے بغیر پوچھا۔

'کرنا کیا ہے، میں اسکول میں اسسٹنٹ رہوں گی، آپ پٹرول پمپ پر کسی موٹے یہودی کی ملازمت کریں گے، جب شام ہو جائے گی تو وہیں کسی دیوار کے سہارے بیٹھ جائیں گے کہ اپنی چھت تو چھن چکی ہو گی'، اس کے لہجے میں شکست خوردگی تھی، غضب کی کاٹ تھی یا مجھے اسی کی امید تھی۔

'خدا کے لئے، یہ وقت ان جلی کٹی باتوں کا نہیں، اب کیا کریں؟'۔ میں چاہ رہا تھا کہ وہ خود ایک بار پھر وہی رستہ دکھائے جس پر چلنے سے میں ابھی تک انکاری تھا، وہ زور دے اور میں ہار جاؤں۔ میری انا میری شکست ماننے میں آڑے تھی۔ اس نے مجھے مایوس نہیں کیا:

'کیا کہوں، کیا حل بتاؤں۔ ہم ہزار مرتبہ یہ بات کر چکے ہیں۔ اب بھی وقت ہے، میرے ماموں نے کتنی بار کہا ہے چوبیس گھنٹے میں سرٹیفیکٹ آپ کے ہاتھ میں ہوگا۔ آپ کو جانے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں تو ڈاکٹروں کی اتنی کمی ہے، ایک دفعہ آپ قانونی ضروریات پوری کر لیں پھر اس قسم کے خطوط آنا بند ہو جائیں گے'۔ خلافِ امید مجھے خاموش دیکھ کر اس کا حوصلہ بڑھا۔

'آپ نے اپنی سی پوری کوشش کر لی۔ آپ کی نیت تو اچھی تھی۔ اور میں نے ہی کیا آپ نے خود مجھ سے زیادہ تکالیف اٹھائی ہیں۔ آپ کو پٹرول پمپ پر سردی کی راتوں میں کام کرتے دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ شروع ہی سے یہ کام کر رہے ہوتے تو مجھے کوئی دکھ نہیں ہوتا۔ لیکن معاشی سیڑھی چڑھنا اتنا دشوار نہیں ہوتا جتنا اترنا مشکل ہوتا ہے۔ میں ماموں سے خود بات کر لوں گی، آپ کو بات کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ کسی کو تفصیل بتانے کی ضرورت ہی نہیں۔ کسی کو کیا معلوم کہ آپ اب تک یہاں ڈاکٹری کیوں نہیں کر رہے؟' میرا دفاع کمزور دیکھا تو وہ پے در پے حملے کرنے لگی۔ گرتی ہوئی دیواروں کو ایک دھکہ اور دو۔ اس نے میری جرح کو زباں بند دیکھا تو فون کا چونگا اٹھا کر کان سے لگا لیا۔ 'کر رہی ہوں میں فون' اس کی آنکھوں میں مستقبل کی چمک تھی۔ یہ منظر ہمارے گھر کئی بار دہرایا جا چکا تھا۔ ہر بار میں فون اس کے ہاتھ سے لے کر کریڈل پر پٹخ دیا کرتا تھا 'پاگل ہوئی ہو کیا'۔ مگر اس بار زبان نے دل کا ساتھ چھوڑ دیا 'جو جی میں آئے کرو' مجھے اپنی آواز آئی اور میں کمرے سے نکل گیا۔ نیک بخت نے فوراً وہی کیا جو ایک عرصے سے اس کے جی میں آ رہا تھا۔ باورچی خانے میں اس کی پر جوش گفتگو کی آواز آ رہی تھی۔ میرے کندھے جھک گئے تھے مگر اس کی امیدیں جوان ہو گئی تھیں۔ مجھے کیا حق تھا کہ میں اپنے خود ساختہ فلسفے کے لئے ان سب کی زندگیاں ضیق کروں۔ رات ہونے سے پہلے سرٹیفیکٹ فیکس ہو کر آ چکا تھا۔ اب نیک بخت کا رویہ بالکل بدل چکا تھا۔ اب ہم ایک اکائی ہو کر اس جنگ میں اتر رہے تھے۔ اسی رات اس نے میرے لائسنس کے کاغذات بھر دیئے۔ ایک مہینے میں لائسنس بن کر آ جائے گا، پھر ڈاکٹری شروع ہونے میں چند ماہ۔ اس استفسار میں امید جھانک رہی تھی۔

''ایک دفعہ لائسنس آ بھی جائے تو بھی ڈاکٹری شروع ہونے میں

دوتین ماہ تو لگ ہی جائیں گے''۔

''یہ کوئی ایسی فکر کی بات نہیں۔ایک مرتبہ نوکری کا پرچہ آجائے تو بینک سے مہلت مل جائے گی۔بینک کو اپنے قرضے کی واپسی سے دلچسپی ہے،خالی مکان قرق کر کے بینک کیا کرے گا،وہ یقیناً مہلت دیں گے۔'اس کے یقین نے میری شام بھی روشن کردی۔

اس سے میری آخری ملاقات اس کے گھر پر ہوئی۔سرٹیفکیٹ ملنے کے کوئی دس دن بعد اس کا فون آیا۔اس نے مجھے گھر پر آنے کی دعوت دی۔میں خود بھی اس کا گھر دیکھنے کے لئے بے چین تھا،فوراً حامی بھرلی۔نوکری کی امید نے میرے اعتماد میں اضافہ کر دیا تھا۔میں نے سرٹیفکیٹ منگوانے کے مسئلے پر اپنے آپکو قائل کرلیا تھا،یقین دلا لیا تھا کہ میرا فیصلہ صائب ہے۔بلکہ حیرت تھی کہ اب تک میں ایسا بیوقوف کیوں تھا۔

'آیئے، آیئے جناب' اس نے تپاک سے دروازہ کھلو کر کہا۔میرے چہرے کا اطمینان اس سے زیادہ دیر چھپا نہیں رہ سکا۔

'خیریت تو ہے، آپ بہت پرسکون اور مطمئن ہیں۔ بہت اچھی بات ہے بھئی،آپ نے ان حالات میں بھی خوش رہنا سیکھ لیا ہے۔'

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کیسے بتاؤں۔اتنے کم عرصے میں اس کے بہت قریب آگیا تھا۔جس شخص نے میری اصول پرستی کی اتنی تعریف کی تھی اسے کیسے بتاؤں کہ وہ اصول میں نے توڑ ڈالے ہیں۔

'وہ دراصل' میں ہچکچایا۔گفتگو میں ایک وقفہ سا آگیا تھا۔وہ خود منہ سے کچھ نہ بولا۔بول دیتا تو اچھا تھا۔

'دراصل نوکری نہ ہونے سے حالات اتنے دگرگوں ہوگئے تھے کہ قرقی کا نوٹس آگیا تھا' میں نے وجوہات کے پیچھے پناہ ڈھونڈی۔یقیناً اس اطلاع کے بعد وہ میری مجبوری سمجھ سکے گا۔وہ پھر بھی کچھ نہ بولا،بس ہمہ تن گوش رہا،یہ سننے والے اتنے ظالم کیوں ہوتے ہیں،خود سے کیوں نہیں سمجھ جاتے۔اس کے چہرے پر خوف اور کرب کے آثار نمودار ہورہے تھے،گویا اسے معلوم تھا کہ اگلا جملہ کیا ہے۔

'میری بیوی نے اپنے ماموں کو فون کر کے ان سے سرٹیفکیٹ منگوالیا،میں نے تو بہت منع کیا۔مگر اب کیا ہوسکتا ہے،دوتین ماہ میں انشاءاللہ ملازمت شروع ہوسکتی ہے'۔

'انشاءاللہ مت کہو'اس کا چہرا سفید پڑ گیا'میں ہار گیا،تم نے مجھے ہرا دیا۔تم ہار گئے ہو،تم نے مجھے کھو دیا' وہ نفرت سے مجھے گھور رہا تھا۔پہلی بار مجھے اس سے گھبراہٹ ہونے لگی،پھر میں چڑ گیا۔دوسروں کے مقبرے میں نیکی کی تلاش کتنا آسان ہے۔اسے کیا،میرے حالات سے گزرتا تو پتہ چلتا۔

'نکل جاؤ میرے گھر سے،'وہ غضبناک ہو کر کھڑا ہوگیا۔'یہاں سے اب تمھارا تعلق ختم ہوگیا،نکل جاؤ اور یہ لفافہ لیتے جاؤ،آئندہ میری شکل بھی دیکھنے کی کوشش نہ کرنا'اس نے ایک لفافہ،میری مٹھی میں ٹھونس کر اس زور سے مٹھی بند کی کہ میرے ہاتھ میں درد ہونے لگا۔اس نے تقریباً دھکہ دے کر مجھے باہر نکالا اور زور سے میرے پیچھے دروازہ بند کرلیا،دروازہ بند کرنے سے ہوا کا ایسا دباؤ آیا کہ میں اس کے گھر کے باہر لڑکھڑا کے گر پڑا۔خود کو سنبھال کر میں نے اس کے دیئے ہوئے لفافے کو کھولا تو اندر ایک خط ملا۔نیویارک کے ایک ہسپتال نے اس شرط پر مجھے نوکری دی تھی کہ میں پہلے تین ماہ ان کے پاس انٹرنشپ کرلوں۔اس طرح پاکستان میں ٹریننگ کی کمی یہاں پوری ہو جائے گی۔ہسپتال کے چیف میڈیکل آفیسر کی طرف سے نوکری کا پروانہ تھا،اس پر ایک چٹ بھی لگی تھی۔عموماً ہم ایسا نہیں کرتے،لیکن ان صاحب کی سفارش بھی نہیں ٹال سکتے۔ہسپتال کے فنڈ میں خطیر رقمیں جمع کرانے کے باوجود انہوں نے ہم سے کبھی کچھ نہیں مانگا تھا،انہوں نے آپ کی بہت تعریف کی ہے اور ان کی سفارش ٹالنا ہسپتال کے بس میں نہیں۔

میں نے وہ خط جیب میں رکھا،لگا میری پتلون اچانک لمبی ہوگئی ہے،اور جوتے میرے پیروں میں بڑے ہوگئے ہیں۔خط جیب میں ڈالے میں تھکے تھکے قدموں سے گھر کی جانب چل پڑا۔پھر جانے کیا خیال آیا،خط نکال کر پرزے پرزے کردیا،ہنہ کیسا بھولا آدمی ہے،میں نے پرزے ہوا میں اڑا دیئے اور ہنس پڑا۔

''DUSTCART''

چھ یورپی ممالک کے اشتراک سے جدید ٹیکنالوجی کے حامل ایسے ربوٹ تیار کیے گئے ہیں جو گھروں سے کچرا اُٹھانے کا کام بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔ DUSTCART نامی ان ربوٹس میں متعدد کیمرے اور سینسرز نصب کیے گئے ہیں جن کی مدد سے یہ ربوٹس تنگ گلیوں اور دشوار راستوں سے بہ آسانی گذر کر اپنا کام انجام دے سکتے ہیں۔ ان ربوٹس میں گھومنے ، مڑنے اور جھکنے کی صلاحیت موجود ہے۔فلحال یہ ربوٹس چھ یورپی ممالک کے علاوہ جاپان اور کوریا میں کامیابی سے تجرباتی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

کپوت

آغا گل

(کوئٹہ)

لیاقت کوعلم ہوتا کہ بی۔اے پاس کرتے ہی طوفان اُمنڈ آئے گا تو چند برس فیل ہی ہوتا رہتا۔اس کے ابا جی کریم الدین کا خیال تھا کہ بی۔اے پاس کرتے ہی نوکریاں لیاقت کے قدموں میں آ گریں گی۔آ جراسے تلاش کرتے پھریں گے۔فجر کی اذان پہ تو آنکھ نہ کھلی مگر ابا جی کے غل غپاڑے سے ہڑبڑا کر لیاقت جاگ اٹھا۔ابا جی پابندی سے نماز پڑھا کرتا تھا مگر حالات بگڑے تو مسجد کی بجائے گھر میں نماز پڑھنے لگا۔یوں اسے تاسف تو ہوتا کہ باجماعت نماز کے ثواب سے محروم ہو جاتا ہے مگر مسجد جاتے خوف آتا۔کتنے ہی نمازی راہ میں لٹ گئے، مارے گئے اور کتنے ہی خودکش دھماکوں کی نظر ہو گئے۔مسجد کی دیواروں پہ ان کے چھیتڑے ہی دکھائی دیئے۔اب ڈھونڈتے پھرو کہ ابا جی کونسا ہے۔کیا دور تھا جب مساجد سے صرف جوتے ہی چرائے جاتے تھے۔بازاروں میں صدا لگانے والوں جیسی ایک ہی سی صدا ہوا کرتی۔ایک ہی لے اور ایک ہی اٹھان "ابے نالائق۔کام کر منجیاں توڑتا پھرتا ہے"۔لیاقت بیدار ہوتے ہی اٹھ بیٹھا تو اگلی کرواہٹ کانوں میں سرائیت کر جاتی "تیری فصل پک چکی ہے، کٹ چکی ہے، کام پہ لگ ورنہ باسی ہو جائے گا۔تو باسی گونگلو بن جائے گا"۔لیاقت چار بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔اس کی پیدائش پہ خوشیاں منائی گئیں۔ابا جی نے پیر بخاری، پہلوان بابا اور بی بی نانی کے مزار پر چادریں چڑھائیں۔گود میں لیاقت کو اٹھائے ولی بابا کے مزار پر کلی کرانی میں حاضری دی۔لیاقت گول مٹول سا تھا اسے پیار سے گونگلو کہا جاتا تھا۔اور اب اسی گونگلوں کا بھاؤ تاؤ ہو رہا تھا۔ابا جی نے تو تیور ہی بدل لیے تھے۔لیاقت کو باپ سے ایسی بیوفائی کی امید نہ تھی۔اس کا دل ٹوٹ سا جاتا۔گویا اسے کسی گھوڑے یا لیاری کے گدھے کی مانند پالا جاتا رہا کہ جوان ہو کر گدھا گاڑی کھینچے۔ابا جی تو اس سے برملا کہا کرتا کہ بہنوں کی شادی کے لیے مالی مدد کا اہتمام کرے۔دن بھر وہ اپنی موٹر سائیکل پر نوکری کی تلاش میں مارا مارا پھرتا۔شہر کی گلیوں کی دھول خاک چاٹتا شام میں بے نیل و مدام لوٹ آتا۔کھانا کھاتے ہی کمپیوٹر پہ آن بیٹھا اور تندہی سے نوکری تلاش کرتا۔اپنے کوائف دنیا جہاں کو بھجواتا رہتا۔اسی تگ ودو کے باعث آنکھ نہ کھلتی تو ابا جی جھکنے لگتا۔یہ بھی غنیمت ہے کہ بڑی بہن نے خود ہی شادی کر لی۔دس روز بعد دونوں میاں بیوی معافی مانگنے چلے آئے۔داماد نے کریم کے پاؤں پکڑ لیے تو کریم کو معاف کرتے ہی بن پڑی۔ذرا دل جوئی بھی ہوئی کہ ایک بوجھ تو ٹلا۔تینوں بہنوں کو بھی تسلی ہوئی کہ اگر وہ بھی از خود شادی کر لیں تو عام معافی کا اعلان ہو سکتا ہے۔لیاقت کچھ دن تو نیفے میں چاقو اڑسے پھرتا رہا تھا۔مگر اپنے بہنوئی پر حملے کی اس میں طاقت نہ تھی وہ تو عید پہ قربانی کے وقت کھسک جاتا کیوں کہ بکرے کا تڑپنا اس سے دیکھا نہ جاتا۔ذرا رد و کد کے بعد وہ بھی بہنوئی کے گلے لگ ہی گیا۔

کریم کا صرافہ بازار میں ڈھابہ تھا جو کبھی اس کے دادا نے کھولا تھا۔اس دور میں صرافہ بازار ہی کوئٹہ کا دل ہوا کرتا تھا کچے دھاگے سے بندھے لوگ بازار حسن میں کھچے چلے آتے۔وہاں ایسا کاروبار تھا۔ایسی فراوانی ایسا رزق تھا کہ قلاتی ہندو اور قندھاری سنار بھی دوڑے چلے آتے۔بازار حسن میں بھی سونا تھا، حسن تھا، کندن تھا۔سونا ہاتھوں میں ڈھلتا، کٹالی میں پگھلتا، زد پہ آتا، چوٹیں سہتا جس کے باعث صرافہ بازار کے نام سے مشہور ہوا۔رات میں تو بازار جاگ ہی اٹھتا۔مگر دن میں بھی بڑی چہل پہل رہا کرتی۔بزاز، درزی، ڈاکٹر، حکیم، مردانگی والی دوائیاں بیچنے والے، سنگدل محبوب کو قدموں میں لانے والے عامل، قسمت کا حال بتانے والے نجومی، رمال، فال نکالنے والے طوطے اپنا اپنا رنگ جماتے۔صرافہ بازار کے اندر بھی درجنوں بازار تھے مگر اسّی برس بعد سرکار نے یہ بازار بند کروا دیا اور کسبیاں، کنچنیاں، ناگرنیاں، ٹکائیاں، ڈیرہ دارنیاں، پشتینی رنڈیاں جو پہلے ایک ہی بازار میں محبوس تھیں گلی گلی کوچہ کوچہ پھیل گئیں۔ہر محلّہ صرافہ بازار کے رنگ میں ڈھلتا چلا گیا۔طوائفیں کبھی بھی اپنے کوچنگ سینٹر پہ فیس نہیں لیا کرتی۔ایسے ہی نامساعد حالات میں کریم کو اپنا ڈھابہ "طوفان میل ہوٹل" سنبھالنا پڑا۔وہ جی ہی جی میں کڑھتا کہ پرکھوں نے دولت کمائی اس کا دور آیا تو بازار حسن ہی بند ہو گیا۔صراف بھی اپنا کاروبار بڑھا گئے۔چکلہ بند ہونے پر وہ قدرت کی ستم ظریفی کا شاکی رہتا۔مگر امید کا دامن کبھی نہ چھوڑتا کہ سن رکھا تھا بلس سے ہی ابلیس کا لفظ بنا ہے۔نہایت ہی خشوع و خضوع سے چکلہ دوبارہ کھلنے کی دعائیں مانگا کرتا۔اگر فارغ البالی ہوتی تو وہ کبھی بھی گونگلو کو نوکری کے لیے مجبور نہ کرتا۔کریم کے اپنے والد شیر دل نے بازار بند ہوتے دیکھا تو مارے غم کے بستر سے جالگا اور جان دے دی۔اس کے باپ یعنی کریم کے دادا کے دور میں ایک کھڑکی توڑ فلم دھڑلے سے چلی تھی جس کا گانا "یہ دنیا ہے طوفان میل" اسی قدر مقبول ہوا کہ بائیسکوپ کے تحت ڈھابے کا نام ہی بدل کر طوفان میل ہوٹل رکھ دیا گیا تھا۔لیکن طوفان گذر چکا تھا اور میل بھی بیل گاڑی میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔کریم جب شام میں گھر لوٹتا تو گھریلو ضروریات کی ایک نئی فہرست استقبال کرتی۔وہ بھنّا جاتا "اوے! میں کوئی کانی گدھی ہوں کہ پٹر پٹر روپے پھینکتا رہوں" کھانا زہر مار کر کے وہ پڑوس میں دوستوں سے شرط بد کے لڈو کھیلنے چلا جایا کرتا۔ابا جی کا غصّہ اور اشتعال زیادہ دیرپا نہ ہوا کرتا۔تاہم لیاقت رفع شر کے لیے ادھر اُدھر کھسک جایا کرتا۔

لیاقت کا جینا دوبھر تھا مگر کیا کرتا۔ان ہی تکلیف دہ ایّام میں اسے ریحانہ ملی۔ جواس کی بہن رضیہ کی سہیلی تھی اورلندن انگلش اسکول میں معلّمہ تھی۔ لوگوں کوانگریزی ہوگئی تھی۔انگریزی وبائی شکل اختیار کرچکی تھی۔حکمران اور بالا طبقوں کی زبان تھی۔انگریزی اسکول بے حد مہنگے تھے۔لہٰذا دونمبر اسکول کھلتے چلے گئے۔ایسے اسکول سات آٹھ کمروں پر مشتمل کسی گلی کے مکان میں قائم ہوتے۔والدین خوش ہوتے کہ ان کے بچے انگریز بن کر ہی نکلیں گے۔وہاں برائے نام تنخواہیں ملا کرتیں۔ریحانہ بھی امر مجبوری نوکری کررہی تھی۔اسے بھی دیگر معلمات کی طرح اپنا جہیز بھی تیار کرنا تھا۔سبھی استانیوں Pillory میں تھیں۔جس کے سبب ان میں انسانیت زیادہ تھی۔غربت انسانوں کو قریب لے آتی ہے۔ریحانہ پہلے پہل تو کھنکھیوں سے لیاقت کو دیکھا کرتی۔پھر اسے مسکراہٹ سے نوازنے لگی۔پھر یہ مسکراہٹ ہونٹوں سے نکل کر آنکھوں میں سما گئی اور موبائل نمبر ملنے سے تعلق استوار ہوگیا۔لیاقت نے اباجی سے نیا سائیلنسر لگوانے کے لیے رقم مانگی تھی مگر ٹال مٹول کے باعث وہ سائیلنسر نہ بدل سکا۔ جس کے باعث ریحانہ کو کافی پہلے علم ہوجاتا کہ محبوب پھٹ پھٹی پر چلا آرہا ہے۔ وہ بھی کسی بہانے گیٹ پر چلی آتی۔لیاقت نے چند بار پیشکش بھی کی کہ وہ ہاتھ بٹانے کو ہوٹل پہ چلا آئے گا۔مگر اباجی کو بے حد بے ناگوار گزرا''گونگلو! میں نے تجھے اس لیے بی۔اے کرایا تھا کہ تو میرے ساتھ کام کرے۔بازار کھلا ہوتا تو بات بھی تھی۔اب وہاں کیا رکھا ہے۔نوکری کر افسر بن۔اوئے میرا بھی رعب شوب ہو''۔ریحانہ کے گھر والے اب انہیں اپنے ہاں بلایا کرتے۔کریم کو بھی رشتے پر اعتراض نہ تھا۔تاہم ریحانہ کے گھر والوں نے عندیہ دیا کہ اگر لیاقت برسر روزگار ہوجائے تو وہ رشتہ دے دیں گے۔یہ عندیہ لیاقت کیلئے مہمیز ثابت ہوا۔لیکن نوکری کے مول زیادہ تھے۔کلرک کے ڈھائی لاکھ روپیہ، نائب قاصد کی نوکری بھی لاکھ سے کم میں دستیاب نہ تھی۔بی۔اے کر کے بھلا کوئی نائب قاصد لگتا ہے۔چیئرمین پبلک سروس کمیشن چالیس لاکھ سے کم پہ تیار نہ ہوتا۔سیکشن افسر کیلئے بھی بیس لاکھ سے کم میں بات نہ ہوتی۔ملازمتیں بکاؤ مال تھیں۔جیسا عہدہ ویسا ہی نرخ۔وزیر مشیر رقم لیے بغیر منہ ہی نہ لگاتے۔کریم کف افسوس ملتا کاش بازار دوبارہ کھل جائے رونقیں لوٹ آئیں تو پو بارہ۔کہیں سپرنٹینڈنٹ یا پھر پولیس میں اے ایس آئی کی نوکری تو خرید ہی لے گونگلو کے لیے۔

ایسے میں کریم کا پرانا شناسا مرزا اقبال اسے کسی مارکیٹ میں دکھائی دیا۔کریم لپکا اور مصافحہ کیا۔بات چل نکلی تو کریم نے اپنا دکھڑا رو دیا۔مرزا تو خواجہ خضر ثابت ہوا۔''نوکری؟ سرکاری نوکری بھئی اس میں کیا رکھا ہے۔وہ دن گئے سرکاری ملازمت تو اب ذلت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔میرے اخبار میں چلا آئے رپورٹر بنالوں گا''فرطِ جذبات سے کریم لپٹ گیا''مرزا یہ کام کردو تو میں عمر بھر غلام رہوں گا۔تنخواہ کتنی ہوگی''

مرزا نے صاف گوئی سے کام لیا''ابتداء میں تو کم ہوگی۔بیرون کوئٹہ تو نوجوان ہم سے نمائندہ بننے کی التجائیں کرتے ہیں۔اکثر تو خود اخباروں کو وہ ماہانہ رقم ادا کرتے ہیں تاکہ وہ بدستور نمائندہ رہیں۔میڈیا چاہے تو آسمان پر اٹھالے اگر گرانا چاہے تو عمر بھر کی محنت اور نیک نامی خاک میں ملا دے۔تم لیاقت کو میرے دفتر بھجوادو۔اپنا بچہ ہے کام بھی سیکھ لے گا اور عیش بھی کرے گا'' کریم کی باچھیں کھل گئیں۔اسی شام وہ نوشیروان اخبار کے دفتر آپہنچے۔لیاقت کو مرزا سے متعارف کرایا بلکہ اس کی شاگردی میں ہی دے دیا مرزا نے خاص توجہ دی۔لیاقت کو رپورٹنگ مدح سرائی اور بلیک میلنگ کے گُر بھی سکھائے۔

''کسی کی دم پر پاؤں رکھو تو تبھی چیختا ہے۔تم ایک Nuisance پیدا کرو۔معاشرے کو دو ہی طاقتیں متحرک رکھتی ہیں۔خوف اور لالچ۔ہمیں میڈیا کا یہی گُر یہی منتر استعمال کرنا ہے''لیاقت کو اس نے کچھ رقم بھی دلوادی۔ ''موٹر سائیکل ٹھیک کروالو۔ٹینک کی آواز نکالتا ہے پہلے تو میں گھبرا ہی گیا تھا کہ نوشیروان کے دفتر پر زمینی حملہ ہوگیا ہے''۔ایک روز مرزا نے ڈانٹ پلائی ''لڑکیوں سے اتنی باتیں نہ کیا کرو صحافت اور عشق ساتھ نہیں چل پاتے''۔ لیاقت نے سچائی کا اظہار کیا''لڑکیاں نہیں بس ایک لڑکی ہے۔میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں''مرزا محبت کرنے والوں کو پسند کرتا تھا۔محبت روزنامہ ہے اور شادی اس کا سنڈے ایڈیشن''تو کر ڈالو شادی دیر کا ہے کی''یوں ان کی شادی سادگی سے ہوگئی مگر ریحانہ بدستور اسکول کی ملازمت کرتی رہی کیونکہ لیاقت کی پدی مار تنخواہ میں گزر بسر سہل نہ تھی اور لوگوں سے مال اینٹھنے کا فن وہ ابھی سیکھ ہی رہا تھا۔سیاستدان، وزیر، مشیر خاصے شاطر تھے آسانی سے بھرّے میں نہ آتے۔لیاقت کے پاس اب صحافی کا شناختی کارڈ تھا اس نے موٹر سائیکل کے آگے اور پیچھے پلیٹیں بھی لگوالیں۔جن پہ انتباہ تھا''پریس''جیسے مارکر کے بنگلے کے باہر دور ہی سے لکھا دکھائی دیتا ہے''خبردار۔کتوں کا خطرہ ہے۔صحافی والا شناختی کارڈ وہ اہمیت حاصل کرنے کے لیے گلے میں لٹکائے پھرتا جس کے باعث پولیس والے بھی بدک جایا کرتے سرکاری افسروں کے بھی اوسان خطا ہو جاتے۔سرکاری دفتروں میں داخل ہوتا تو لوگ مودب ہوکر ملتے کہ کوئی خبر ہی نہ جڑ وادے کبھی کبھار مرزا اقبال سیاستدانوں کے اڈوں سے پی پلا کر لوٹتا تو اپنا سارا علم وہ لیاقت پہ انڈیلنے لگتا''پاکستان میں صحافت اور خباثت کا راج ہے صرف گلیمر بکتا ہے اور کچھ بھی نہیں۔میاں! مجھ سے علم حاصل کرو اس سے پہلے کہ میں نہ رہوں۔میں ایک عظیم صحافی ہوں افسوس یہ کوٹہ سسٹم کے مارے ہوئے تنگ نظر جو کہتے ہیں میرٹ کی لعنت کو ختم کرو اور ان پڑھ جعلی ڈگریوں والے وزیر میری قدر نہیں جانتے''مرزا کو انگریزی ادب پہ بھی عبور حاصل تھا مگر صحافت وہ اردو میں ہی کرتا کہ اکثریت کی زبان ہے۔لیاقت اور ریحانہ کی زندگی ایک ڈگر پہ چل نکلی تھی۔لیاقت کو صحافت اچھی لگی بازار حسن کی مانند بازار صحافت پہ پابندی لگنے کا امکان نہ تھا لیکن بازار صحافت بھی چکلوں کی ماں ہیرہ منڈی کی طرح نماز مغرب کے بعد کھلا کرتے۔لیاقت گھر لوٹتا تو ریحانہ گہری نیند سو رہی ہوتی اور

جب شام کے لمحات میں رخسانہ کو فرصت مل پاتی تو لیاقت اخبار کے دفتر میں ہوا کرتا۔ دن میں وہ قریب نہ آ پاتے کہ چھوٹے سے گھر میں ہنگامہ سا مچا رہتا۔ لیاقت کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ مرزا کی محبت میں غرض بھی شامل ہے کیونکہ صحافت کا میدان خالی ہوا جاتا ہے سب سے بڑے اخبار جنگ کے ایڈیٹر مجید اصغر پر فائرنگ ہوئی نصیب اچھے تھے مگر ڈرائیور مارا گیا۔ ڈیرہ بگٹی، کوہلو، نصیر آباد، جعفر آباد، جھل مگسی صحافیوں کے لیے نوگوایریا بن چکے تھے۔ یوں بھی صحافیوں کی تادیب وتعزیب عام تھی۔ جاگیرانہ اور سرداری نظام کے سبب صوبہ بھر میں زبان بندی کا ہی حکم تھا۔ صحافیوں کو آبرو اور جان بچانے کے لیے اگر رپورٹنگ کرنا بھی پڑتی تو درباری شاعروں کا سا انداز اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ گوادر، پنجگور، تربت، آوارانی اور خضدار میں کچھ رقم کرنے کے لیے پہلے صحافی پل صراط پر چلتا۔ صحافت کی دنیا میں آج اور ابھی ہوا کرتا ہے۔ اتنی فرصت نہیں ملتی کہ صحافی کسی شاعر کی طرح اپنے ہی کلام کی اصلاح کرنے لگیں۔ چشتی مجاہد کو گولیوں کو نشانہ بنایا گیا۔ جنگ کا صحافی اختر مرزا مارا گیا۔ چونکہ لیاقت کو صحافت سے کبھی بھی دلچسپی نہیں رہی تھی نہ ہی وہ کبھی اخبار پڑھتا۔ اس کی زندگی تو میوزک، انٹرنیٹ اور ریحانہ کی محبت میں گزر رہی تھی وہ صحافت کے مذبح خانے میں پریشاں ہو کے رہ گیا۔ محمد رفیق اچکزئی، ولی خان بابر، واشک کے رحمت اللہ عابد، گوادر کے دلشاد ہانی، لپنی کے صدیق عیدو کے قتل کی خبریں سن کروہ کانپ کانپ اٹھتا۔ اس نے تو صحافت ریحانہ کے لیے اختیار کی تھی کیونکہ ملازمت ایک لازمی شرط تھی۔ جو محبت کی خاطر اسے پوری ہی کرنی پڑی۔ صحافت کی آزادی بری طرح مجروح ہو رہی تھی۔ مگر ایسے لمحات میں جب وہ پسپا ہونے لگتا تو مرزا حوصلہ دلاتا ''اور کیا آزادی ہے؟ فون تک ٹیپ ہو رہے ہیں۔ خفیہ کیمرے شہریوں پر نظر رکھتے ہیں۔ صحافت اس خارزار سے گزر ہی جائے گی۔ ہمت نہ ہارو''۔

لیاقت نے چند اخباروں میں ریحانہ کے اسکول کی تعریف لگوا دی۔ چند انٹرویو کرا دیئے تو لندن انگلش اسکول نے ریحانہ کا مشاہیرہ بڑھا کر اسے وائس پرنسپل لگا دیا۔ گویا لیاقت کی صحافیانہ خدمات سے خوش ہو کر ریحانہ کو پرنسپل بھی لگایا جا سکتا تھا۔ دو ہی برس میں اسکول کی تعریف کے اخباروں میں ایسے ڈونگرے برسے کے ریحانہ کو ہی اسکول کی پرنسپل بنا دیا گیا۔ لیاقت دفتر میں مٹھائی لے آیا۔ مرزا کہاں چوکنے والا تھا آڑے ہاتھوں لیا۔ ''تم تو نکل بھاگنے کے چکر میں تھے دیکھا صحافت کا نشہ۔ میاں یہ جادوئی چراغ ہے'' لیکن یوں لگتا تھا کہ الہ دین کا جادوئی چراغ زیادہ تر سامری جادوگر استعمال کرنے لگا ہے۔ صحافت کے باہر کی وسیع دنیا پہ ان کا اختیار نہ تھا جو کچھ ہو رہا تھا اس کی صحافی صرف رپورٹنگ ہی کر سکتے تھے وہ بھی سخت ڈپلومیٹک انداز میں کہ کوئی ناراض نہ ہو۔

شومئی تقدیر کہ ۲۶/ اگست ۲۰۰۶ء کے خون چکاں واقعات نے بلوچستان میں آگ لگا دی۔ ایک غیر اعلانیہ سول وار شروع ہو گئی۔ جو دیکھتے ہی دیکھتے پھیلتی چلی گئی۔ اس جنگ وجدل میں صحافت کا میدان بھی کوروکیشتر بن گیا۔ سرمچاروں کی جانب سے صحافیوں پر دباؤ بڑھنے لگا کہ ان کی خبریں من وعن شائع کی جائیں۔ چاہے زبان و بیان کی غلطیاں ہوں زبان غیر صحافیانہ ہو۔ دوسری جانب سرکاری اہل کاروں کا قانونی لٹھ تھا کہ ایسی خبریں ہرگز نہ لگنے پائیں۔ سب سے پہلے ڈائریکٹر پریس انفارمیشن نے صوبائی سربراہ کا عہدہ چھوڑا اور اسلام آباد میں ڈیسک جاب قبول کر لی۔ اس کے اعصاب جواب دیئے جا رہے تھے۔ قتل، قید یا پھر ٹینشن کے باعث ہارٹ فیل سے بچنے کے لیے اس نے خود ساختہ جلاوطنی کو ترجیح دی۔ لیاقت کی آنکھوں کے سامنے اس کے سینئر ساتھی مارے جانے لگے۔ خلیل اللہ سالانی کو چ میں گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ خادم حسین شیخ نے حب میں موت کا استقبال کیا۔ فیض ساسولی نے خضدار میں جان دی۔ ایک رات کچھ جذباتی نوجوانوں نوشیروان کے دفتر میں دندناتے ہوئے داخل ہوئے اور مرزا اقبال کے سر ہو گئے۔ ایک بیان میز پر دے مارا ''مرزا صاحب آپ ہمارے بیانات کیوں شائع نہیں کرتے''۔ مرزا کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے حواس باختہ ہوا روح فنا ہو گئی، گھگھی بندھ گئی۔ لرز کر بولا ''آپ صاحبان چائے پیجیے۔ خبریں تو میں لگاتا ہی ہوں جہاں تک طاقت ہو وہیں تک انسان چلتا ہے''

نوجوان بے حد غصیلے تھے ''مرزا صاحب کوئی انسان چل کر قبرستان نہیں جاتا کندھوں پر جاتا ہے۔ آپ سینئر صحافی ہیں آپ کے احترام میں ہمارے کندھے حاضر ہیں۔ چوتھا کندھا لیاقت کا ہوگا'' لیاقت کی یہ حالت کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ ہمت کر کے پوچھا ''کیا آپ صاحبان مجھے جانتے ہیں''۔

اُن کے جواب سے لیاقت کا دل ڈوبنے لگا کانپ ہی اٹھا ''ہاں تمہارے بچوں کے نام بھی جانتے ہیں، موبائل نمبر بھی اور یہ کہ تم آدھے نمبر کی عینک بھی لگانے لگے ہو'' انہوں نے مرزا کا دل نہ توڑا اسکون سے چائے بھی قبول کر لی ''مرزا صاحب! یہ بیان لگنا چاہیے۔ اگر **Hostile** ہوئے تو آپ کا ٹھکانہ کاسی قبرستان ہی ہوگا۔ فیصلہ ہمیں نہیں بلکہ آپ کو کرنا ہے'' بیان پڑھ کر مرزا کی سٹی گم گئی ''لیاقت! یہ تو میری موت کا پروانہ ہے۔ میرا بلیک وارنٹ ہے'' لیاقت سٹک جانا چاہتا تھا ''آپ سینئر صحافی ہیں میرے استاد ہیں میں کیا مشورہ دوں۔ میں تو آپ کے مشوروں پر چلتا ہوں'' مرزا موت اور زندگی کے دوراہے پر کھڑا رہا۔ پھر اس نے کتر بیونت کر کے **Euphoric** انداز میں بیان دوبارہ لکھا اور چھاپتے ہی بن پڑی۔ اس خبر کے چھپتے ہی سرکاری تیور بدل گئے۔ سرکاری اہل کار آئے اور مرزا کو حبیب نالے کے پار لے گئے۔ جہاں پرندوں کے بھی پر جلتے ہیں بہت ڈھونڈیا پڑی مگر مرزا واپس نہ لوٹا۔ جانے کہاں کھیت رہا۔ صحافیوں نے پریس کلب کے باہر دھرنا دیا، احتجاج کیا مگر بے سود۔ دوروز بعد مرزا خود ہی کہیں سے لٹا پٹا چلا آیا۔ دو ہی روز میں وہ کمزور اور بے حد بوڑھا ہو

چکا تھا۔گم سم سا وہ اپنے دفتر میں آ کر بے جان سا بیٹھ گیا۔

''خبر نہ چھاپوں تو وہ مارتے ہیں۔خبر لگاؤں تو یہ مارتے ہیں۔یا خدا اس سول وار میں کہاں جاؤں میں'' مرزا کی آمد کی خبر سے صحافی برادری میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔سبھی دوڑے چلے آئے۔مبارکبادوں کا سلسلہ دیر تک جاری رہا۔اگر چہ رفقاء کار تسلیاں دیتے رہے مگر مرزا حوصلہ ہار چکا تھا۔

اخباروں کے دفاتر میں جنگ کا سا سماں تھا۔اُدھر خبر لگانے کا اصرار اور ادھر خبر Kill کرنے کا دباؤ۔ایڈیٹر اور صحافی عدم تحفظ سے باؤلے ہوئے جاتے تھے۔لیاقت ایک عملی انسان تھا۔اس نے صحافت کو خیر آباد کہنے کا فیصلہ کر لیا۔جان ہے تو جہان ہے۔طوفان میل ہوٹل بھی تو چلایا جا سکتا تھا۔اس تجویز سے ابا جی بہت ناخوش ہوئے۔''تیری وجہ سے عزت مل رہی ہے۔بازار حسن بند ہونے سے ہمارا رزق گیا۔اب تو صحافت چھوڑے گا تو عزت بھی جائے گی۔ تھانیدار تک علیک سلیک کرنے لگے ہیں۔وزیر وزراء میرے سلام کا جواب دینے لگے ہیں۔تو باپ کی عزت بھی اتار لینا چاہتا ہے کیا۔کپوت کہیں کا'' لیاقت روہانسا ہو گیا''خبر لگاؤ تو تڑیاں لگاتے ہیں،مگر تحفظ نہیں دیتے،خبر نہ لگاؤ تو سمو چا جان سے مار ڈالتے ہیں،کوئی گھونسا جڑ دیتے،طمانچہ مارتے تو بات بھی تھی۔یہ تو جان ہی نکال دیتے ہیں۔صحافت موت کا کھیل ہے،جس کے دو مداری ہیں کسی کی ڈگڈگی پر ناچوں،کسی کی تال پر دھمال کروں''

ابا جی ٹس سے مس نہ ہوا۔اس نے اپنے لڈو والے ساتھیوں کو بلوا بھیجا۔ان کا بھی وہی اصرار تھا''دیکھو لیاقت۔باپ دادا کے نام کو رشن کرنے والے کو سپوت کہتے ہیں۔جو کچھ بھی نہ کر سکے۔مگر نام اور عزت قائم رکھے اسے پوت کہتے ہیں۔جوان کا نام ہی ڈبو ڈالے وہ کپوت کہلاتا ہے۔تم سپوت نہیں بن سکتے تو پھر کپوت بھی نہ بنو''۔سب سے زیادہ مخالفت ریحانہ نے کی۔وہ پرنسپل کا عہدہ پا کر خود پسند ہو چکی تھی عزت و توقیر ملی تھی۔لیاقت نے مجبوراً موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور نوشیروان کے دفتر جا کر کام سنبھالا۔صرف اغوا،قتل، ڈاکہ،بم دھماکہ اور خودکش حملوں کی خبریں آ رہی تھیں۔اخبار پڑھنے والوں کا ذوق ہی بدل چکا تھا۔وہ اتنے برسوں میں دہشت ناک خبروں کے Addict ہو چکے تھے۔ایسی خبریں نہ ہوتیں تو اخبار پٹخ دیتے''کیا پھیکا اخبار ہے،بس اشتہاروں سے ہی بھرا ہوا ہے،خبر تو کوئی ہے ہی نہیں'' بارہا صحافیوں نے سرکار کا در کھٹکھٹایا۔وہاں سے سرکاری بیانات ہی ملا کرتے''پاکستان میں دو دہائیوں میں صرف ٦٦ صحافی ہلاک ہوئے ہیں۔یعنی چار ماہ میں ایک قتل۔اس سے کہیں زیادہ صحافی تو ہارٹ اٹیک اور ایکسیڈنٹ میں مر جاتے ہیں۔سب سے زیادہ صحافی صومالیہ میں ہلاک ہوئے ہیں اس کے بعد شام میں۔عراق بھی لاتعداد صحافی مارے گئے۔بھئی پاکستان تو کہیں پیچھے ہے۔آپ اللہ توکل کام کریں اور ہرگز ہرگز ان کی کوئی بھی خبر نہ لگائیں۔یہی تو حب الوطنی ہے''

اب سویرے سویرے ابا جی تواضع کے لیے نت نئے حربے استعمال کیا کرتا'' گونگلو کی ماں اس بزدل کی بجائے ایک بیٹی اور پیدا کر دیتی تو بہتر ہوتا۔ صحافت چھوڑ کر بھاگ رہا ہے۔نالائق۔کم ہمت کہیں کا'' ریحانہ کو عہدہ صحافت کے ناطے ملا تھا وہ کیسے تنزلی قبول کرتی۔ریحانہ چونکہ پرنسپل تھی وہ اپنی تقریر میں اقبال کے شعر بھی جڑ دیا کرتی اقبال کے ابا نور محمد چونکہ ٹوپیاں سیتے تھے۔اقبال بھی ہر ایک کے سر پر ٹوپی جما دیا کرتا،اجرک اور وزارت کی طرح اقبال کی شاعری ہر ایک پر فٹ آ جاتی۔بچے کے ختنہ سے سولینی اور نطشے تک اس شعری ٹوپی میں سمٹ آتے۔ریحانہ کے رجز اور ابا جی کی جھاڑ دھتکار اور دھاڑ سے لیاقت بہادر بن گیا۔اس نے اقبال کا مردِ شاہین بننے کا فیصلہ کر لیا جو تندیِ باد مخالف کی قطعاً پرواہ نہیں کرتا لہٰذا بدستور وہ نوشیروان میں کام کرے گا۔مضبوط ادارہ تو تھا مگر اگلے ہی دن روزنامہ زمانہ کے صحافی محمد خان ساسولی پر گولیوں کی بارش ہو گئی۔خضدار میں منیر شاکر گولیوں کا نشانہ بنا۔گوادر میں توار کا نمائندہ لالہ حمید خبریں چھاپنے پر پکڑا گیا۔پھر اس کا بے جان جسم ہی ملا۔گولیوں کے باعث زخموں سے نکلنے والا خون کوئی تحریر تو رقم نہ کر پایا مگر اس کا خون چکاں جسم بجائے خود صورتحال کا ایک پریس ریلیز تھا۔سماء کا کیمرہ مین عارف ملک ایک خودکش حملہ آور کا نشانہ بنا۔دفتر میں بھی ماحول دہشت ناک رہتا۔ایڈیٹر تو کیا نمائندوں سے لے کر چوکیدار تک انجانے خوف سے ہراساں،لرزاں اور ترساں رہتے۔ لیاقت کی اپنی ایک دھاک تھی محلے میں،ابا جی اب سینہ تان کر چلتا۔اس کا بیٹا صحافی تھا۔مرزا اقبال کی وفات یا قتل کے بعد وہی نوشیروان کا ایڈیٹر بنتا۔کریم کو غم تھا کہ دو نسلوں کے بعد بھی اس کا رزق سابقہ بازار حسن میں پھڑ پھڑاتا پھرتا ہے۔رات گئے تک وہ اپنے دوستوں سے بازی بد کر لڈو کھیلتا۔کبھی بجلی چلی جاتی تو جلدی لوٹ آتا۔اخباروں کے دفاتر پر عاشورہ آیا تھا۔نہ ہنسی نہ مذاق نہ قہقہے نہ غل غپاڑہ۔اخبار کی تیاری کسی ارتھی کی طرح ہوتی۔بوجھل قدموں اور تھکے ہارے جسموں سے کام لیتے ہوئے کسی گورکن کی مانند اخبار کا تابوت تیار کرتے۔ اخبار کے تابوت کے پہلو بہ پہلو ان کا اپنا تابوت بھی اٹھ سکتا تھا۔سرکار نے چالیس کالعدم تنظیموں کو دہشت گرد قرار دے کر ان کے بیانات پر پابندی عائد کر دی۔چالیس کا عدد صحافی برادری میں دھماکہ خیز ثابت ہوا۔مرزا اب اپنے دفتر میں چغل چک کی مانند بے بسی سے سر ہلائے جاتا۔کف افسوس ملے جاتا۔اسے خود بھی علم نہ تھا کہ سچ اور جھوٹ کے دوراہے پہ وہ کہاں کھڑا ہے۔اس کے اپنے قدم کہاں پڑ رہے ہیں۔وہ سیدھا کھڑا ہے یا کہ چغل چک کی طرح الٹا لٹک رہا ہے۔جس کے باعث الٹی دنیا اسے سیدھی دکھائی دے رہی ہے۔ایک روز وہ دفتر سے گھر کیلئے نکلا تو پھر نہ ملا۔پریس کے باہر دھرنے بے سود ہو چکے تھے۔شہری ان دھرنوں کے اتنے برسوں میں عادی ہو چکے سر جھکائے پاس سے گزر جاتے۔ جیسے گروہ در گروہ پلیٹ فارم پر بیٹھے قلیوں کو کوئی نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔یہ احتجاج جاری تھا کہ رزاق گل تربت سے پوچھ گچھ کے نام پر اٹھایا گیا۔پھر اس کا جسم گولیوں سے چھید کر پرانے اخبار کی طرح پھینک دیا گیا۔بے روح کے جسم

باقی صفحہ ٦٥ پر ملاحظہ کیجیے

NAME PLATE

فرخندہ شمیم

(راولپنڈی)

وہ تین دنیاؤں میں سے تیسری دنیا کا کوئی ملک تھا جہاں ادیبوں کی قومی کانفرنس ہو رہی تھی۔ سرکاری ادارہ زور وشور سے تیاریوں میں مصروف تھا۔ کانفرنس میں تین مرکزی SESSIONS کا ایجنڈا تھا جس میں پہلا قومی ادب، دوسرا علاقائی اور تیسرا عالمی ادب کے ان قلمکاروں کی خدمات سے تھا جو بیرونِ ملک رہ کر قومی ادب کی خدمت کرتے تھے۔ قومی زبان کے شہکار ادب پاروں کو غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ کرنے والے ادیب کانفرنس کی خصوصی ترجیح تھے۔

سب سے زیادہ وقت قومی اور علاقائی شہرت رکھنے والے ادیبوں کو بحیثیت مندوب دعوت دینے کے سلسلے میں ہو رہی تھی۔ بیرونِ ملک تو گنے چنے ہی مترجم اور مدیران تھے جن کے نام سرکاری ادارے کے سرپرستوں کو زبانی یاد تھے۔ مسئلہ قومی اور علاقائی سیشنز میں بلائے جانے والے ادیبوں کے انتخاب کا تھا اتنی بڑی سردردی تھی کہ چیئرمین سے لے کر ڈپٹی ڈائریکٹرز تک ہونقوں کی طرح منہ کھولے بیٹھے تھے اور ادب کی کوئی مکھی تک ان کے منہ میں جانے پر تیار نہیں تھی۔ آخر کس کو لیں اور کس کو چھوڑیں۔۔۔ فہرست ایک بار بنی، پھر مٹی، پھر لکھی، پھر پھاڑی۔۔۔ اتنا بڑا دباؤ تھا انتظامیہ پر۔

حکومتی ایوانوں میں گھومنے والے ادیب نظر انداز نہیں کیے جاسکتے تھے۔

سول ایوارڈ یافتہ مصنفین کو بائی پاس کرنا ممکن نہیں تھا۔

اعلیٰ عہدوں پر کام کرنے والے بیوروکریٹ ادیب، خصوصاً جنہیں بار بار توسیع ملازمت مل جاتی ہو، کسی طور فہرست سے خارج نہیں کیے جا سکتے تھے۔

ہر دلعزیز شاعر جن کی غزلیں میڈیا ہر وقت سناتا رہتا ہو اور وہ پارلیمان کی فضاؤں میں پہچانے جاتے ہوں۔

خوش شکل بیبیاں جن کی تخلیقات کم اور ادائیں زیادہ ہوں، انہیں کانفرنس میں بلائے بغیر چارہ نہیں تھا۔

ثقافت اور ادب کی پروردہ ذیلی تنظیموں نے الگ قیامت ڈھا رکھی تھی۔ اپنی اپنی نمائندگی کے لیے۔۔۔۔

بڑی مشکل سے فہرستیں فائنل کی گئیں۔ بار بار جائزہ لیا گیا۔ تسلی ہوئی کہ جینوئن ادیبوں کی بڑی تعداد بھی مندوبین میں شامل ہے جنہوں نے خونِ جگر سے لفظ اور جملے تراشے ہیں اور زندگی نظریے پر وار دی ہے۔ لیکن جس طرح سینما ہال کی فرسٹ کلاس میں شائقین کم ہوتے ہیں اور زیادہ تماش بین تھرڈ کلاس میں بیٹھتے ہیں اسی طرح سیاست اور ادب کے سینما ہال میں بھی LCD پر VIDEO دیکھنے والوں کی تعداد کم ہوتی ہے زیادہ تر بوسیدہ پردے پر ہی فلم دیکھنا Afford کرتے ہیں۔ شب زاد کے لیے قومی ادبی کانفرنس میں مہمان کی سیٹ تک بھی ملنا ناممکن تھا۔ مندوب کی نشست دینا تو ایک بے حجاب سچ ہے جسے تسلیم کرنا آسان نہیں۔

وہ گمنام نہیں تھا مگر گم شدہ ضرور تھا۔ اہلِ قلم اس کے گہرے سخن سے واقف تھے۔ وہ علاقائی زبان میں دلکش شعر کہتا تھا۔ اہلِ قلم اس کی مالی تنگی سے واقف تھے لیکن اُسے کوئی بھی فائدہ نہیں پہنچاتے تھے۔ حکومتی پالیسیوں میں جب بھی نادار ادیبوں کی بہبود کا ایجنڈا بنتا، ایوانوں میں گھسے ہوئے بااثر ادیب اس کا پتہ صاف کر دیتے چنانچہ شب زاد کو کوئی سرکاری زمین، انشورنس یا وظیفہ کچھ بھی نہیں ملا تھا نہ اس کی کوئی مستقل ملازمت تھی۔ اس کا کوئی گھر نہیں تھا اس لیے اس نے گھر نہیں بسایا تھا۔ وہ دنیا میں اکیلا تھا۔۔۔ لیکن اس نے کسی سے ہم نشینی کی درخواست بھی نہیں کی تھی۔ اس کی شاعری ادبی محفلوں میں زیرِ بحث آتی تھی۔ اس کے مداح مارکیٹ کے وہ لوگ بھی تھے جہاں ایک دکان پر وہ کاروباری بورڈز لکھا کرتا تھا۔ اس کا اپنا خط سیدھا تھا لیکن حالات کے خطوط ٹیڑھے میڑھے تھے۔ اپنی دلکش خطاطی سے وہ دکانوں کے بورڈز، بینرز اور فلمی پوسٹر لکھا اور سجایا کرتا تھا اسی سے اس کی عام سی گذر بسر ہو رہی تھی۔ لیکن اُسے سب سے زیادہ مزا نیم پلیٹس لکھنے میں آتا تھا۔

کسی کا نام جب گھر کی پیشانی پر جگمگاتا ہے تو آسمان کا چاند خود کو میلا سمجھنے لگتا ہے۔ بہر حال بات کہیں سے کہیں چلی گئی ہے۔ سلیکشن کمیٹی جب اپنا کام کر چکی تو ایک رکن نے دبے لفظوں میں شب زاد کی علاقائی زبان میں موجود کتابوں کا ذکر کر دیا اور کوشش کی کہ اُسے بحیثیت مندوب علاقائی زبان کانفرنس میں بلایا جائے۔ ڈی۔ جی۔ فوراً بولے۔

بھئی اس کی کتابیں ہمارا ادارہ ہی تو چھاپتا رہا ہے۔ اس کے اپنے پاس کہاں وسائل تھے؟

یہ تو ہمارے فیور کی بات ہے سر۔ بحیثیت مندوب وہ ہمارے ادارے کی تعریف ہی تو کرے گا اشاعت کے سلسلے میں۔

یہ ضروری تو نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے روسٹرم پر آ کر وہ دل کے جلے پھپھولے پھوڑنے لگے اور اپنی غربت کی وجہ ادبی اداروں کو قرار دے دے۔ اس سے تو خواہ مخواہ ہماری سبکی ہوگی۔

ویسے سر اُسے ایک بار ٹیلی وژن والوں نے اپنے کسی پروگرام میں بلایا تھا تا کہ وہ ادیب کو درپیش مسائل پر روشنی ڈال سکے لیکن وہ پروگرام میں کوئی

حرفِ شکایت زباں پرنہیں لایا۔''ایسے اعتماد سے بیٹھا تھا جیسے ہاری نہ ہو وڈیرا ہو''
''اچھا پر میٹنگ وائنڈ اپ کرتے ہیں'' ڈی۔جی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے تو درباری بھی مودبانہ جھک گئے اور شب زاد کا تذکرہ رات کی تاریکی میں کہیں سوگیا۔

ادیبوں کی کانفرنس بڑے طمطراق سے شروع ہوئی اور بڑے بڑے ایوارڈز بھی تقسیم کیے گئے۔ علاقائی شاعری پر بہترین کتاب کا ایوارڈ کسی نتھو خیرے کو مل گیا۔شب زاد کو خبر ملی اُسے کوئی دُکھ نہیں ہوا۔دکھ تو امید کی کوکھ سے جنم لیتا ہے اور امید کا رحم سوکھا ہوا تھا اس کے اندر۔۔۔

وہ بورڈ لکھتا تھا۔ٹریڈرز کے بورڈ، سیاسی نعروں کے بینرز، فلمی پوسٹرز، نیم پلیٹس۔۔۔اچانک ایک روز اُسے اپنے نام کی پلیٹ لکھنے کی سوجھ گئی۔ بڑا اعزاز ہوتا ہے انسان کے لیے اس کا نام۔۔۔اس نے جب کسی کا نام لکھا وہ نیم پلیٹ اس کی نظر میں معزز ہوگئی۔۔۔اس نے اپنا نام ایک ہی بار لکھا ہوا دیکھا تھا، اپنی اکلوتی کتاب کے سرورق پر۔۔۔جب سرکاری ادارے نے اس سے ہمدردی کرتے ہوئے یہ چھوٹی سی کتاب چھاپ دی تھی لیکن اُسے کچھ نہیں ملا تھا کتاب کے چھپنے کے بعد۔۔۔اب شب زاد نے سوچا وہ اپنی نیم پلیٹ لکھے گا۔۔۔اپنا نام خود سجائے گا۔۔۔لیکن جلد ہی اُسے محسوس ہونے لگا یہ آسان کام نہیں ہے۔اُسے اپنے نام کی وقعت کے برابر میٹریل نہیں مل رہا تھا۔ پہلے تو کئی برس تک وہ معیاری پلیٹ ہی ڈھونڈتا رہا۔جب وہ ملی تو اچانک اپنا نام ہی بھول گیا۔میرا نام کیا ہے؟

بے شمار لوگوں سے پوچھتے پوچھتے جب ہلکان ہوگیا تو ایک لڑکی نے اسے اس کا نام بتا دیا۔وہ لڑکی کا بے حد شکر گزار ہوا لیکن اس کے پاس ٹھہرنے کا وقت نہیں تھا۔اُسے اپنی نیم پلیٹ لکھنا تھی۔ وہ جلدی جلدی اپنے ٹھکانے پر آیا اور اپنے نام کی ایک شاہکار نیم پلیٹ تخلیق کی۔اس کے سارے خواب اس کی نیم پلیٹ پر مہک رہے تھے۔اس نے اپنی نیم پلیٹ کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر دیر تک رقص کیا، ناچتے ناچتے جب وہ گرا تو سوال یوں اس پر کھلا:

''وہ اپنی نیم پلیٹ لگائے گا کہاں؟''

۔بقیہ۔ کپوت

اور پرانے اخبار میں بھلا فرق ہی کتنا ہے۔لیاقت خوف زدہ رہتا کیا صحافیوں سے معلومات حاصل کرنے کے لیے ان کے جسم میں گولیاں اتارنا ضروری ہے، کیا علم بندوق کی گولیوں ہی کے ذریعے باہر آتا ہے۔ یہ زخم تازہ ہی تھا کہ صحافی عبدالحق کو خضدار سے اٹھا لیا گیا۔اس کا انجام دیگر صحافیوں سے مختلف نہ تھا۔لیاقت کو پریشان دیکھ کر ریحانہ اس کا حوصلہ بڑھایا کرتی۔''جس گولی پہ نام نہ لکھا ہو اس سے کوئی نہیں مرتا۔میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں''۔ ہائی کورٹ نے پابندی لگا دی کہ کوئی اخبار بیان نہیں چھاپے گا۔لیاقت کڑھتا رہا سارے راستے مسدود ہوئے جاتے تھے۔

''یہ کیسی پابندی ہے، ہمیں بلاتے، سنتے، تحفظ دیتے، یہ یک طرفہ فیصلہ ہے''۔ایک سینئر رپوٹر نے تبصرہ کیا ''چیف جسٹس کا رپوریٹ لاء کا آدمی ہے۔ایک روز بھی ہائی کورٹ میں پریکٹس نہیں کی''۔

لیاقت کو تعجب ہوا ''اسے کس قانون کے تحت لگایا؟''

سینئر رپورٹر بڑا ہی بیزار ہوا ''معین قریشی اور شوکت عزیز کو باہر سے کس نے بلوا کر وزیراعظم لگایا۔ایوب، یحیٰ، ضیاءالحق اور مشرف کو کس نے صدر بنایا مجھے کیا پتہ۔ میں اپنی جان کی خیر مناؤں یا لانے والوں کو ڈھونڈتا پھروں۔ میں صحافی ہوں یا کھوجی''۔

صحافیوں کا ہنگامی اجلاس ہوا کہ لائحہ عمل طے کیا جائے۔ بیانات کی اشاعت پر تو نہیں عدالت کے جرم میں چھ ماہ قید ہوگی اور نہ چھاپنے پر سزائے موت۔اکثر صحافیوں کا اجماع تھا کہ چھ ماہ قید کاٹ کر بچوں کے ہمراہ جیتے تو رہیں گے۔

لیاقت نے چپ چپاتے دفتر سے اپنا سامان سمیٹا نوشیروان کو ہمیشہ کے لیے خیر آباد کہہ کر دفتر سے نکل آیا۔روح بھی تو جسم کو الوداع کہے بنا ہی چلی جاتی ہے۔جس جسم میں وہ بلا کرایہ برس ہا برس رہتی ہے۔لیاقت نے حبیب نالے کے پل موٹر سائیکل روک لی یہیں شہر دولخت ہوتا ہے۔یہی نالہ دو جڑواں شہروں کا سنگھم ہے۔اس نے صحافی والی پلیٹیں اتار کر نالے میں پھینک دیں۔صحافی والا طوق گلے سے اتار کر نالے میں اچھال پھینکا۔قریبی دکان سے نئی سم موبائل میں ڈلوا کر اس نے گھر کی راہ لی۔ایک عرصہ بعد وہ پاؤں پھیلا کر سویا۔اگلی صبح لیاقت بمعہ موٹر سائیکل کے غائب تھا۔جس پر سبھی کو حیرت ہوئی۔ابا جی جب طوفان میل ہوٹل پہنچا تو ٹھٹھک کے رہ گیا۔لیاقت ڈھابے کے دخل پر بیٹھا ہوٹل چلا رہا تھا۔

☆

۱۔ پیون فی: سفید آنکھیں یعنی بے مروت ۲۔چغل چک: چمگادڑ ۳۔دخل: کاؤنٹر

''گھمن کا گھونسا''

نجیب عمر

(کراچی)

''مجھ پر پستول تانے کھڑے ہو اور کہتے ہو آپ کی بڑی عزت کرتا ہوں، بھئی واہ''۔

''آپ میری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتا ہوں''

''کیوں ہٹے کٹے ہو، حلال کی روکھی سوکھی بھی کھا سکتے ہو''۔

''جو کچھ میں آپ کو سمجھانا چاہتا ہوں، آپ سمجھنا نہیں چاہتے''

''میں خوب سمجھتا ہوں، نہ تمہارا کوئی کردار ہے نہ تمہیں نام و نمود کا پاس ہے۔ پیسہ ہی تمہارا خدا ہے''۔

''پیسہ ہم سب کی ضرورت ہے۔ آپ کو بھی چاہیے اور جو کچھ آپ کے پاس زیادہ ہے میں لینے آیا ہوں۔ آپ مزاحمت کر کے اپنا ہی نقصان کریں گے''

''ظاہر ہے ہتھیار نے تو تمہیں سکندر بنا دیا ہے۔ لیکن ایک غلطی تم سے ہو چکی ہے کہ تم یہاں سے کچھ حاصل نہیں کر سکتے چونکہ میرے پاس ہے ہی کچھ نہیں''۔

''رہنے دیں کوئی بھی آسانی سے لٹنے کو تیار نہیں ہوتا۔ ایسے ہی بہانے تراشے جاتے ہیں لیکن میں اپنے تجربے کی بنا پر بڑی آسانی سے سب کچھ حاصل کر لیتا ہوں''۔

''تم کوشش کر کے دیکھ لو تو تمہیں مایوسی ہوگی''

''دوسرے کمرے میں تمہارا آٹھ سالہ بیٹا ایاز سو رہا ہے''۔

''تم میرے بیٹے کو ہاتھ نہیں لگا سکتے''

''مجھے کون روکے گا''

''کیا تم معصوم بچے پر بھی ترس نہیں کھاتے''۔

''یہ کتابی باتیں کر کے تم میرا وقت ضائع نہ کرو۔ تم تو ہو ہی لکھاری میں تمہاری اصلیت سے خوب واقف ہوں۔ ساری دنیا کے لیے نصیحتیں، تمہارے قول و فعل میں کتنا تضاد ہے، تمہیں آئینہ دیکھتے ڈر نہیں لگتا''

''ہاں میں ادیب ہوں، ادب کی، انسانیت کی خدمت کر رہا ہوں''

''خدمت، بھئی واہ۔ تم اس کی بجائے کوئی اور کام کیوں نہیں کر لیتے، تمہاری بیوی بچوں کا بھلا ہوگا''

''تم مجھے ڈکٹیشن دینے والے کون ہوتے ہو''

''تم بھول جاتے ہو، تمہیں یاد دلانا پڑتا ہے کہ میرے ہاتھ میں بھرا ہوا پستول ہے۔ چلو اب جلدی سے اپنی جمع پونجی لے آؤ میرا وقت برباد مت کرو''۔

''میں نے پہلے ہی بتا دیا ہے میرے پاس کچھ نہیں۔ ایک ادیب کے پاس ہو بھی کیا سکتا ہے''

''تم مجھ سے کچھ چھپا نہیں سکتے۔ میں جانتا ہوں۔ بعض لوگوں کی ستائش بر سرِ اقتدار لوگوں کی تعریف، کسی کے لیے ذم اور دشنام لکھنے سے بھی تم باز نہیں آتے''

''نہ جانے تم کیا بکواس کر رہے ہو۔ میں ایک کھرا ادیب ہوں''۔

''ہر ادیب و شاعر خود کو کھرا سمجھتا ہے لیکن میری طرح کچھ لوگ تمہاری حقیقت سے خوب واقف ہوتے ہیں''۔

''خیر، میں دوسرے کمرے سے تمہارے بیٹے کو لے آتا ہوں۔ تمہاری بیوی خود بخود آ جائے گی۔ پہلے اسے کے گھٹنے میں گولی مار کر اسے زندگی بھر کے لیے اپاہج بنا دوں گا اس کے بعد بھی تم نے میری بات نہیں مانی تو اسے گولی مار دوں گا۔ یہ بے آواز پستول ہے۔ تم خاطر جمع رکھو کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ ایک اور بات تمہیں بتانا چاہتا ہوں تاکہ تمہاری تسلی ہو جائے۔ باہر پولیس کھڑی ہے۔ وہ تمہاری نہیں میری حفاظت کے لیے ہے۔ وہ مجھے ساتھ لے کر جائے گی۔ اس کا بھی حصہ ہے اب تو فیصلہ کر لو''

''حکم تو تم صادر کر رہے ہو، میں کیا فیصلہ کر سکتا ہوں لیکن ٹھہرو بیوی کے پاس کچھ زیور ہیں میں لائے دیتا ہوں لیکن اس کے بعد تم شرافت سے چلے جاؤ گے''۔

''تم نے صحیح کہا مرے علاوہ شرافت کا مظاہرہ کون کر سکتا ہے۔ باقی تو سارے کمینے ہیں بشمول تمہارے''

''تم نے مجھے پہچانا نہیں''

''کون ہو تم؟''

''میں تمہارے ناول کا ایک کردار ہوں جسے تم نگیٹو کردار کہتے ہو۔ تم مرے خالق ہو، میرے اندر جتنی بدی اور خباثت بھری ہے تمہارا تخلیق کردہ ہے۔ میرا نام گھمن ہے۔ تمہارے ناول کا یہ جملہ تو بہت مشہور ہے جسے میں اکثر دہراتا ہوں ''گھمن کا گھونسا'' تم مجھے نہیں پہچانتے''۔

''تو اپنے خالق کے ساتھ تمہارا یہ رویہ مناسب ہے''

''تم خالق ہو لیکن خدا نہیں۔ میں چاہتا ہوں تم بھی مزہ چکھو اس کڑواہٹ کا جو تم اس کمرے میں بیٹھ کر تیار کرتے رہتے ہو۔ تم نے کامنی کو میرے ہاتھوں کوٹھے پر بٹھایا۔ تم اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بولو کیا تم اس کے ساتھ

باقی صفحہ ۶۸ پر ملاحظہ کیجیے

''وقت کی شہزادی''

عظمیٰ صدیقی
(لندن)

موسم آج بہت خوشگوار تھا۔ کتنے دن بعد آج دھوپ نے آنکھیں کھول کر اجالے بکھیرے تھے۔ ہر روز لندن کے خنک دھندلکوں میں گہرے سرمئی بادلوں کی شال اوڑھے صبح اداسی لیے مسکراتی اور لندن کے باسی دن بھر صبح اور شام کے منظروں میں کوئی امتیاز ہی نہ کر پاتے لیکن آج تو دھوپ نے ایسی گدگدی کی کہ صبح بھی کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ میری بیٹی کیٹ کی سُستیاں بھی مستیوں میں بدل چکی تھیں۔ بہت دیر تک وہ کمرے میں باریک پردوں سے چھن کر آنے والی دھوپ کے دائروں سے جو ہوا سے جنبش کرتے ہوئے پردوں کے ساتھ کمرے کے فرش پر اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے کھیلتی رہی اور پھر تھک کر قلوپطرہ کی طرح ایک کافرانہ انگڑائی لیتے ہوئے اپنی نرم گداز مسند پر نیم دراز ہوگئی۔

کمرے کی کھڑکی سے مٹھی بھر دھوپ کو آنکھ بھر کے دیکھنا میرے نزدیک حُسنِ فطرت کی توہین تھی۔ چنانچہ تازہ غسل کے فوراً بعد میں کافی کا مگ لیے کنزرویٹری کا دروازہ کھول کر گارڈن میں آ گئی۔ صبح کی تازگی، ہوا کی سبک روی اور پھولوں کی مہک سانسوں میں گھل رہی تھی۔ یہ لندن کی حسین ترین صبحوں میں سے ایک صبح تھی۔ فطرت سے میری دوستی بہت پرانی ہے۔ پھول، کلیاں، ہوا، پرندے، تتلیاں، بادل، دھوپ سب میرے دوست ہیں۔ میں انہیں بہت پیار سے دیکھتی ہوں اور محسوس کرتی ہوں۔ یہ سب میرے احساس، میرے پیار کو جانتے ہیں۔ میری تنہائی کے ساتھی ہیں۔ مجھ سے باتیں کرتے ہیں اور میں انہیں اپنے قصّے سناتی ہوں۔ کبھی یہ میرے آنسو پیتے ہیں تو بارش ہو جاتی ہے کبھی یہ میری ہنسی چھوتے ہیں تو دھوپ کھلکھلاتی ہے۔ کبھی میں اداس ہوتی ہوں تو تتلیاں میرے آنگن میں اتر کر پھول سے خوشبو چرا کر مجھ سے کہتی ہے دیکھو تو زندگی کتنی رنگین ہے۔ کتنی حسین ہے۔ پھولوں کی طرح، خوشبو کی طرح۔ پھر تم کیوں اداس ہو؟ اور میری اُداسی اُن کے رقص میں کھو جاتی ہے۔ میں نے اپنی روح کو فطرت کو سونپ دیا۔ میرا پورا وجود رنگ اور خوشبو میں بھیگتا چلا گیا۔ دھوپ مجھے بھگو چکی تھی اور رنگوں نے مجھے اوڑھ لیا تھا۔ سرخ، سفید، نیلے، اودے پھولوں کے رنگوں نے میری ہم جولی تتلیوں اور میرے دوست پھولوں نے میری پیار بھری آنکھوں کو چوما اور میں نے اُن کی ہنسی پر اپنا دل رکھ دیا۔

چلو باہر کھلی فضا میں چلیں۔ ہوا نے میرا ہاتھ تھام کر کہا۔ تتلیوں نے سوال کیا۔ کیا خیال ہے آنکھ مچولی کھیلیں؟ وہ گھاس کا بڑا سا میدان جو گھر کے پیچھے ہے آ جاؤ تم بھی اُدھر۔۔۔ ہم وہی جا رہے ہیں۔ سرخ گلابی پھولوں کے پاس ملاقات کریں گے۔ تتلیاں ہنستی کھیلتی، ڈولتی گھاس کے میدان کی طرف نکل گئیں۔ میں نے تو نہ کبھی فطرت کی بات ٹالی نہ اپنے ان دوستوں کی۔ کافی کا آخری گھونٹ ختم کر کے میں نے صبح کے تین رنگوں والا لباس پہنا۔ آپ پوچھیں گے بھلا صبح کے تین رنگ کونسے ہیں۔ سفید، نیلا اور ہلکا گلابی۔ سفید اُجالے کی علامت، نیلا رنگ زندگی کی اور گلابی تازگی اور شادابی کی۔ صبح کے تین رنگوں والا لباس پہن کر، شیشے کے سامنے میں نے مسکرا کے خود کو نہیں ان تینوں رنگوں کو ستائشی نگاہوں سے دیکھا اور اپنی پسند کی چند کتابیں اٹھا کر گھر سے نکل کر اس سبز میدان اور سرخ گلابی پھولوں کے کنج کا رخ کیا جہاں میرے دوست پھول، خوشبو، تتلی، ہوا، رنگ سب میرے منتظر تھے۔ تھوڑی دیر تک تو ہم نے ایک دوسرے سے آنکھ مچولی کھیلی پھر حسبِ عادت میں قریب کی بینچ پر اپنے ساتھ لائی کتاب لے کر بیٹھ گئی۔ میں کتاب کی سطروں سے نظر اٹھا کر کبھی کبھی سرخ گلابی پھولوں کی ہنسی سن کر مسکرا دیتی جو تتلیوں کی گدگدی پر اور ہوا کی شرارتوں سے لجاتے، لہراتے اور کھلکھلاتے کتنے پیارے لگ رہے تھے۔

سبز گھاس کے اس وسیع میدان میں حدِ نگاہ تک پھولوں کے تختے اس ترتیب سے تھے کہ سبز گھاس کی روشوں پر چلنے والوں کو یوں لگتا کہ جیسے پھول اُن کے ہر قدم کو چُومتے چلے جا رہے ہیں۔

''کیا تمہارے پاس وقت ہے''

''میں تم سے بات کر سکتی ہوں؟''

میں چونک کر اُس آواز کی طرف مڑی تو میں نے دیکھا۔ اُس نے بھی میری طرح تین رنگوں والا لباس پہن رکھا تھا۔ اُس کی گلابی رنگت پر یہ لباس خوب کِھل رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں ستاروں کی طرح روشن اور اُس کے ہونٹ ڈیزی کے پھولوں کی طرح نازک گلابی تھے۔

''ہاں کیوں نہیں۔۔۔ میرے پاس بہت وقت ہے۔ میں اُسے بانٹنا چاہتی ہوں''۔ جیسے آج سورج دھوپ بانٹ رہا ہے اور ہوا خوشبو اور پھول رنگ۔۔۔ میری مسکراہٹ نے بڑھ کر اُس سے مصافحہ کیا۔

''لیکن اس شہر میں تو وقت کی بہت کمی ہے''

''کوئی کسی کی بھی نہیں سنتا''

وہ ستاروں جیسی آنکھوں والی لڑکی اداسی سے مسکرائی۔

''ہاں تم نے سچ کہا۔ اس شہر کے لوگ وقت کے معاملے میں بہت غریب ہیں''

''لیکن میں ہوں اس شہر کی امیر ترین وقت کی شاہزادی''

میں نے خوش دلی سے ڈیزی جیسی رنگ والی لڑکی سے کہا۔

''تم کب سے اس شہر میں ہو'' اُس کے لہجہ میں تجسس اور آنکھوں

میں خلوص گھُل مل رہے تھے۔

''زمانوں سے۔۔۔مجھے اب سال اور دن یاد نہیں رہتے''

''کیونکہ سال اور دنوں کی قید میں رہنے والے وقت کے اسیر ہو جاتے ہیں۔۔۔اور مجھے اپنی آزادی بہت عزیز ہے۔۔۔میں اسے وقت کو بھی نہیں دے سکتی''۔۔۔میں نے اُس کے مخلصانہ تجسس کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''ہمارا ایک دوسرے سے تعارف نہیں ہوا۔۔۔تم نے میرا نام بھی نہیں پوچھا''۔اُس نے تعارف کی دستک سے پہچان کا دروازہ کھولنا چاہا۔

''ستاروں کی آنکھوں والی لڑکی''۔یہی نام ہے نا تمہارا۔میں نے ہنس کر کہا۔

''ہوں۔۔۔اور میں بتاؤں۔۔۔تمہارا نام بھی مجھے معلوم ہے''

اب وہ حیرت اور خوشی لیے بے تکلفی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی تھی۔

''ہاں بتاؤ۔۔۔کیا نام ہے میرا؟''

میں بھی اُس کی بے تکلفی کا خوش دلی سے خیر مقدم کر رہی تھی۔

''دوست تمہارا نام یہی ہونا چاہیئے''اُس کی مسکراہٹ میں کتنا اعتماد تھا۔

''اچھا تو تم بھی جان گئیں۔۔۔تمہیں کس نے بتایا میرا نام۔۔۔''

میں نے حیرت سے پوچھا۔

''تمہارے دوستوں نے۔۔۔ وہ دیکھو اُس نے گلابی، سرخ پھولوں کی طرف اشارہ کیا۔۔۔''اور اُن تتلیوں نے'' اُس نے سفید پروں والی سرخ پھولوں پر منڈلاتی شوخ تتلیوں کی طرف اشارہ کیا۔۔۔''اور اس نے بھی'' اُس نے مٹھی کھول دی۔۔۔وہ جگنو تھا شاید۔۔۔لیکن مجھے تو وہ دن میں بھی نظر آ جاتا ہے اس لئے تعجب نہیں ہوا۔

''تمہیں معلوم ہے کہ اس شہر میں اتنی خوبصورت صبح اتنے سارے دنوں بعد کیوں آئی''۔اُس نے مشکل اور قابل توجہ سوال کیا تھا۔

''نہیں مجھے نہیں معلوم''۔تم بتاؤ آج اتنا خوبصورت دن کیوں نکلا ہے؟ میں نے اُس کا سوال اُسی کو لوٹا دیا۔

''لندن کی دھوپ نے آج اس لیے آنکھیں کھولی ہیں کیونکہ آج تمہارے جیسے کچھ اور لوگ بھی شہر میں آ گئے ہیں۔۔۔وہ یہاں اس سبز میدان میں بس پہنچنے ہی والے ہیں۔۔۔فطرت کے دوست۔۔۔ چاند تاروں کے ساتھی۔۔۔تتلیوں کے ہم جولی۔۔۔کتابوں اور حرفوں سے محبت کرنے والے''

''سچ''ایسے لوگ کہاں ہیں اور کب آئیں گے۔۔۔ میں نے بیتابانہ پوچھا۔

''وہ دیکھو اُن سبز روشوں کی طرف'' اُس نے ایک سمت کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے دیکھا سبز روشوں پر قطار در قطار وہ ایک چھوٹے سے کارواں کی صورت گزر رہے تھے۔اُن کے چہرے آفتاب کی طرح روشن تھے۔ اُن کی پیشانیوں پر صبح کے نور کا اجالا تھا۔۔۔اور اُن کی آنکھیں ستاروں جیسی آنکھوں والی لڑکی سے بالکل ملتی جلتی۔۔۔ نیلے اور گلابی رنگوں والے۔۔۔ زندگی، تازگی، شادابی اور اجالے کی علامت لیے ہوئے۔

دھوپ، موسم، فطرت، زندگی کتنی خوبصورت ہے میں کیوں اداس رہتی ہوں؟۔۔۔شہر زندہ ہے ابھی۔۔۔لوگ خوبصورت ہیں ابھی۔۔۔آفتاب جیسے روشن چہروں والے۔۔۔ خوشبو جیسے لہجوں والے، پھولوں جیسی باتوں والے۔۔۔ یہ لوگ زندگی کی۔۔۔محبت کی۔۔۔رعنائی کی اور حُسن کی علامت ہیں۔۔۔اور حسن نیکی ہے اگر حسن سچائی ہے تو وہ لازوال ہے۔

لندن کی خنک فضاؤں میں اس مہکتی دھوپ بھری صبح کو میں نے محبت سے دعا دی۔

اس شہر بلکہ پوری دنیا کو اجالوں کی ضرورت ہے۔۔۔دھوپ کی ضرورت ہے۔۔۔معصومیت اور پاکیزگی کی ضرورت ہے۔۔۔

خدا کرے کہ یہ صبح بار بار آئے

خدا کرے یہ صبح یہیں ٹھہر جائے

میں نے یہ دعا گنگنائی تو میرے ساتھ بیٹھی میری ہمزاد ستاروں جیسی آنکھوں والی لڑکی نے آمین کہا اور فضا میں سفید، نیلے، پیلے، گلابی، سبز اور جامنی رنگوں کی کہکشاں طویل حصار کھینچ کر ہماری ہاں میں ہاں ملانے لگی۔۔۔

۔بقیہ۔ گھمن کا گھونسا

شب بسری کے خواہش مند نہیں تھے۔ میں تمہارے اندر کی کالک کو خوب جانتا ہوں''۔

''تمہارے ناول کی کامیابی میں میرا بھی بڑا حصہ ہے۔ تمہارے ہیرو اور ہیرئنوں کو لوگ بھول چکے ہیں۔انہیں یاد ہے تو صرف گھمن، دلاور، جی دار۔جس کا وار کبھی خالی نہیں جاتا۔یاد ہے نا تمہیں''

''ہاں ہاں میں نے تمہیں تخلیق کیا۔دنیا کو بتانے کے لیے کہ برائی کیا ہے۔یہ کہاں سے جنم لیتی ہے۔اس کا انجام کیا ہوتا ہے''

''وہ تو تم سب بتا چکے۔اپنا ناول فروخت کر چکے۔اس کامیابی کے بعد لوگ تم سے نئے ناول کا تقاضا کر رہے ہیں۔تمہاری کامیابی میں میرا بھی حصہ ہے۔وہی لینے آیا ہوں۔تم پریشان کیوں ہو۔

''جاؤ زیور لے آؤ۔میں سونے کی مقدار دیکھ کر ہی جانے کا فیصلہ کروں گا۔اگر تم نے ڈنڈی ماری تو اپنا ہی نقصان کرو گے بتائے دیتا ہوں''

پلنگ سے اٹھتے ہی اس کی آنکھ کھل گئی اور وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

O

''زندان کا قیدی''

انتظار باقی (جھنگ)

دشتِ پُر خار میں کب ایسے فنا ہو جاتا
دو قدم اور اگر چلتا ، خدا ہو جاتا

خشک آنکھوں کے کسی کونے میں تھا ایک ہی اشک
کاش زندان کا قیدی وہ رہا ہو جاتا

مطلعٔ دل پہ طُلوع ہوتا اگر تیرا خیال
خون کا رنگ کبھی رنگِ حنا ہو جاتا

ایک دیوار زمانے نے اٹھائی ، لیکن
ماس، ناخن سے بھلا کیسے جدا ہو جاتا؟

چٹکی بھر ایک تجلی کا سبب تھا، ورنہ
سینۂ طور فقط کوہِ ندا ہو جاتا

بے کراں حزن کی ایک لہر اُٹھی تھی دل میں
اشک گرتا نہ، تو سینے میں خلا ہو جاتا

اس لیے بڑھنے نہ دی اتنی حرارت ہم نے
موم کا شہر تمازت سے فنا ہو جاتا

راز افشاں نہ ہُوا طُور پہ شاید یوں بھی
راز کھل جاتا اگر، حشر بپا ہو جاتا

خاک ہو جاتا مرا جسم غمِ ہجراں میں
اس سے زیادہ مری تقدیر میں کیا ہو جاتا

پُورے قد سے میں کھڑا ہوتا اگر باقیؔ جی،
رات کی اونچی فصیلوں سے بڑا ہو جاتا

سید مشکور حسین یاد

(لاہور)

صبح سویرے کی دھڑکن سے اپنے آپ کو بُوجھا ہے
ہم نے اُجالوں کی چلمن سے اپنے آپ کو بُوجھا ہے

گھڑی میں ماشہ گھڑی میں تولہ گھڑی میں توپ کا گولہ
ہم نے لمحوں کے چھٹن سے اپنے آپ کو بُوجھا ہے

آنکھوں میں یہ آتے ہیں تو شمس و قمر بن جاتے ہیں
ہم نے آنسوؤں کے بن ٹھن سے اپنے آپ کو بُوجھا ہے

جب اُس شوخ نے ہم کو دیکھا ایک ادائے خاص کے ساتھ
تب کہیں جا کے تن من دھن سے اپنے آپ کو بُوجھا ہے

یادؔ غرور نے کیا کیا جادو چلائے ہم پہ چل نہ سکے
اکڑی ہوئی اک اک گردن سے اپنے آپ کو بُوجھا ہے

○

سُرورانبالوی

(راولپنڈی)

کر کے تزئینِ زمین و آسماں گُم ہو گیا
ثبت کر کے اپنے قدموں کے نشاں گُم ہو گیا
حسن ڈھلتی چھاؤں تھا رویا گلے مل کر اُسے
وقت کے صحرا میں لیکر سسکیاں گُم ہوگیا
رتجگوں میں جس سے روشن تھیں چراغوں کی لویں
حیف وہ بھی جگنوؤں کے درمیاں گُم ہوگیا
دانش و حکمت کا پیکر بھی جنونِ شوق میں
چُنتے چُنتے ساحلوں پر سیپیاں گُم ہو گیا
ہم اسیرانِ قفس کی کم نصیبی دیکھئے
جس گھڑی لوٹے قفس سے آشیاں گُم ہو گیا
ایک بچہ جو کھلونوں کو ترستا تھا سدا
گھر سے نکلا تھا پکڑنے تتلیاں گُم ہو گیا
گاؤں میں بیوہ نے اُمیدوں سے پالا تھا جسے
شہر کی رنگینیوں میں وہ جواں گُم ہو گیا
ولولے لیکر ملازم مِل میں لڑکا ہوا
بن کے وہ اک روز چمنی کا دھواں گُم ہو گیا
آئینہ احساس کا سُولی پہ ہے لٹکا ہوا
اور ضمیر انسان کا جانے کہاں گُم ہو گیا
مکڑیوں نے وقت کی آنکھوں پہ جالے تن دیئے
حرفِ حق بھی مصلحت کے درمیاں گُم ہو گیا
جس کے لفظ ''کُن'' کا مظہر ہے جہانِ رنگ وبُو
وہ بھی شوکیسوں میں رکھ کر پتلیاں گُم ہو گیا
گلستاں سے اُڑ گئے پنچھی سُرور انبالوی
ڈھونڈنے نکلا تھا اُن کو باغباں گُم ہو گیا

آصف ثاقب

(بوئی، ہزارہ)

نگاہِ معتبرِ یار سے نہیں اُترے
ہم اپنے پیار کے معیار سے نہیں اُترے

کھڑے ہوئے ہیں شکستہ اَنا کی ہمّت سے
وہ سر جو آپ کی تلوار سے نہیں اُترے

خبر ہے صبر کے میٹھے پھلوں کے بارے میں
خرابِ شاخ ہیں اشجار سے نہیں اُترے

ہوئے شہید تو پیکار میں گرے ہیں ہم
کہ ہار مان کے رہوار سے نہیں اُترے

ہم اپنی موج میں غرقاب ہوگئے تھے وہاں
بھنور میں موت کے اصرار سے نہیں اُترے

ہوا نے کھول دیئے پیچ پھر بھی اتنا ہے
وہی ہیں رنگ جو دستار سے نہیں اُترے

پرندے دھوپ میں ہلکان ہو گئے ثاقبؔ
خیالِ سایۂ دیوار سے نہیں اُترے

○

محمودالحسن
(راولپنڈی)

رہرو رہِ الفت پہ رواں اور بھی ہوں گے
ہاتھوں میں لئے ہدیہ جاں اور بھی ہوں گے

اک تم ہی نہیں راہِ محبت میں پریشاں
محرومِ طلب غمزدگاں اور بھی ہوں گے

دعویٰ محبت بھی بہت خوب ہے لیکن
اُلفت کو پرکھنے کے نشاں اور بھی ہوں گے

سچ کہہ کے ضروری تو نہیں دلشکنی بھی
سچ بات کے اندازِ بیاں اور بھی ہوں گے

اک تُو ہی نہیں آج مرے حال پہ گریاں
کچھ دیدۂ خُونابہ فشاں اور بھی ہوں گے

مشکل ہی سہی منزلِ جاناں مگر اے دل
اس راہ میں قدموں کے نشاں اور بھی ہوں گے

غمہائے کم و بیش میں عُمر اپنی گنوا دی
کچھ سود و زیاں ہمنفساں اور بھی ہوں گے

بس ایک جھلک اے مرے دلدار کہ مجھ سے
کچھ لوگ گرفتار گماں اور بھی ہوں گے

آخر کوئی حد بھی ہے کہیں ظلم و ستم کی
کہتے ہو ستم اور بھی ہاں اور بھی ہوں گے

دیوانگیِ عشق سلامت ہے تو محمودؔ
احوالِ غمِ عشق بیاں اور بھی ہوں گے

غالب عرفان
(کراچی)

صفت میری لفظوں میں جادوگری کی
مجھے ڈھونڈتی ہے کہانی پری کی

زمیں زاد ہو کر بھی میں سوچتا ہوں
ہواؤں کی رفتار سے ہمسری کی

وہاں اب نہیں داخلے کی اجازت
کٹی عمر ساری جہاں افسری کی

کبھی آندھی بارش ، کبھی تپتا صحرا
یہی داستاں ہے مری بے گھری کی

میں پتھر کے ذرّات پگھلا رہا ہوں
وراثت ملی مجھ کو شیشہ گری کی

جو عرفانؔ کا رُخ ہو روشن جہاں میں
نظر آئے صورت بھی کچھ عبقری کی

○

یوگیندر بہل تشنہ

(دہلی، بھارت)

زندگی بہر طور گزرنے کے لیے ہے
اے دوست تو یہاں کیا کرنے کے لیے ہے

رہتا ہے سحروشام کیسی الجھنوں میں تُو
کیا یہی کچھ تُو یہاں کرنے کے لیے ہے

کرلے ایسے کار، تجھے یاد کریں لوگ
ذرا سوچ تو کیا رونے، کُڑھنے کے لیے ہے

آیا ہے تُو وقت گزاری کے لیے کیا!
کیا یہ زندگی جینے مرنے کے لیے ہے

کون جانے کب آجائے ترا حکم روانگی
جلد یہ دیر تو یاں سے گزرنے کے لیے ہے

تیرے کرم ہیں باندھ کر لائے تجھے یہاں
حساب سزا و جزا تو بھرنے کے لیے ہے

کہتے ہیں یہ جسم ہے اشرف المخلوقات
کر کار وہی جو اشرف کے کرنے کے لیے ہے

تشنہ نہ رہے جو بھی تیرے قرب سے گزرے
ایسے ہی کچھ کار تیرے کرنے کے لیے ہے

ہمدرد بن، پیار بانٹ، اپنا غم چھپا
دولت بٹور، جو ساتھ جانے کے لیے ہے

کر زندگی تُو صورتِ گلزار اے تشنہؔ
یہ کرم بھومی ہے، نیکیاں بھرنے کے لیے ہے

پروفیسر خیال آفاقی

(کراچی)

ترے ہزار بہانے، مرا بس ایک سوال
ترا نہیں ہوں اگر میں تو پھر ہوں کس کا خیال

کیا سوال کہ تم عشق کیوں نہیں کرتے؟
دیا جواب کہ کیا زندگی ہے ایسی وبال؟

سوال یہ تھا کہ یہ عشق کیا بلا ہے جناب؟
ملا جواب کہ کرتے نہیں فضول سوال!

سوال یہ بھی کیا میں نے کون ہوں کیا ہوں؟
جواب آیا کہ تو اپنے دل سے ''میں'' کو نکال

سوال ہی میں نہیں جب کلیم کا سا اثر
جواب میں ہو کہاں طور کا سا جاہ و جلال

جواب دینے کی فرصت نہیں کسی کو مگر
ہر اک زبان پہ رہتے ہیں سو طرح کے سوال

میں اس سوال کا آخر جواب کیا دیتا
جو آج بھی ہے مرے واسطے انا کا سوال

سوال کرتے ہیں خود ہی، جواب دیتے ہیں خود
عجیب لوگ ہیں دانشورانِ وہم و خیال

○

نسیم سحر

(راولپنڈی)

کچھ رسومات و روایات کا مجموعہ ہے
زندگی کتنے تضادات کا مجموعہ ہے !

شہر کچھ خستہ عِمارات کا مجموعہ ہے
اور نیا شہر مضافات کا مجموعہ ہے

ٹوٹ سکتا ہے کسی وقت کوئی بھی پتھر
سخت جتنا بھی ہو، ذرّات کا مجموعہ ہے

میری تسبیح کے ہر دانے کی قسمت دیکھو
ایک اِک دانہ عِبادات کا مجموعہ ہے

ایک قطرہ بھی لہُو کا نہیں باقی دِل میں
اب مکمّل مرے ابیات کا مجموعہ ہے

مِل رہا ہے ہمیں اُن سب کا فقط ایک جواب
سامنے جتنے سوالات کا مجموعہ ہے

چشمِ بینا سے کبھی اِس کی تلاوت بھی کرو
جو بھی منظر ہے، وہ آیات کا مجموعہ ہے

یہ کہا پڑھ کے مرے دل کی بیاض اُس نے نسیمؔ
یہ پلندہ تو شکایات کا مجموعہ ہے

جتنے سجدے بھی کئے جائیں اُسے، کم ہیں نسیمؔ
زندگی جس کی عنایات کا مجموعہ ہے

○

''نذرِ غالب''

سری واستو رند (نوئیڈا، بھارت)

قلم چلنے لگا بے ساختہ کیا
کوئی مصرعہ غزل کا ہو گیا کیا

تو تھا قسمت کا لکھا مٹ گیا کیا
تو پھر کیا یاد رکھنا بھولنا کیا

پرانی نسل والے جانتے ہیں
کہ ہم کیا ہیں ہمارا سلسلہ کیا

نہ محبت تھی نہ کوئی تربیت تھی
تو پھر پنجرے کا طوطا بولتا کیا

بزرگوں کی کُلاہیں بیچ ڈالیں
اَنا بکتی نہیں تو بیچتا کیا

ہمارے گھر پہ جو تختی لگی ہے
اُسی پر ہے تمہارا بھی پتا کیا

کہاں لے جائیں گے بیساکھیوں کو
نہیں ہیں پاؤں تو پھر راستا کیا

ہمارے گھر کی دیواریں تو دیکھو
یہاں دیمک نے آخر سے لکھا کیا

وہ اپنا ہی گریباں سی رہا ہے
خدا جانے رفوگر کو ہوا کیا

خودی باقی نہیں تو کچھ نہیں ہے
اَنا باقی نہیں ہے تو بچا کیا

زمیں ''غالب'' کی تھی اور رندؔ تم نے
نہ سوچا کچھ، نہ سمجھا، لکھ دیا کیا

○

حسن عسکری کاظمی
(لاہور)

کوئی بھی کام اب اچھا نہیں ہے
جو کرنا تھا وہی سوچا نہیں ہے

کہی جو بات وہ پوری نہ ہو گی
کہ دل سے جب اسے مانا نہیں ہے

عزیز اپنی انا کو اس نے رکھا
زباں پر سچ مگر رکھا نہیں ہے

بہت دکھ سہہ لئے ہیں اس کے ہاتھوں
کوئی دکھ اب مگر سہنا نہیں ہے

برائی کر کے بھی اچھا رہا وہ!
کوئی اس کو برا کہتا نہیں ہے

وہ جھوٹا ہے کہ سچا کیا بتائیں
ابھی ہم نے اسے پرکھا نہیں ہے

لکھا خط میں حسنؔ حرفِ شکایت
مگر لکھ کر اسے بھیجا نہیں ہے

❍

رؤف خیر
(حیدرآباد، دکن)

جس نے بڑا کیا تھا انہیں پال پوس کے
وہ بچے پالتے ہیں اسے کوس کوس کے

دے دو کسی غریب کسی بے لباس کو
الماریوں میں رکھو نہ کپڑوں کو ٹھونس کے

نیچے چکن مٹن سے اترتے نہ تھے کبھی
اب دن وہ کاٹ لیتے ہیں ٹکڑوں پہ توس کے

اب تم سے کیا بتاؤں سمجھ دار تم بھی ہو
بجھتی ہے پیاس بھی کہیں قطروں سے اوس کے

یہ شاخسانہ حد سے تجاوز ہی کا تو ہے
مٹتے نہیں ہیں فاصلے دو چار کوس کے

بے جا محبتوں کا نتیجہ ہے سامنے
بچے بڑے شریر ہیں میرے پڑوس کے

گم راہ کر بھی سکتے ہیں گم کردہ راہ یہ
ہرگز قدم نہ لے تو کسی دست بوس کے

سیکھو میاں امام بڑی سین بولنا
کب تک یوں ہی گزاروگے ناخن لو ''ہوس'' کے

کھلنے لگی ہیں خیرؔ مری سربلندیاں
احباب رو گئے ہیں کلیجہ مسوس کے

❍

صدیق شاہد

(شیخوپورہ)

اے ہوا تیز ہے تو، خس کی ہے کٹیا میری
سہما بیٹھا ہوں ، بکھر جائے نہ دنیا میری

جن خداؤں کو میں معبود سمجھ بیٹھا ہوں
بیچ منجدھار ڈبو دیں نہ یہ نیّا میری

اس کی لہروں میں جو اترا تو گلے ملنے لگا
بات سنتا نہ تھا پہلے کبھی دریا میری

ہر نئے ظلم پہ میں چیختی چلاتی رہی
دھرتی کہتی ہے، کوئی بات نہ سمجھا میری!

وحشتیں ساتھ لئے پھرتی ہیں اپنا صحرا
اب تو بھولے سے بھی حاجت نہیں صحرا میری

شجرِ شام میں تنہائی سمجھتا ہوں تری
کبھی آباد تھی یاں پیار کی دنیا میری

کیا نئے حرف لکھوں، نغمۂ نو کیا چھیڑوں
حرتِ غم نے کمر کردی ہے دوتا میری

دلِ ویراں میں نہ باقی رہے غیرت کی رمق
اے طلب! اس قدر اب جھولی نہ پھیلا میری

○

حنیف ساحل

(گجرات، بھارت)

اِک خلائے بے کراں، کچھ بھی نہیں
سر پہ اپنے آسماں، کچھ بھی نہیں

کوئی رنجش یا گماں کچھ بھی نہیں
تیرے میرے درمیاں کچھ بھی نہیں

کچھ حرارت بھی نہیں سینے میں اب
سلسلہ جسم و جاں کچھ بھی نہیں

میں اٹھاتا ہی رہا پردے سبھی
اور پردوں میں نہاں کچھ بھی نہیں

کیسی یہ موجِ بہاراں آئی ہے
پھول، خوشبو، تتلیاں کچھ بھی نہیں

عمر گذری اس طرح چلتے ہوئے
اور منزل کا نشاں کچھ بھی نہیں

ریزہ ریزہ ہو گیا سارا وجود
اور بکھرنے کا گماں کچھ بھی نہیں

کس کو دیتے ہو صدائیں تم حنیفؔ
ہے یہ شہرِ خفتگاں، کچھ بھی نہیں

○

ڈاکٹر پنہاں
(یو۔ایس۔اے)

تماشے عجیب ہیں جو ہم دیکھتے ہیں
خدا کے تراشے صنم دیکھتے ہیں

عنایت نوازش کرم دیکھتے ہیں — یہ کیا خواب ہم چشمِ نم دیکھتے ہیں
''جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں''☆۱ — وہیں اپنے دیر و حرم دیکھتے ہیں
خدا کے کرم کی دعا مانگتے تھے — ''تماشائے اہلِ ستم دیکھتے ہیں''☆۲
محبت میں دل موج میں جیسے لاوا — یہاں آب و آتش بہم دیکھتے ہیں
جو کرتا ہے سیراب قلب و نظر کو — اسی جام کو جام جم دیکھتے ہیں
ملاقت میں بھی جدائی کی باتیں — مسرت بہ رنگِ الم دیکھتے ہیں
چھما چھم برسنے کو تیار آنسو — خوشی دیکھتے ہیں نہ غم دیکھتے ہیں
وہی میرے رستے کی دیوار ہونگے — جنہیں ہمسفر ہمقدم دیکھتے ہیں
انہیں زندگی نے کہیں کا نہ چھوڑا — جو سنتے زیادہ ہیں کم دیکھتے ہیں
خدا جانے مظلوم کیا سوچتے ہوں — جو ظالم کا اونچا علم دیکھتے ہیں
رقم خود بری اپنی تقدیر کر کے — مقدر میں ہے جو رقم دیکھتے ہیں
دلوں اور دماغوں پہ کیسے ہیں پردے — نہ تم دیکھتے ہو نہ ہم دیکھتے ہیں
اب اہلِ قلم کی بصارت ہے اتنی — قلم اپنا دستِ قلم دیکھتے ہیں
یہ انساں یہ ناداں یہ خود میں نہ جھانکیں — فقط سوئے دیر و حرم دیکھتے ہیں
جو ہے وہ نہیں ہے نہیں جو وہی ہے — تضادِ وجود وعدم دیکھتے ہیں
کہاں منعکس صورتِ آئنہ گر — یہ کیا آئنہ ہے جو ہم دیکھتے ہیں
دم نزع بھی وہ نہ آئے نہ آئیں — مگر دے کے اپنی قسم دیکھتے ہیں
بنائی ہے کیا اک نظر دیکھنا تو — وہ دنیا جسے جی کے ہم دیکھتے ہیں
دعا امنِ عالم کی کرتے ہیں یا رب — جہنم میں خوابِ ارم دیکھتے ہیں

غزل وہ سہیلی ہے پنہاںؔ جسے ہم
پرستش کے لائق صنم دیکھتے ہیں

☆۱۔ مصرعہء طرح ---- غالبؔ ☆۲۔ تصرف ------- غالبؔ

گُم شدہ شناخت

انل ٹھکر

(دہلی، بھارت)

عمارتوں کی مُنڈیر سے اُتر کر دھوپ بازار میں پاؤں پسار رہی تھی۔ نکڑ کے گھسیٹا مل حلوائی کی دکان پر دھیمی آنچ پر تپ رہے دودھ کی کڑاہی سے ہلکا ہلکا دھواں اُٹھ کر ہوا میں تحلیل ہو رہا تھا۔ تلی جا رہی پوریاں اور مال پوا کے گھی کی سوندھی خوشبو فضا کو معطر کر رہی تھی۔ ایک میز پر مٹی کی تغاری میں جما ہوا دہی ملائی کی موٹی پرت لئے رکھا ہوا تھا۔ گھسیٹا مل بڑے لوٹے میں دہی بلوتے ہوئے لسّی بنانے میں مصروف تھا۔ پاس کی بھٹی پر چائے کا پانی اُبل رہا تھا۔ تین چار رکشا والے چائے کی چُسکی لیتے ہوئے دن بھر کی محنت کے لیے جسم کو تیار کر رہے تھے۔ جم خانہ سے ٹینس کھیل کر لوٹے کچھ نوجوان دودھ کا گلاس تھامے گپ شپ میں مشغول تھے۔ بازار کی چہل پہل انگڑائی لے رہی تھی۔ ایسی آمد و رفت کی گھڑی میں امجد میاں پٹھانی شلوار، کرتا اور جاکٹ میں ملبوس جاننے پہچاننے والوں کو دُعا سلام کہتے ہوئے حلوائی کی دکان کے سامنے سے گذرے تو گھسیٹا مل نے لسّی بلوتے ہوئے اُنہیں سلام کیا۔ امجد میاں نے ہاتھ اٹھا کر سلام کا جواب دیا اور اپنی دکان کی جانب بڑھ گئے۔

امجد بخاری شہر کے معروف غلّہ کے تاجر تھے۔ ان کی ایمانداری، واجب منافع اور برسوں کی کڑی محنت ان کی تجارتی ترقی کا راز تھی۔

امجد میاں اپنی دکان میں داخل ہوئے، ایک کونے میں مُنشی کھاتا بہی پر جُھکا ہوا تھا۔ امجد میاں کے آنے سے کھاتا بہی پر آ رہی روشنی میں خلل پہنچا تو مُنشی نے سر اٹھا کر دیکھا مالک کو آیا دیکھ کر سلام کیا۔

امجد میاں اپنی گدّی پر آ کر بیٹھے۔ ان کے روبرو رکھی میز پر چھوٹے چھوٹے کٹوروں میں اناج کے نمونے رکھے ہوئے تھے۔ ان کے پسِ پشت دیوار پر دو تصویریں ٹنگی ہوئی تھیں۔ جن میں سے ایک پر اللہ اور دوسری پر محمد چھپا ہوا تھا۔ امجد میاں نے نشست پر رکھا آج کا اخبار اٹھایا۔ سرخیوں پر نظر ڈالی ہی تھی کہ موٹر بائیک پر سوار ایک آدمی دکان کے سامنے رکا۔ اس نے وہیں سے پکار کر کہا۔

امجد میاں، چاول کی دو بوریاں ہوٹل بھجوا دینا۔ ارجنٹ ہے۔ بھُولنا نہیں۔

امجد میاں جواب دیں اس سے قبل بائیک سوار ہوا سے باتیں کرتے ہوئے نکل گیا۔ انہوں نے چاول بھیجنے کی پرچی کاٹی۔ ملازم کو دی اور باہر کی جانب نظر ڈالی، بازار میں چہل پہل بڑھ گئی تھی۔ ایک آدمی نے دکان کی بغل میں سائیکل کو اسٹینڈ لگا کر قفل لگایا اور دکان میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

کیا ہو رہا ہے پیارے؟

امجد میاں نے آنے والے کی جانب دیکھا۔ دیکھ کر خوشی سے کھڑے ہو گئے اور بولے۔

خوش آمدید، خوش آمدید، آؤ، آؤ یار شمشیر آؤ۔

وہ آگے بڑھے، اپنے یار کو گلے لگایا اور اپنی نشست پر بٹھایا۔ کہا

بڑے دنوں کے بعد آئے ہو! صبح صبح کیسے آنا ہوا؟

محکمہ کے دفتر کو آیا تھا، اسکول کے کام سے مگر صاحب چھٹی پر ہے۔ سوچا اتنی دُور آیا ہوں، تم سے ملتا چلوں۔

صاحب نہیں اس لئے آئے ہو بیٹھے، ورنہ تم کیوں آنے لگے۔

نہیں یار، فاصلے بہت بڑھ گئے، ٹرافک بھی بہت ہے۔ سائیکل پر دوری طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

امجد میاں نے اپنے خادم کو آواز دی اور کہا۔

بیٹے، جلدی سے گھسیٹا مل کی دکان سے دو گلاس لسّی ملائی مار کر اور گاجر کا حلوہ لے آ۔

خادم جانے کو مڑا تو اسے روک کر بولے۔

اور سُن۔ اس سے کہنا، لسّی شیشے کے گلاس میں نہ دے۔ پنجابی گلاس میں دے۔ خادم کے جانے کے بعد وہ شمشیر سے مخاطب ہوئے۔

آج کل یار دودھ اور لسّی کے گلاس بھی سمٹ کر رہ گئے ہیں۔۔۔

اچھا ہے، کم از کم گھسیٹا مل ابھی تک دیسی گھی استعمال کرنا نہیں بھولا۔

لسّی اور گاجر کے حلوے کا لطف اٹھانے کے بعد دونوں دوست گپ شپ میں جُٹ گئے۔ شکوے، شکایتوں کا دور چلا۔ قہقہوں کے فوّارے چھٹنے لگے۔ اس دوران امجد میاں نے اپنی اہلیہ کو فون کر کے کہا۔

بیگم، ہمارا یار آیا ہے۔

کون یار؟ سامنے سے نسوانی آواز آئی۔

اس سوال پر امجد میاں کو دل لگی سوجھی۔

آپ بھی کمال کرتی ہیں! ہماری قسمت میں تو صرف ایک بیوی اور ایک یار ہی لکھا ہوا ہے۔ ہم نے کبھی کسی اور کو آنکھ اُٹھا کر دیکھا نہ کسی اور سے یاری کی۔۔۔ ہاں، اب ٹھیک پہنچانا۔ شمشیر سنگھ آیا ہے۔۔۔ وہ روٹی ہمارے ساتھ کھائے گا۔۔۔ اللہ حافظ۔

دوپہر گھر پہنچتے ہی امجد میاں کی بیوی نے دسترخوان لگایا۔ یار لوگ ہنسی مذاق میں پرانی یادوں کی جُگالی کرتے ہوئے کھانے کے لطف کو دوبالا کرنے لگے۔ تبھی امجد میاں نے اپنے دوست کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

یاد ہے نہ تمہیں؟ چودھری کے کھیت سے ککڑی چوری کرتے پکڑے گئے تھے۔ چودھری نے ہمیں مرغا بنا کر رکھا تھا۔

شمشیر نے نوالہ چباتے ہوئے کہا۔

ہاں یار، میری تو دو دن تک کمر پکڑ لی تھی۔ مگر کچھ بھی کہو، آج پیسے دے کر بھی ککڑی کا وہ ذائقہ نصیب نہیں ہوتا۔

بیٹے، وہ چوری کا ذائقہ تھا۔۔۔امجد میاں نے قہقہہ لگایا۔

امجد میاں کی بیوی پکوان پروسنے آئی۔ اس نے اپنے شوہر کو یوں ہنستے دیکھا تو مصنوعی خفگی دیکھاتے ہوئے بولی۔

آپ بھائی صاحب کو کھانے بھی دیں گے یا۔۔۔

جھٹ سے شمشیر نے لقمہ دیتے ہوئے کہا۔

بھرجائی، اس کی نیت ہی کھوٹی ہے۔ یہ چاہتا ہی نہیں، میں آپ کے ہاتھ کا کھانا پیٹ بھر کھاؤں۔

امجد نے فوراً کہا۔

اَے اَے، لڑانے کا ارادہ ہے کیا؟

میں جھوٹ نہیں کہتا بھرجائی، دکان پر پنجاب دی لسّی دے گلاس وچ کہہ کہہ کر ملائی سے تر تراتی لسّی پلائی۔ گاجر کا حلوہ کھلایا۔ پیٹ بھر دیا۔ اب بچپن کی باتیں یاد دلا کر ہنسا رہا ہے۔

تو کیا تیری جوانی کے قصے یاد دلاؤں؟

امجد میاں کی بیوی نے پکوان پروسا اور زیرِ لب مسکراتے ہوئے اندر چلی گئی۔

صبح کا ناشتہ اور دوپہر کو بھرجائی کے اصرار کے ساتھ کھایا کھانا! دستر خوان سے اُٹھتے ہی شمشیر کی آنکھوں میں غنودگی طاری ہونے لگی۔ دیوان خانہ میں آ کر جھولتی کرسی پر بیٹھتے ہی کچھ ہی دیر میں اسے نیند لگ گئی۔

چار بجے کے قریب اس کی آنکھ کھلی تو وہ ہڑ بڑا گیا۔ اطراف دیکھا۔ پاس کی کرسی پر امجد میاں اخبار پڑھتے بیٹھے تھے۔ شمشیر نے کُرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

امجد یار، بہت دیر ہوگئی۔

امجد نے اخبار ایک طرف رکھا اور گویا ہوا۔

تمہیں نیند لگ گئی تھی۔ میں نے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔

دونوں کی باتوں کی آواز سن کر امجد میاں کی بیوی جلدی سے چائے بنا لائی۔ دونوں نے چائے پی۔ جانے کے لیے احاطہ میں آئے۔ شمشیر نے اپنی سائیکل سنبھالی اور مڑ کر بھاوج سے رخصت چاہی۔ دونوں سڑک پر آ گئے۔ شمشیر نے سوچا جاتے ہوئے امجد کو اس کی دکان پر چھوڑتا چلوں۔ وہ راستے کا موڑ مڑے اور ٹھٹھک گئے۔ ان کے چہرے پر حیرت اور پھر خوف طاری ہوگیا۔ انہوں نے دیکھا، راستے پر افراتفری کا ماحول ہے، بدحواس لوگ پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتے ہوئے سیلاب کے ریلے کی طرح بھاگے چلے آ رہے ہیں۔ امجد میاں نے ایک آدمی کا ہاتھ پکڑ کر روکا، پوچھا۔۔۔

برادر کیا بات ہے؟ کیا ہوا ہے؟

حواس باختہ شخص نے کہا۔

فساد۔۔۔فساد شروع ہوگئے ہیں۔

امجد میاں کچھ اور پوچھیں اس سے پہلے وہ آدمی ہاتھ چھڑا کر گھبرائے ہرن کی طرح بھاگ کھڑا ہوا۔ یہ دونوں پس و پیش میں کچھ لمحے کھڑے رہے۔ جب لوگوں کی دھکا پیلی سے ٹھہرنا مشکل ہوگیا تو امجد میاں نے گھر لوٹنے کی پیش کش کی۔ شمشیر لوٹنے کو راضی نہ تھا۔ اسے دور جانا تھا۔ گھر پہنچتے پہنچتے اندھیرا ہو جائے گا۔ امجد میاں نے یہ کہہ کر منا لیا کہ گھر چل کر معلوم کر لیتے ہیں، کیا ہوا ہے، کہاں ہوا ہے۔

اپنے شوہر کو شمشیر کے ساتھ واپس آیا دیکھ کر امجد کی بیوی پریشان ہوئی۔ جب اسے لوٹنے کی وجہ معلوم ہوئی تو اس کی پریشانی میں اضافہ ہوگیا۔

امجد میاں نے گھر آتے ہی جان پہچان والوں کو فون کر کے فساد کے بارے میں دریافت کرنا شروع کیا۔ کوئی کچھ کہنے لگا تو کوئی کچھ۔ ان کی باتوں سے انہوں نے محسوس کیا کہ ان میں سے کوئی بھی شاید حقیقت سے آشنا نہیں ہے۔ ہر کوئی سنی سُنائی افواہ ہی بیان کر رہا ہے۔ آخر کار ایک مقام سے کچھ اطمینان بخش خبر ملی کہ ایک مسلمان لڑکی کو کسی غیر مسلم لڑکے نے چھیڑا۔ بیچ بچاؤ جھگڑے کی شکل اختیار کر گئی۔ چُھرا چلا! چھرا جیسے فساد کی علامت ہو۔ بھگ دوڑ مچ گئی۔ دکانیں بند ہونے لگیں۔ پتھراؤ شروع ہوا۔ پولیس نے لاٹھی چلائی۔ بات بڑھی تو گولی باری ہوا۔ دو لوگ مارے گئے۔ کچھ مقامات پر کرفیو لگایا گیا۔

یہ سن کر شمشیر مضطرب ہوگیا۔ اسے اپنے بیوی اور بیٹے کی فکر لاحق ہوگئی۔ شام ڈھلنے کو تھی۔ وہ جلد از جلد گھر پہنچنے کو چھٹپٹانے لگا۔ امجد میاں شہر کے حالات دیکھ کر اسے جانے دینے کے لیے راضی نہیں تھے۔ آخر کار اس کی پریشانی دیکھ کر امجد میاں یہ کہہ کر باہر گئے کہ وہ شمشیر کو صحیح سلامت اس کے گھر پہنچانے کا انتظام کر کے ابھی آتے ہیں۔

امجد میاں کو گئے کافی وقت ہوگیا۔ وہ لوٹے نہیں تو ان کی اہلیہ کو فکر ہونے لگی۔ شہر کے حالات دیکھتے ہوئے انہیں شام میں باہر اکیلے نہیں جانا چاہیے تھا۔ شمشیر بھائی کو رات میں یہاں روک لینا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کوئی اونچ نیچ ہو جائے! ایسے کئی خوف پیدا کرنے والے خیال اس کے دل میں اٹھنے لگے۔

شمشیر اپنے گھر کو لے کر فکر مند تھا۔ کہیں پر امجد کو گئے بھی بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس کے لوٹ کر نہیں آنے سے وہ اور بے چین ہوگیا۔ گھر میں موجود یہ دونوں ایک دوسرے کو تسلی دینے کے لیے ذہنی طور پر موڈ میں نہیں تھے۔ یہ دونوں اپنی اپنی جگہ منتشر تھے۔ جیسے جیسے رات قدم بڑھانے لگی، شمشیر کے چہرے پر مایوسی چھانے لگی۔ امجد گھر پر ہوتا تو وہ اسے سمجھا بجھا کر اکیلا گھر کی

جانب چل دیتا۔اب تو بھر جائی کو اکیلا چھوڑ کر بھی تو نہیں جا سکتا جبکہ اس کی فکر میں خطرہ مول لے کر امجد باہر گیا ہے۔

یہ دونوں کشمکش میں مبتلا تھے تبھی دروازہ پر دستک ہوئی۔امجد کی بیوی تیزی سے چوکھٹ پر آئی۔شمشیر نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔امجد میاں پسینے میں تربتر دو لوگوں کے ساتھ اندر آئے۔اندر آتے ہی ایک لمحہ ضائع کیے بغیر انہوں نے شمشیر سے کہا۔

''یہ لوگ میرے بھروسے کے آدمی ہیں۔یہ تمہیں گھر پہنچا دیں گے۔مدنی پورا ہی ایک ایسا علاقہ رستے میں پڑتا ہے، جہاں کرفیوں لگا ہوا ہے۔ وہاں سے سنبھل کر گذرنا ہوگا''

شمشیر جانے کے لیے ایک پاؤں پر تیار کھڑا تھا۔اس نے اپنی سائیکل لی تو امجد نے اس سے یہ کہتے ہوئے اس وقت سائیکل ساتھ لے جانا ٹھیک نہیں ہوگا۔کل صبح کسی آدمی کے ہاتھ سے میں سائیکل بھجوا دوں گا۔شمشیر نے روانہ ہونے سے پہلے اپنی بھر جائی سے رخصت ہوتے ہوئے کہا۔

بھرجائی، دعا کرو، میں لوٹ کر نہ آؤں۔

اللہ مالک ہے بھائی جان۔آپ خیریت سے پہنچ جائیں گے۔

شمشیر نے سلام کیا۔امجد کو گلے لگایا۔وہ جانے کے لیے بڑھا تو امجد نے اپنے ان بھروسے کے آدمیوں کا تعارف کراتے ہوئے شمشیر سے کہا۔

یہ منگو پہلوان ہے۔

شمشیر نے اس کی جانب دیکھا۔اونچا قد، کسا ہوا بدن، گورے چہرے پر سیاہ مونچھیں۔۔۔تبھی امجد میاں نے دوسرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

یہ لطیف میاں ہیں، لاٹھی چلانے میں ماہر ہیں۔

شمشیر نے دیکھا وہ نوجوان لٹھ تھامے ہوئے تھا۔

وہ تینوں گھر سے باہر آئے۔خدا حافظ کہا اور کوچہ میں چل پڑے۔

گلی محلوں کے کتوں سے بچتے بچاتے، سڑکوں پر پہرے پر تعینات پولیس کی نظروں سے چھپتے چھپاتے وہ مدنی پورا کے کرفیو والے علاقہ کو شاطرانہ انداز میں پار کر کے دو ڈھائی بجے کے قریب وہاں پہنچے جہاں سے شمشیر کے علاقے کی حد شروع ہوتی تھی۔شمشیر وہاں آ کر رکا۔راحت کی سانس لی اور پہلوان سے مخاطب ہوا۔

پہلوان صاحب، اب آپ لوگ لوٹ جایئے۔میرا گھر اب دور نہیں۔

پہلوان نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

نہیں، نہیں جناب۔خان صاحب نے ہمیں آپ کے گھر کے دروازہ تک چھوڑنے کو کہا ہے۔

پہلوان صاحب، آپ کو ابھی اُتنا ہی واپس جانا ہے، جتنا ہم آئے ہیں۔اب میں چلا جاؤں گا۔آپ فکر نہ کریں۔

کافی سمجھانے کے بعد وہ انہیں لوٹنے پر راضی کرنے میں کامیاب ہو سکا۔وہ دونوں اپنی راہ پر واپس لوٹ گئے۔شمشیر اپنے گھر کی راہ پر چل پڑا۔

دو بلیوں کو روٹی کے لیے لڑتا دیکھ کر بندر کو انصاف کرنے کا موقع ملا۔ایسے ہی حکم سنگھ کو شہر کے فساد نے انصاف کرنے کا موقع عطا کر دیا۔شہر میں فساد کی خبر سنتے ہیں اس نے اپنے علاقے کے خاص و عام کی میٹنگ طلب کی۔ فساد سے گھبرائے لوگ ایم۔ایل۔اے حکم سنگھ کے بلاوے پر حاضر ہو گئے۔ حسبِ منصوبہ بندی پہلے اپنے تین چار چیلے چپٹوں کو بولنے کا موقع دے کر پھر حکم سنگھ خود بولنے کے لیے کھڑے ہوئے۔انہوں نے ہندو، مسلم بھائی چارے اور قومی یک جہتی پر بولتے ہوئے ان لوگوں کی خوب مذمت کی جو ان دو قوموں میں تضاد پیدا کر کے انہیں لڑاتے ہیں۔انہوں نے امن و امان کے لیے ہر گھر سے ایک فرد کو اپنے علاقے میں گشت لگانے بھیجنے کی اپیل کی۔انہوں نے کہا وہ چاہتے تو پولیس تعینات کروا دیتے مگر اُن غداروں کو معلوم ہونے دو، ہماری حفاظت ہم خود کر سکتے ہیں۔ہمیں کسی پولیس کی ضرورت نہیں۔۔۔رات کے نو بجے سے گشت شروع ہو کر صبح چھ بجے تک رہے گی۔۔۔میرے گھر سے گشتی کے لیے میرا بیٹا حاضر رہے گا۔۔۔

لوگوں نے تالیاں بجائیں۔جس آواز کو سننے کو ان کے کان منتظر رہتے ہیں۔یہ آواز سن کر انہیں یقین ہو گیا، آج کی یہ تقریر آنے والے چناؤ میں ان کی جیت کی ضمانت ثابت ہوگی۔

رات کا پہلا پہر شروع ہوا نہیں کہ جوانوں کا ہجوم لاٹھیاں لئے حکم سنگھ کے احاطے میں اُترنے لگا۔جب احاطے میں تل بھر کی جگہ نہ رہی تب حکم سنگھ بالائی منزل کا زینہ اُترتے ہوئے رکے۔اُنھیں ان نوجوانوں کی آنکھوں میں اپنی سیاسی کُرسی پائیدار نظر آتی اور ان میں اپنے روشن مستقبل کو دیکھتے ہوئے انہوں نے بولنا شروع کیا۔

''ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ہمارے نوجوانوں کا خون گرم ہے۔ آپ ملک کے رکھوالے ہیں۔پاسبان ہیں۔آپ کو اس ملک کی باگ ڈور سنبھالنی ہے۔یہ تبھی ممکن ہو سکتا ہے جب آپ ایک جُٹ رہیں۔آپ میں بھائی چارہ ہو۔۔۔''

ایسی لیڈرانہ باتیں وہ کچھ دیر بولتے رہے۔آخر میں کہا۔

تم لوگ دو دو، چار چار کی ٹولیاں بنا کر اپنے علاقے میں پھیل جاؤ۔

ہجوم کا خطرہ نظر آئے تو لوگوں کو جگا دینا۔اِکا دُکا ٹکرائے تو ڈھیر کر دینا۔

حکم سنگھ نے دونوں ہاتھ اٹھائے۔جوانوں کو کُوچ کرنے کا اشارہ کیا۔جوان جوش اور ولولوں کے ساتھ ایسے نکلے جیسے کسی مہم پر جا رہے ہوں۔ سب سے آخر میں حکم سنگھ کا بیٹا دلاور اپنے دوست کرما کے ساتھ احاطے کے فرش پر لٹھ بجاتے ہوئے نکلا۔

دلاور اور کرما نصف شب تک تو گپ شپ کرتے، عیاشی کے قصّے سنتے سناتے، کالج کی لڑکیوں کی باتیں کرتے ہوئے پہرا دیتے رہے۔ محفلوں، فلموں کے لیے دیر رات تک جاگنے کی ان کو عادت تھی مگر گلی کوچوں میں گشت لگانے کا ان کو تجربہ نہیں تھا۔ تھکان محسوس ہوئی تو وہ خاموش چلنے لگے۔ خاموشی کھٹکنے لگی تو دلاور آہستہ آہستہ لے میں لاٹھی کو زمین پر ٹھوکتے ہوئے چلنے لگا۔ جب تنگ گلی کے چوراہے پر پہنچے تو دلاور نے چہار سو دیکھا۔ ایک مکان کے چبوترے پر لاٹھی ایک طرف رکھی اور بیٹھ گیا۔ کرما نے بھی پاؤں کو راحت دینے چبوترے کا سہارا لیا۔ دلاور نے جیب سے سگریٹ کا پاکٹ نکالا۔ دونوں نے سگریٹ جلا کر کش لینا شروع کیا۔

کافی دیر سستانے کے بعد اُٹھنے کے لیے کرما نے لاٹھی کی طرف ہاتھ بڑھایا تبھی اچانک قریب میں آہٹ ہوئی۔ دونوں چونک کر ہوشیار ہو گئے۔ لاٹھیاں سنبھال لیں۔ اندھیرے میں نظروں کو ٹوہ لینے گھمایا تو بلّی کو راستہ کاٹتے دیکھا۔ دونوں کھسیانے پڑ گئے۔ دونوں کے چہرے پر مسکراہٹ تیر گئی۔ پھر دونوں ہلکے سے لاٹھی ٹھوکتے آگے بڑھے۔ تبھی ناگہانی طور پر دلاور کی نظر گلی کے دوسرے سرے سے ان کی جانب آ رہے آدمی پر پڑی۔ دونوں چاق و چوبند ہو گئے۔ لاٹھیوں پر گرفت مضبوط ہو گئی۔ دھڑکنوں کی آواز کو کم کر کے سانس کو دھیما کر لیا۔ وہ شخص پیچھے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے آ رہا تھا۔ گلی کی کم کم روشنی میں انہوں نے دیکھا وہ آدمی گھیر دار شلوار اور قمیض پہنے ہوئے تھا۔ انہیں شک ہوا۔ آنے والا مسلمان ہے۔ وہ رات کے اندھیرے میں فتنہ پیدا کرنے آیا ہے۔ یہ دونوں اندھیرے میں ایک دیوار کی آڑ میں چھپ گئے۔ اس آدمی کے قریب آتے ہی دونوں نے اسے گھیر لیا۔ شمشیر اس اچانک گھیراؤ سے گھبرا گیا۔ دلاور نے کڑھ کر پوچھا۔

کون ہے تو؟ یہاں کیوں آیا ہے؟

اسکول ٹیچر ہوں۔ اپنے گھر جا رہا ہوں۔

کرما نے رعب جھاڑنے کے لیے ایک چانٹا رسید کر کے کہا۔

نام بتا نام اپنا۔

شمشیر سنگھ۔۔۔ شمشیر نے غصّہ پیتے ہوئے کہا۔

جھوٹ بولتا ہے سالے؟ تیرا لباس کہتا ہے تو مسلمان ہے۔

بھائی میرے، میں ہندو ہوں مسلمان نہیں۔

ہمیں بھائی کہہ دینے سے تو ہندو بن جائے گا؟

تبھی کرما کی نظر شمشیر کی بانہہ پر گئی وہاں اس نے کچھ لکھا ہوا دیکھا۔ اس نے اس کی کلائی پکڑ کر اس کا ہاتھ قریب لیا اور بانہہ پر لکھا پڑھا۔

شمشیر!! دلاور یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اس کا نام شمشیر ہے۔ شمشیر سنگھ نہیں۔

دلاور نے بحث سے تنگ آ کر کہا۔

اے ے ے کرما، بیکار میں بحث کیوں کرتا ہے! سالے کی شلوار اُتار ابھی معلوم ہو جائے گا کون ہے۔

کرما نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ شمشیر کی اَنا کو چوٹ پہنچی۔ صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس نے آگے بڑھ کے کرما کے ہاتھ کو پکڑ کر موڑا اور اسے دھکیل دیا۔ کرما پلٹ کر لاٹھی کا وار کرے اس سے قبل دلاور نے چشم زدن میں چاقو نکال کر شمشیر کے پیٹ میں اُتار دیا۔ خون کا فوارا اچھلا۔ دلاور کے کپڑے خون سے تر ہو گئے۔ شمشیر بھگوان کا نام لیتے ہوئے گرا۔ اس کے منہ سے بھگوان کا نام سن کر دونوں پس و پیش میں پڑ گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور وہاں سے فرار ہو گئے۔

کچھ دیر مارے ڈر کے بے راہ وسمت اِدھر اُدھر بھاگتے رہے۔ بعد ازاں ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو انہوں نے حکم سنگھ کی حفاظت میں جانا ہی مناسب سمجھا۔

دروازہ پر بار بار کی تھاپ نے حکم سنگھ کو بیدار کر دیا۔ اتنی رات گئے اس ڈھنگ سے دروازہ پر تھاپ کو سُن کر وہ سمجھ گئے کوئی بُری خبر ہے۔ انہوں نے دیوار پر ٹنگی بندوق کو اٹھایا اور نیچے آئے۔ دروازہ کھولا سامنے اپنے بیٹے کو حواس باختہ، خون سے تر کپڑوں میں دیکھا تو سکتے میں آ گئے۔ انہوں نے جلدی سے دونوں کو اندر لیا۔ دروازہ بند کر کے تفصیل سے پورا واقع سنا تو سوچ میں پڑ گئے۔ سوچا قتل کا معاملہ ہے، ان کا بیٹا اس میں ملوث ہے۔ شہر کے حالات بگڑے ہوئے ہیں۔۔۔ مگر کچھ ہی لمحوں میں وہ سنبھل گئے۔ کہا۔

ٹھیک ہے۔ تم فکر مت کرو میں۔۔۔

کرما نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

مگر جناب، وہ مسلمان نہیں ہے۔

تو؟! حکم سنگھ چونکے۔

ہندو ہے۔ دلاور نے کہا۔

تو فکر مت کر میں دیکھ لوں گا۔ حکم سنگھ نے بیٹے کو تسلی دیتے ہوئے کہنا چاہا تبھی کرما نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے معصومیت سے کہا۔

مگر وہ بیچارا تو مارا گیا۔۔۔

وہ مارا نہیں گیا، شہید ہوا ہے۔۔۔ اور شہیدوں کا خون کبھی ضائع نہیں جاتا۔۔۔ وہ اتنا کہہ کر لمحہ بھر چپ رہے، پھر گویا ہوئے۔

تم ایسا کرو، اس کی لاش کو گھسیٹ کر ہمارے دروازہ پر پھینک دو۔۔۔ جاؤ جلدی کرو۔ اور ہاں کچھ پتھر دروازہ کے آس پاس بکھیر دو۔ جاؤ اب۔

دونوں حکم سنگھ کی منشا سمجھ نہیں پائے۔ البتہ اتنا ان کی سمجھ میں آ گیا کہ انہیں بچانے کے لیے یہ سب کیا جا رہا ہے۔ حکم سنگھ نے انہیں ٹوکا وہ رُکے۔ حکم سنگھ نے کرما کو غور سے دیکھا بولے۔

اس آدمی کی موت کیسے ہوئی یہ کبھی کسی سے مت کہنا ورنہ۔۔۔ تمہارا نام بھی شہیدوں میں لکھا جائے گا۔

کرمانے کپکپی محسوس کی۔اس نے نفی میں سر ہلایا۔لاشعوری طور پر اس نے ہاتھ جوڑے۔حکم سنگھ نے کہا۔

اب جاؤ۔میں نے کہا اتنا کرو۔

وہ دونوں لاش کی جانب روانہ ہوئے۔

حکم سنگھ خلا میں دیکھنے لگے۔سوچتے ہوئے زیرلب اپنے آپ سے کہا۔حکم سنگھ اس موقع کو بھنالو۔اس خبر کو اخبار بنادو۔پورے شہر میں یہ بات پھیلا دو،مسلمانوں نے ایک بے قصور ہندو کا قتل کر کے ایم۔ایل۔اے۔حکم سنگھ کے گھر کے سامنے پھینک دیا۔

حکم سنگھ کوچے کی قلیل روشنی میں انہیں جاتا ہوا دیکھتے رہے، پھر جیب سے موبائل نکالا۔انسپکٹر جادو کو فون لگایا۔اس سے کہا کہ یہاں کسی کا قتل کر کے لاش کو میرے دروازے پر پھینک دیا گیا ہے۔

کچھ ہی دیر میں انسپکٹر جادو کی جیپ سائرن بجاتے ہوئے آ پہنچی۔ سائرن کی آواز نے پوری گلی کو بیدار کر دیا۔لوگوں نے گھر کے دریچوں سے جھانکنا شروع کیا، پھر آہستہ آہستہ گلی میں آ گئے۔دلاور اور کرما بھی اس ہجوم میں تماش بین بن کر کھڑے تھے۔بعد ازاں میڈیا اور اخبار والے بھی آ پہنچے۔تبھی ایک اخبار کے نمائندے نے آ کر حکم سنگھ سے سوال پر سوال پوچھنا شروع کیا۔

جناب، یہ قتل کب ہوا؟

مجھے نہیں معلوم، میں سویا تھا۔دروازے پر پتھر برسنے لگے تو میں نے نیچے آ کر دیکھا،دروازے کے سامنے لاش پڑی ہوئی تھی۔

پتھر کون پھینک رہا تھا؟

میں نہیں جانتا۔میں نیچے آیا دیکھا وہاں کوئی نہیں تھا۔

اخبار کے رپورٹر نے اپنے کیمرا مین کو تصاویر لینے کے لیے کہہ کر حکم سنگھ سے کہا۔

ابھی وقت ہے۔کل کس سیٹی ایڈیشن میں تصاویر کے ساتھ خبر چھپ جائے گی۔حکم سنگھ جیسے اس کی بات سے مطمئن نہیں ہوئے۔بولے۔

رمیش بابو،صرف فوٹو اور خبر سے کیا ہوگا!خبر کو اشتہار بنا دیں تو بات بنے۔

رپورٹر نے پیشانی کھجلاتے ہوئے کہا۔

سر،شہر میں پچھلی شام ہی دنگے ہوئے ہیں۔اس خبر کو گرم کر کے چھاپیں گے تو آگ میں گھی کا کام کرے گی۔دنگے بڑھ سکتے ہیں۔

رمیش بابو، ہوم ہون کی آگ میں بھی تو گھی ڈالا جاتا ہے۔تاکہ اطراف کے جراثیم مر جائیں اور ماحول پاک صاف ہو جائے۔

مگر سر۔۔۔

حکم سنگھ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا۔

آپ فکر نہ کریں۔آگ کو ٹھنڈا کرنے کا منتر بھی ہم جانتے ہیں۔۔۔پھر آپ کو آج کا نہیں مستقبل کا سوچنا چاہیے۔تبھی تو ترقی ہوسکتی ہے۔

حکم سنگھ نے رپورٹر کو چھوڑا اور انسپکٹر جادو کے پاس پہنچے پوچھا۔

کچھ پتا چلا،کون ہے یہ آدمی؟

جی،اس محلے کے کچھ لوگ کہتے ہیں،پاس کی گلی کا ہے۔ٹیچر ہے کسی اسکول کا۔پنچ نامہ ہوا۔ایمبولینس آئی۔انسپکٹر آگے کی کاروائی کے لیے لاش لے کر چلا گیا۔بھیڑ چھٹ گئی۔

گلی سونی ہوگئی۔حکم سنگھ اپنی خواب گاہ میں آ کر سونے کی کوشش کرنے لگے مگر ناکام رہے۔پہلو بدل بدل کر سوچتے رہے۔کیا سوچ رہے تھے یہ ان کی پکڑ کے باہر تھا۔ٹکڑا ٹکڑا سوچ،کبھی کچھ،کبھی کچھ،کسی سوچ کا دوسری سوچ سے کوئی رشتہ نہیں۔میل نہیں!!صبح پانچ بجے کے قریب انہیں سوامی جی کی یاد آئی۔انہوں نے سوچا،سوامی جی اب تو جاگ گئے ہوں گے۔انہیں اس سانحہ کی اطلاع دینی چاہیے۔انہوں نے سوامی جی کو فون لگایا۔علی الصبح حکم سنگھ کا فون آیا دیکھ کر انہیں حیرت ہوئی مگر انہوں نے اسے ظاہر نہیں ہونے دیا۔حکم سنگھ سے پورا قصّہ سن کر انہوں نے مختصر جواب دیتے ہوئے کہا''میں صبح آ کر ملوں گا''۔

سوامی جی کا فون رکھنے کے بعد حکم سنگھ نے اپنے آپ کو تشنہ محسوس کیا۔انہوں نے جس امید سے فون کیا تھا،وہ اشتیاق ان کا پورا نہیں ہوا۔مگر کچھ دیر بعد جب اخبار والا اخبار ڈال گیا۔انہوں نے اخبار دیکھا ان کے چہرے پر خوشی کا آفتاب طلوع ہوگیا۔خوشی کے مارے ان کی باچھیں کھل گئیں۔پورا اخبار رات کے واقع سے لبریز ہو رہا تھا۔اخبار کی خبروں کا اثر یہ ہوا کہ کچھ دیر بعد فون پر فون آنے لگے۔ہر کوئی رات کا واقع انہیں کی زبانی سننے کا آرزومند تھا۔کچھ وقت اور گذرا تو ملنے والوں کا آنا شروع ہوا۔بعد ازاں ملنے والوں کا تانتا لگ گیا۔تبھی کسی نے آ کر خبر دی کہ سوامی رامانند جی تشریف لائے ہیں۔یہ سنتے ہی حکم سنگھ ان کا خیر مقدم کرنے دیوان خانہ سے باہر آئے۔انہوں نے دیکھا لوگ ان کے پاؤں چھو رہے تھے اور سوامی جی ہاتھ اوپر کر کے آشیرواد دیتے ہوئے اوم شانتی، اوم شانتی کہتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔حکم سنگھ نے ہاتھ جوڑ کر نمشکار کیا۔سوامی جی نے اشاراً انہیں اپنے ساتھ آنے کو کہا۔سوامی جی آگے بڑھتے رہے۔حکم سنگھ ان کے پیچھے ہولیے۔لوگ اندر آنے کا حوصلہ نہیں کر سکے۔لوگ رُک گئے۔سوامی جی زینہ چڑھتے ہوئے حکم سنگھ کو مکان کی چھت پر لے آئے۔چھت پر آ کر انہوں نے آسمان کی جانب دیکھا اور ایک لمبا سانس لیا۔چہار سو دیکھ کر گویا ہوئے۔

آپ یہ سوچ رہے ہیں، میں آپ کو یہاں کیوں لے آیا۔

جی میں یہی سوچ رہا تھا۔

حکم سنگھ کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس گتھی کو سلجھانے میں مصروف تھے۔سوامی جی ان کی طرف مڑے اور کہا۔

نیچے،بہت سارے لوگ تھے۔

ہم کسی دوسرے کمرے میں۔۔۔

سوامی مسکرائے اور بولے۔

اس کمرے کو بھی تو دیواریں ہوتیں۔ کہتے ہیں نا، دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں، یہاں دیواریں ہیں نہ کان۔

سوامی جی آگے بڑھ کر منڈیر کے پاس آ کر رُکے۔ پھر مقصد پر آتے ہوئے کہا۔

دلاور کو کسی نے چاقو چلاتے دیکھا تو نہیں؟

اس کا دوست اس کے ساتھ تھا۔ میں نے اسے خبردار کر دیا ہے۔ وہ چپ رہے گا۔

آپ اپنے بیٹے کو کچھ دنوں کے لیے باہر بھیج دیں۔

جی؟

اور پھر قتل کو قانونی طور پر دفنانا تو ہوگا۔۔۔ اس کے لیے کسی کو اندر کرنا ہی ہوگا۔ کوئی جیل جائے گا تو اندھے قانون کا پیٹ بھرے گا اور جس کا پیٹ بھر جاتا ہے، وہ خاموش رہتا ہے۔

سوامی جی نے لوٹنے کے لیے زینہ کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔

بھگوان نے آپ کو اچھا موقع دیا ہے اور پرچناؤ میں۔ اس موت سے فائدہ لے لیں۔۔۔ سوامی جی اوم شانتی، اوم شانتی، اوم شانتی کہتے ہوئے زینہ اترنے لگے۔

کچھ سال پہلے تک سوامی رامانند کو اس شہر میں کوئی جانتا نہیں تھا۔ وہ یہاں کہاں سے آئے، کب آئے، وہ کتنے عالم ہیں۔ ان باتوں سے کوئی واقف نہیں۔ خود رامانند مُڑ کر اپنے ماضی کی طرف دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ شروع شروع میں وہ شہر کے نچلے اور درمیانے طبقہ کے ہندوؤں کے گھروں میں پروچن دیا کرتے تھے۔ وقت نے ساتھ دیا تو اونچے طبقہ کی سوسائٹی میں اپنے پاؤں پسار لئے۔ شہر کے مالدار تاجروں، کارخانہ داروں اور رئیسوں کی کوٹھیوں تک ان کی رسائی ہونے لگی۔ میڈیا اور اخبار والوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ان کے متعلق طرح طرح کے معجزہ خیز قصّے، کہانیاں لوگوں میں گردش کرنے لگیں۔ انہوں نے کٹّر مذہبی سوامی کی حیثیت سے اپنا مقام قائم کر لیا۔ ایسے دور میں ایک بڑے رئیس کی مجلس میں ان کی ملاقات حکم سنگھ سے ہوئی۔ حکم سنگھ نے ان کا بڑا نام سن رکھا تھا۔ ملے تو جیسے پہلی نظر میں ہی وہ انہیں اپنے کام کے نظر آئے۔ سوامی رامانند کی کائیاں نظروں نے بھی انہیں بھانپ لیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ حکم سنگھ سمجھ گئے یہ سنیاسی جتنا اپنے آپ کو کٹر مذہبی ظاہر کرتا ہے، اتنا کٹر نہیں ہے۔ یہ چُست موقع پرست ہے۔ ویسے ہی رامانند بھی سمجھ گئے، حکم سنگھ سیاسی عیار ہے۔ بہت جلد دونوں میں قربت پیدا ہوگئی۔ حکم سنگھ نے شہر کے قریب پچیس ایکڑ سرکاری زمین کوڑیوں کے دام رامانند کو آشرم کے لیے دلوا دی۔ آشرم کا نام شانتی دھام رکھا۔ جس کی رسم اجرا کے لیے وزیر اعلیٰ تشریف لائے تھے۔

سوامی رامانند کے جانے کے بعد حکم سنگھ نے اپنی پارٹی کے ممبران اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اسکول ماسٹر کی شمشان یاترا شان سے نکالی جائے۔ بعد میں اس شہر کے نامی گرامی ہندو، مسلمان عیسائی ہر قوم کے لوگوں کی ایک امن کمیٹی بنا کر عوام سے اپیل کی جائے کہ وہ شہر میں امن قائم کرنے میں ہمارا تعاون فرمائیں۔

صبح امجد میاں دکان پر پہنچے۔ اپنی نشست پر بیٹھ کر اخبار اٹھایا۔ صفحہ اوّل کی سرخیاں دیکھیں تو انہیں رنجش ہوئی۔ پورا صفحہ کل رات کو ہوئے قتل کو لے کر بھرا ہوا تھا۔ مرنے والے کے نام کا ذکر کہیں نہیں تھا۔ قتل کرنے کی تہمت مسلمانوں پر رکھی گئی تھی۔ کیوں کہ مرنے والے کی لاش کو ایچ۔ ایل۔ اے۔ حکم سنگھ کے دروازے پر پھینک دیا گیا تھا اور مرنے والا ہندو تھا۔ اخبار دیکھ کر ان کا موڈ خراب ہو گیا۔ صبح صبح وہی خبریں، جھگڑا، فساد، ہندو مسلمان۔۔۔ انہوں نے اخبار ایک طرف رکھا اور اپنے کام میں لگ گئے۔

دو پہر تک اڑتی اڑتی خبر ان کے کانوں تک آئی کہ مرنے والے کا نام شمشیر سنگھ تھا۔ ان کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ اُٹھے کاروبار کو درکنار کر کے منگو پہلوان کے گھر کی جانب نکل پڑے۔ منگو پہلوان ملا۔ اس نے رات پوری داستان کہہ سنائی۔ وہ پریشان ہو گئے۔ انہوں نے گھر آ کر بیوی کو تیار ہونے کو کہا اور شمشیر کے گھر جانے کے لیے آٹو تلاش کرنے لگے۔ شہر میں حالات بہت ہی تنگ تھے۔ دونوں قوموں کے لوگ آنکھیں سرخ کیے، باہیں چڑھائے بیٹھے تھے۔ کوئی آٹو نہیں ملا تو ٹیکسی کی طرف لپکے مگر کوئی آٹو یا ٹیکسی والا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں ہوا۔ شمشیر کے گھر تک وہ چل کر جا نہیں سکتے تھے کیا کریں؟؟ آخر کار انہوں نے اپنے علاقہ کے پولیس اسٹیشن جانے کی سوچی۔ اتفاقاً وہاں کا انسپکٹر ان کی پہچان والا نکلا۔ انہوں نے اسے پورے واقعات کہہ سنائے اور اس سے گزارش کی کہ وہ انہیں شمشیر کے گھر پہنچانے کا کچھ انتظام کر دے۔ انسپکٹر نے کوشش کر کے ایک ٹیکسی والے کو یہ کہہ کر جانے کے لیے راضی کیا کہ وہ ان کی حفاظت کے لیے ایک پولیس اہلکار ٹیکسی کے ساتھ دے گا۔

امجد میاں اپنی اہلیہ کے ساتھ شمشیر کے گھر پہنچے تب اس کے گھر کے سامنے لوگ جمع ہو رہے تھے۔ ٹیکسی سے اُتر کر امجد میاں کی بیوی تیز قدموں سے شمشیر کے گھر میں داخل ہوئی۔ اس نے دیکھا، سفید کپڑوں میں ملبوس شمشیر کی بیوی پلّو سے منہ ڈھانپے روتے روتے تھک کر سسکیاں لیتے بیٹھی تھی۔ کچھ سوگوار آب دیدہ عورتیں اس کے اطراف بیٹھی ہوئی تھیں۔ امجد میاں کی بیوی اپنے لیے جگہ بناتے ہوئے آہستہ سے اس کے پاس آ کر بیٹھی۔ شمشیر کی بیوی نے اسے دیکھا تو اس سے گلے لگ کر زار زار رونے لگی۔ امجد میاں کی بیوی نے اسے دلاسا دیتے ہوئے اس کی پیٹھ کو سہلانا شروع کیا تو اسے گھر چھوڑنے کے وقت شمشیر کا کہا جملہ یاد آ گیا ''بھرجائی دعا کرو، میں پھر لوٹ کر نہ آؤں'' امجد میاں کی آنکھوں میں آنسو بہہ نکلے۔ امجد میاں عورتوں کا ہجوم دیکھ کر کمرے کی چوکھٹ پر رُک گئے۔ پاس میں ٹھہرے آدمی سے معلوم ہوا کہ شمشیر کی لاش پوسٹ مارٹم ہونے کے بعد اب کسی بھی وقت آ سکتی ہے۔ امجد میاں کی نظر دیوار کا سہارا لے

کرشمشیر کے بیٹے پر پڑی۔ وہ اس کے پاس گئے وہ ان سے لپٹ کر رونے لگا۔ تبھی شمشیر کی لاش ایمبولینس سے اتار کر اندر لائی گئی۔ عورتوں کا رونا دھونا شروع ہوگیا۔ شمشیر کی بیوی پر غش طاری ہوگیا۔ امجد میاں نے اپنے دوست کا دیدار کیا ان کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ وہ باہر آ گئے۔ باہر گلی میں بھیڑ جمع ہوگئی تھی۔ امجد میاں اس ہجوم سے ہٹ کر ایک طرف تنہا ٹھہر گئے۔ کچھ ہی دیر میں انہوں نے محسوس کیا کہ لوگوں کی نظریں ان کی جانب اٹھ کر اشاروں کنائیوں میں آپس میں کچھ کہہ رہی ہیں۔ کچھ لوگ انہیں دیکھ کر کانا پھوسی کر رہے ہیں۔ امجد میاں کو وحشت ہونے لگی۔ تبھی یک بیک لوگوں کی توجہ دوسری جانب متوجہ ہوئی۔ سب کی نظریں سامنے سے آ رہے حکم سنگھ پر ٹک گئیں۔ حکم سنگھ اپنے معاون کے ساتھ چلے آ رہے تھے۔ ان کے معاون کی نظر امجد میاں پر پڑی۔ انہوں نے فوراً چشم و ابرو سے حکم سنگھ کی توجہ امجد میاں کی جانب دلائی اور ان کے بارے میں مختصراً سب کچھ کہہ ڈالا۔ حکم سنگھ نے اپنا رخ بدلا۔ وہ مسکراتے ہوئے امجد میاں کے پاس آ کر ان کا حال چال پوچھا۔ جیسے وہ ان کے شناسا ہوں۔ ان کے دوست کی موت پر اظہار افسوس کیا۔ امجد میاں نے بھی اپنے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے بولے کہ کل سارا دن شمشیر ان کے پاس ہی تھا۔

امجد میاں کی بات سن کر حکم سنگھ کچھ لمحے خاموش رہے، پھر گویا ہوئے۔

امجد صاحب، کچھ بھی کہیے۔ ایک شریف انسان کا قتل جس مسلمان نے کیا ہے اچھا نہیں کیا۔

حکم سنگھ کی زبانی یہ بات سن کر امجد میاں کے دل کو ٹھیس پہنچی۔ انہیں ان سے ایسی اُمید نہیں کی تھی۔ وہ ان کے اس الزام کو خارج کرتے ہوئے کل کے سارے واقعات انہیں کہہ کر سمجھا کہ انہوں نے اپنے قوم کی پیروی کر کے حکم سنگھ کی غلط فہمی کو دور کر دیا ہے۔

حکم سنگھ ٹک ٹکی باندھے انہیں دیکھتے رہے۔ انہیں راما نند سوامی کی کہی بات یاد آ گئی۔ ''قتل کو قانوناً دفنانا ہے تو کسی کو تو اندر کرنا ہی ہوگا''

حکم سنگھ خاموشی سے آگے بڑھ گئے۔ وہ لوگوں کے ساتھ گفتگو کرنے میں مصروف ہوگئے۔ تبھی انسپکٹر جادو آیا۔ اس نے حکم سنگھ کو سلام کیا۔ حکم سنگھ اس سے باتیں کرتے ہوئے ایک طرف لے گئے اور سرگوشی کرتے ہوئے کچھ ہدایت دینے لگے۔

امجد میاں کی بیوی رات شمشیر کی بیوی کے پاس رکنا چاہ رہی تھی مگر امجد میاں اس کے لیے راضی نہیں ہوئے۔ انہیں لوگوں کا رویہ بدلا ہوا نظر آیا۔ پھر شہر کے حالات کا اونٹ کب کس کروٹ بیٹھے گا اس کا کوئی یقین نہیں تھا۔ وہ کسی قسم کی مصیبت مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ شمشیر کی شمشان یاترا نکلتے ہی دل ہی دل میں اپنے یار کو الوداع کہہ کر وہ بیوی کے ہمراہ غمگین ہو کر گھر لوٹ آئے۔

امجد میاں گھر پہنچ کر آزردہ خاطر ذہن کو سازگار بنانے چھٹپٹانے لگے۔ تبھی اذان کی صدا سنائی دی۔ مغرب کا وقت ہو چلا تھا۔ ذہن کا سازگار کرنے کی مالک نے دعوت دی ہے سوچ کر وہ فوراً وضو کرنے بیٹھے۔ انہوں نے پانی کا لوٹا ہاتھ میں لیا تھا کہ دروازہ پر شدت سے کنڈی بجی۔ اوّل تو انہوں نے بیگم کو آواز دینے کی سوچی مگر دوبارہ کنڈی کھٹکی تو اس میں شدت زیادہ تھی۔ مجبوراً وہی اٹھے۔ دروازہ ابھی پورا کھلا بھی نہیں تھا کہ دروازہ دھکیل کر ایک پولیس افسر اور چار حوالدار اندر آ گئے۔ امجد میاں کچھ سمجھیں، پوچھیں اس سے قبل افسر نے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔

یہاں امجد بخاری کون ہے؟

جی، میں ہوں۔

تم شمشیر سنگھ کو جانتے ہو؟

جی، وہ میرا دوست تھا۔

کل وہ یہاں آیا تھا؟

جی۔

کیوں آیا تھا؟

مجھ سے ملنے آیا تھا۔

تحقیقی سوالوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ افسر کی آواز اونچی ہو کر گلی میں گشت کرنے لگی۔ امجد میاں کی اُلجھن بڑھتی گئی۔ آواز کی گونج سن کر ان کی بیگم دہلیز پر آ کر حیرت سے دیکھتی رہ گئیں۔ باہر گلی میں آتے جاتے لوگ تجسس گناں نظروں سے دیکھتے ہوئے رکنے لگے۔ تحقیقات کے دوران پتا چلا کہ امجد میاں نے کل رات شمشیر سنگھ کو منگو پہلوان اور لطیف کے ہمراہ اس کے گھر جانے کے لیے بھیجا تھا۔ فوراً افسر نے دو حوالداروں کو انہیں بلا لانے کے لیے روانہ کیا۔ مگر ان کے وہاں پہنچنے سے پہلے خبر ہوا کے دوش پر سوار ہو کر وہاں پہنچ گئی۔ وہ دونوں ڈر کے مارے بھاگ کھڑے ہوئے۔ حوالداروں کے لوٹنے تک گھر کی تلاشی لی گئی۔ شمشیر کی سائیکل ملی۔ تحقیقات اور سائیکل کا پنچ نامہ ہوا، پھر افسر نے امجد میاں کو ہتھکڑی پہناتے ہوئے کہا۔

میں تمہیں شمشیر سنگھ کے قتل کی سازش کرنے کے جرم میں گرفتار کرتا ہوں۔

امجد میاں کی بیوی یہ سن کر رونے لگی۔ اس کا کوئی پُرسان حال نہیں تھا۔ محلے والوں نے سنا اور دیکھا تو بات جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔

جب شمشیر کی بیوی ہوش میں آئی تو اس نے کھانا پینا ترک کر دیا۔ اس نے کل سے کچھ کھایا نہ پیا تھا۔ روتی رہی۔ آنسو تھے جو تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ پڑوس کی عورتوں نے اسے کھانے کو سمجھایا۔ وہ نہیں مانی۔ کم از کم دو گھونٹ پانی پینے کے لیے کہا مگر وہ راضی نہیں ہوئی۔ ایک بزرگ پڑوسن نے اسے سمجھاتے ہوئے نصیحت دی ''ایک نہ ایک دن تو سب کو جانا ہے۔ جانے والے کے لیے کھانا پینا چھوڑ کر تو ہم جی نہیں سکتے۔۔۔'' مگر شمشیر کی بیوی پر ان

باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔شمشیر کا بیٹا اشوک خوشک آنکھوں کے ساتھ ایک کونے میں گھٹنوں میں سر ڈالے سوچ سوچ کر تھک گیا تھا کہ اس کے باپ نے مسلمانوں کا کیا بُرا کیا تھا جو اس کا قتل کر دیا گیا؟ میرا باپ تو کسی میں بھی شامل نہیں تھا۔نہ تین میں نہ تیرا میں۔۔۔

اشوک اچانک چونکا۔اس نے دیکھا حکم سنگھ ہاتھ میں پکڑا اخبار اس کی جانب بڑھا کر کہہ رہا تھا۔

دیکھو بیٹے،تمہارے باپ کا قاتل پکڑا گیا ہے۔تم اخبار دکھاؤ اپنی ماں کو۔

اشوک نے اخبار لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اس کی ماں نے جھپٹا مار کر اخبار لے لیا۔اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا مگر اخبار میں چھپی قاتل کی تصویر دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔اسے یقین ہی نہیں ہوا۔اس کا دل کسی حال میں بھی اس آدمی کو قاتل قبول کرنے کو تیار نہیں تھا جس کی تصویر چھپی تھی۔مگر اس کا کیا؟ تصویر کے اوپر بڑے حرفوں میں چھپا تھا''امجد بخاری اپنے دوست کا قاتل'' نیچے لکھا تھا'' دوست نے سُپاری دے کر دوست کا قتل کروایا۔امجد بخاری پولیس کی حراست میں''

شمشیر کی بیوی چیخ اٹھی۔

نہیں یہ ممکن نہیں۔ایسا نہیں ہوسکتا۔

ایسا ہی ہوا ہے۔ماسٹر جی کا خون کروانے کے لیے امجد بخاری نے دو لوگوں کو سُپاری دی تھی وہ دونوں فرار ہیں۔

شمشیر کی بیوی نے یک لخط سوال کیا۔

بھائی صاحب حراست میں ہیں؟

ہاں۔حکم سنگھ نے کہا۔

شمشیر کی بیوی نے اچانک اپنے بیٹے کا ہاتھ پکڑا۔اسے کھینچتے ہوئے بولی۔

چل۔

وہاں موجود ہر کسی کو حیرت ہوئی۔کل سے سوگ میں بیٹھی بیوہ کو یک بیک ہیجان کہاں سے اور کیوں کر آ گیا!!

اشوک نے پریشان ہو کر ماں سے پوچھا۔

کہاں جانا ہے۔

تُو چل تو چل۔۔۔

ماں نے بیٹے کو کھینچنا شروع کیا۔اس کھینچا تانی کو دیکھ کر حکم سنگھ نے پوچھا۔

آپ اسے لے کر کہاں جا رہی ہیں؟

امجد بھائی کے گھر۔پولیس انہیں پکڑ کر لے گئی ہے۔بھابی گھر میں اکیلی ہوں گی۔اتنا کہہ کر اس نے زور لگا کر بیٹے کو کھینچا۔اشوک نے سبب جانا تو ماں کے ساتھ جانے کے لیے راضی ہو گیا۔

حکم سنگھ نے انہیں روکتے ہوئے کہا۔

اب وہاں کوئی نہیں ہے۔

کہاں گئے وہ؟

کل جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ ماسٹر جی کا قاتل امجد بخاری ہے تو رات کو انہوں نے ان کی دکان کو لوٹا اور گھر کو پھونک ڈالا۔۔۔

شمشیر کی بیوی کی آنکھیں خوف سے چوڑی ہو گئیں۔جسم کانپنے لگا۔حکم سنگھ نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔اور اس آگ میں اس کی گھر والی جل کر راکھ ہو گئی۔

شمشیر کی بیوی کا توازن ڈگمگا گیا۔وہ آنکھیں پھاڑے خلا میں دیکھتی رہی۔اس کی آنکھوں کے سامنے امجد میاں کا جلتا گھر نظر آیا۔اس میں اٹھتے شعلوں میں بھابی کو چیختے چلاتے آگ کی لپٹوں سے باہر آنے کو کوشاں دیکھا۔ان کے کپڑے جل رہے تھے۔آخری مرتبہ انہوں نے اللہ کو پکارا اور ڈھیر ہو گئیں۔

اس خیالی منظر کو دیکھتے ہوئے شمشیر کی بیوی کو دل کا شدید دورہ پڑا حرکتِ قلب رک گئی۔اس کا بے جان جسم فرش پر گر پڑا۔

اس غیر متوقع واقع سے وقتی طور پر حکم سنگھ بھی چکرا گئے۔انہیں ایسی توقع نہیں تھی۔مگر فوراً وہ سنبھل گئے۔ڈاکٹر کو بلا کر اس سے قدرتی موت کا سٹیفکیٹ حاصل کیا اور لاش کو سپرد آتش کرنے کا انتظام کروایا۔آٹھ دس لوگوں کو جمع کر کے لاش کو شمشان پہنچایا۔اشوک نے ماں کو آگ دی۔اس کی خشک آنکھوں کو چتا سے اٹھی لپٹوں میں امجد میاں کا چہرہ نظر آنے لگا۔اس کی آنکھوں میں وہ دہکتے ہوئے انگارے منتقل ہو گئے۔باقی بچی کھچی کسر حکم سنگھ نے مسلمانوں کے خلاف نفرت کا گرم شیشہ اس کے کانوں میں اُنڈیل کر پوری کر دی۔

اس روز حکم سنگھ اشوک کو اپنے گھر لے گئے۔دوسرے دن ایک خط لکھ کر اشوک اور کرما کو رامانند سوامی جی کے آشرم شانتی دھام منتقل کر دیا۔اشوک کو کٹرتا کی تربیت آشرم میں آسانی سے دی جا سکتی تھی اور کرما کو وہاں بھیج کر وہ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے تھے۔پہلا تو یہ کہ کرما کو اپنے سیاسی کاموں سے دور رکھتے ہوئے بھی اس پر نظر رکھ سکتے تھے۔دوسرا اس کے ذریعے رامانند کے کام کاج کی تفصیلی جان کاری بھی حاصل کی جا سکتی تھی۔انہوں نے اس خط میں لکھا تھا''سوامی جی۔نمستے! دو لوگوں کو آپ کے سپرد کر رہا ہوں۔ایک مرحوم شمشیر کا بیٹا اشوک ہے۔ماں باپ کے انتقال کے بعد یہ یتیم ہو گیا ہے۔آشرم میں اس کی تربیت کر کے اسے ہمارے کام میں مدد کرنے کے قابل بنا دیں،ایسا میں چاہتا ہوں دوسرا آدمی کرما ہے۔اسے آپ اپنے ماتحت رکھیں۔یہ ہمارے بیچ پٹل کا کام کرے گا۔پڑھا لکھا ہے۔کار چلا سکتا ہے۔آپ اس سے کوئی بھی کام لے سکتے ہیں۔۔۔حکم سنگھ''

''قیدِ جاں''

رب نواز مائل

(کوئٹہ)

کیسی باتوں کے ہوں اب جہاں میں ہمیں — جو نہ ہوں اِتنے تو ہر زیاں میں ہمیں
پہلے کیا نیندیں تھیں پہلے کیا راتیں تھیں؟ — جب کہ تھے ہر جگہ کیا اَماں میں ہمیں؟
کیا وہ یار اپنے ہیں کیا وہ شہر اپنے ہیں؟ — گو کہ ہیں ویسے تو قیدِ جاں میں ہمیں
کس نظارے سے تھا بت نہ سیرِ جناں — یا خدا! پھر سے ہوں اُس جہاں میں ہمیں

○

پرواز انبالوی

(انبالہ، بھارت)

سرگوشیاں تھیں گھر میں کوئی قہقہا نہ تھا — یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں بُجھا نہ تھا
سچ سوچنے پہ میری زباں کاٹ دی گئی — حالانکہ میرے منہ میں چراغِ صدا نہ تھا
اُس دَور میں بھی مَیں نے دُعائیں سُنیں گئی — جس دَور میں یقیں ابھی پڑا ہُوا نہ تھا
جیسے میں جھک گیا ہوں مقدّر کے سامنے — ایسے خدا کے آگے بھی کوئی جُھکا نہ تھا
شاید کسی کے پاؤں نے ٹھکرایا تھا اِسے — پتھر میں بھی زباں تھی مگر بولتا نہ تھا
باتیں بڑی پتے کی کئی کہہ گئے ہیں لوگ — جِس دَور میں زمیں پہ کوئی فلسفانہ تھا
بے مثل شعر کہہ گیا پروازؔ اُن دنوں — جب تک کلام اُس کا کہیں بھی چھپا نہ تھا

○

مسعود تنہاؔ

(سرگودھا)

کوئی جب مسکرا کر بولتا ہے — مرے دل کا کبوتر بولتا ہے
غرض ہی کیا ہے تم کو میرے دکھ سے — کہ تیرا تو مقدر بولتا ہے
امیرِ شہر سے خائف نہ ہونا — یہاں اب ہر سخنور بولتا ہے
مجھے شرمندگی ہے مفلسی میں — مرے در پر گداگر بولتا ہے
یقیناً میں اُسے پہچانتا ہوں — پسِ پردہ جو اکثر بولتا ہے
بہت خاموش رہتا ہے جو تنہاؔ — وہ محفل میں برابر بولتا ہے

○

پروفیسر زہیر کنجاہی (راولپنڈی)

مِری دعا ہے کہ تُو بھی کسی سے پیار کرے
مری طرح سے جیئے اور مری طرح سے مرے

کچھ اس طرح سے ہو بے چین اپنی ہستی میں
کہ آئینہ کبھی دیکھے تو خود سے بھی تُو ڈرے

خدا کرے کہ نہ وہ دِن ترِے نصیب میں ہوں
جو دن گزار چکا ہوں مَیں پیار میں ترے

یہ میری بھول تھی تجھ کو میں دل ہی دے بیٹھا
دُعا ہے تو بھی یہی بھول زندگی میں کرے

سنبھل سنبھل کے قدم رکھ رہا ہوں دھرتی پر
کہ کوئی میرا تعاقب کرے، خدا نہ کرے

جو میرا عکس پڑا تھا ترے سراپا پر
خدا کرے کہ تُو اس عکس میں بھی آگ بھرے

گھنیرے سائے ملے تھے زہیر کو جن کے
نہ تیرے بخت میں ہوں اس طرح کے پیڑ ہرے

○

نعیم الدین نظر (میر پور خاص)

کون بچھڑا ہے کاروانوں سے
خون ٹپکا تھا آسمانوں سے

بوجھ دل پر رہا نتیجوں کا
روح چھلنی ہے امتحانوں سے

پاؤں میں بیڑیاں تھیں غربت کی
کچھ خریدا نہیں دکانوں سے

کتنے کردار مر چکے ہوتے
لوگ زندہ ہیں داستانوں سے

ڈر گیا ہوں کھلی فضاؤں میں
میری نسبت ہے قید خانوں سے

چھوٹے بچوں کو مسکرانے دو
یہ گذارش ہے حکم رانوں سے

پھر عقیدت سے جھک گئی تھی نظر
جب وہ نکلے زنان خانوں سے

○

عرش صہبائی (جموں، کشمیر)

زندگی کی ہو کیا تفسیر کہاں رہتی ہے
ناؤ یہ وقت کی موجوں پہ رواں رہتی ہے

وہ اُچٹتی سی نظر رنگ فشاں رہتی ہے
رو بہ رُو جیسے کوئی کہکشاں رہتی ہے

حادثے ایسے کہ میں گزرا ہوں جن سے اکثر
داستان ان کی اِن ہونٹوں پہ رواں رہتی ہے

ہر خوشی مجھ سے ہے حد درجہ کشیدہ خاطر
مجھ کو معلوم نہیں ہے یہ کہاں رہتی ہے

دُور تک نظروں میں اک دُھندسی ہے چھائی ہوئی
جو حقیقت بھی ہے وہ مثلِ گماں رہتی ہے

ہم کو اُلجھائے سے رکھتے ہیں مسائل کتنے
کوئی بھی بات ہو اب یاد کہاں رہتی ہے

گلستاں میں نہیں ہے آشیاں کوئی محفوظ
تاک میں شام و سحر برقِ تپاں رہتی ہے

اس کا حالات سے ہرگز نہیں رشتہ کوئی
دل میں جذبات کی ندی ہے رواں رہتی ہے

عرشؔ جب ذہن میں رہتا ہو اک بکھراؤ سا
ایسی صورت میں طبیعت بھی گراں رہتی ہے

○

ناصر علی سیّد (پشاور)

کب کہا تھا کہ مجھے وہم و گماں کھینچتا ہے
ہاں ترا ہجر مسلسل مری جاں کھینچتا ہے

تو کہ اس وادیٔ حیراں میں الگ مجھ سے ہوا
نیلے پربت کو جہاں زرد دھواں کھینچتا ہے

جھیل اور چاند کے منظر میں اکیلا ہوں کھڑا
یاد ہے تو نے کہا تھا یہ سماں کھینچتا ہے

کن خرابوں میں محبت تری لے آئی ہے
دل مجھے روکتا ہے، کارِ جہاں کھینچتا ہے

آج آئینہ نے مجھ سے یہ عجب بات کہی
چہرہ بجھتا ہے تو پھر کارِ زیاں کھینچتا ہے

میں تو بس ایک ہی لمحے کا یہاں ہو جاتا
کشتیٔ جاں کو مگر وقتِ رواں کھینچتا ہے

پابجولاں میں چلا آیا تو ہوں محفل میں
دیکھ دیوانے کو اب کون کہاں کھینچتا ہے

ابراہیم عدیل (جھنگ)

صرف تیرا قیاس پہنیں گے
پیڑ جو بھی لباس پہنیں گے

لوگ بستی کے ہو گئے بے حس
جانے کب وہ حواس پہنیں گے

بارشیں کب نصیب ہیں اُن کو
وہ تو صحرا ہیں پیاس پہنیں گے

آگ دنیا کی بجھ نہیں سکتی
لوگ جب تک کپاس پہنیں گے

ہم نے پالا اِسے لہو دے کر
اپنی دھرتی کی گھاس پہنیں گے

پھول موسم کبھی جو آئیں گے
تیری یادوں کی باس پہنیں گے

تیری محفل سے جو بھی نکلیں گے
گردِ محفل نراس پہنیں گے

شام رنگوں میں جل بجھے منظر
بس ترے غم شناس پہنیں گے

حکم جاری نہیں کریں گے عدیلؔ
ہم فقط التماس پہنیں گے

نورزمان ناوک (تلہ گنگ)

بن کے اک رنگِ صدا سنّاٹا
دُور تک پھیل گیا سنّاٹا

سامنے گاؤں تھا آوازوں کا
جب مسافت پہ کھلا سنّاٹا

حسنِ اظہار کہاں تھا اُس میں
ہم سے جب تک نہ ملا سنّاٹا

رات بھر بجتی رہی شہنائی
پھر بھی موجود رہا سنّاٹا

کر دیا چیخ نے کِرچی کِرچی
جونہی اک مُوڑ مُڑا سنّاٹا

اپنے اظہار سے پہلے اس نے
خود سے تخلیق کیا سنّاٹا

یونہی صحرا میں رہے سرگرداں
اپنے اندر تھا بلا کا سنّاٹا

جب کوئی بول رہا تھا مجھ میں
چارسو میرے رہا سنّاٹا

دن کا مطلوب ہے غوغا ناوکؔ
رات کا حرفِ دعا سنّاٹا

اسداعوان (سرگودھا)

برسرِ معرکہ راہوار کی بولی نہ لگا
رزم میں بندۂ جرار کی بولی نہ لگا

بیچ دی میں نے سپر اپنی ضرورت کے عوض
اب مری زرہ و تلوار کی بولی نہ لگا

حُر نکل آیا ہے باطل کی رعونت سے الگ
ایسے جانباز و علمدار کی بولی نہ لگا

یہ وفادار اثاثہ ہیں میرے لشکر کا
جا چلا جا میرے انصار کی بولی نہ لگا

سارباں نکلے مری سمت سے لڑنے کے لیے
میری افواج کے سالار کی بولی نہ لگا

راہ میں بھیڑ رہی تیرے گزر جانے تک
خود نمائی سے تو کردار کی بولی نہ لگا

تیری آنکھوں میں بھی اب پھیلا ہوا ہے کاجل
ہجر میں جذبۂ اظہار کی بولی نہ لگا

ایسی رنگین جوانی ہے کہاں دنیا میں
اپنے اس حسین طرح دار کی بولی نہ لگا

یہ تو ہے نوحہ کناں مرگِ محبت پہ اسدؔ
میری غربت کی عزادار کی بولی نہ لگا

سیفی سرونجی (سرونج، بھارت)

دل میں حسرت تھی کہ ایسا ہوتا
سر پہ ماں کا مری سایہ ہوتا

خوب ملتی تمہیں عزت شہرت
دل کتابوں سے لگایا ہوتا

کس طرح عمر گذاری ہم نے
آ کے اکبار تو دیکھا ہوتا

عیب سب کے تو گنائے ہیں بہت
اپنے اندر کبھی جھانکا ہوتا

بات کرتے جو ہمیشہ ہی
شعر کہنا تمہیں آیا ہوتا

تم کو پایا تو خزانے پائے
ورنہ کچھ بھی نہ پایا ہوتا

سکۂ وقت نہیں ہے سیفیؔ
اسکو سونے میں نہ تولا ہوتا

رومانہ رومی (کراچی)

مدارِ ذات کے گرداب سے نکل آؤں
میں اپنی ذات کے اسباب سے نکل آؤں

بس ایک بار تُو پانی پہ اپنا عکس دکھا
قسم خدا کی میں سیلاب سے نکل آؤں

جو محوِ رقص نہ ہوں میری روح کے ہمراہ
میں ایسے حلقۂ احباب سے نکل آؤں

میں اپنی ہستی کو اپنی نگاہ سے دیکھوں
تمنا ہے مری میں خواب سے نکل آؤں

ترا تو لہجہ بہت دِل شکن ہے اے جاناں!
تری کہانی کے ہر باب سے نکل آؤں

جو ترے لمس کی حدت کو جیت لوں تو میں
پھر اپنی ذات کے برفاب سے نکل آؤں

گندھا ہوا ہے مری ذات کے خمیر میں یہ
میں کیسے عالمِ اسباب سے نکل آؤں

یہ روشنی مری تہذیب کا تو حاصل ہے
میں کیسے حلقۂ آداب سے نکل آؤں

جو میرا پیار ہے رومیؔ! اگر کبھی مل جائے
میں اپنی ذات کے ہر خواب سے نکل آؤں

○

تصورِ اقبال (اٹک)

میں اپنا ترجمان ہوں ولیکن بے زبان ہوں
یقیں ہوں یا گماں ہوں بہ رنگِ کہکشاں ہوں
بصارت کا نشان ہوں بصیرت کا جہاں ہوں
بہ ربطِ جسم و جاں ہوں مگر اجڑا مکاں ہوں
بلا تفریق سب پر میں اک سا مہرباں ہوں
جو مجھ سے بدگماں ہے میں اُس سے بدگماں ہوں
جواں ہیں میری سوچیں کہ میں خود بھی جواں ہوں
زمیں ہے میری اپنی مگر میں بے اماں ہوں
میں کل تو ایک گُل تھا مگر اب گلستاں ہوں
نہیں منزل کی خواہش میں گردِ کارواں ہوں
نہیں ہے سر تو باقی ولیکن سرگراں ہوں
میں اک دریا کی صورت تصوؔر جی رواں ہوں

شگفتہ نازلی (لاہور)

رَستے، دریچے، بیلوں میں چھپتی ہوئی ملی جانے کیا جھانکتی پھرے تھی، یادوں کی کلی
کچھ ذکر ایسا تھا کہ لمحے بیتتے ہی گئے باتوں ہی باتوں میں نجانے شام کب ڈھلی
نقش ونگار چہرے کے، دُھندلائے تھے رہے تا آنکہ روبرو مرے شمع تھی اک جلی
یکدم سے آس پاس کا منظر بدل گیا دستِ صبا کے پیار سے کھڑکی تھی جب کھُلی
مانوس ہونے میں ذرا کچھ وقت تھا لگا تھی روشنی میں سانولی سی شام بھی کھُلی
جو آتے جاتے رہتی تھی رستے میں جوں بچھی ڈھونڈے سے بھی ملی نہیں وہ بھولی سی گلی
کوشش کے باوجود بھی بے سُود ہی رہا ہونٹوں پہ اُس کے پھر بھی تھی، مسکان نہیں کھِلی
لگتا تھا اپنے آپ سے بیگانہ ہو چلے پُروائی سوچ کی ہمیں لے کر کہاں چلی!

نوید سروش (میرپورخاص)

آنکھیں بنجر، ذہن پریشاں دل ویران ہو جاتا ہے فرقت کے لمحوں میں دیکھو کیا انسان ہو جاتا ہے
شعر، غزل اور نظم کبھی جو تیری خاطر لکھتا ہوں تیرے بچھڑنے پر وہ بھی میرا دیوان ہو جاتا ہے
بھیگ رہے ہیں نوحہ خوانی کی بارش میں لوگ تمام شہر کا شہر ہی اس عالم میں لہوہان ہو جاتا ہے
ہم نے اکثر دیکھی ہے، یہ پیار کے جادو میں تاثیر وہ دیرینہ دشمن بھی پھر مہربان ہو جاتا ہے
شہروں میں یہ خوف و دہشت موت کا گہرا سناٹا کچھ حالات کے ٹھیک ہونے کا امکان ہو جاتا ہے

○

ہوا کے دوش پر

(ایک عام آدمی کی داستان حیات)

فیروز عالم

(کیلی فورنیا ٗ امریکہ)

قسط......۱۸

پہلا سال ختم ہوا۔تقریباً تمام لڑکوں کے لئے یہ مشکل سال تھا اس لئے کہ سارے ہی مضامین نئے تھے اور طلبہ کی ایک بڑی تعداد کے لئے یہ شہر اور یہ ماحول بھی نیا تھا کہ ہمارے ساتھ مشرقی پاکستان، بلوچستان، پنجاب، فلسطین، ایران، سری لنکا اور افریقی ممالک کے لڑکے بھی تھے۔جب مجھے، جو اپنے شہر سے صرف چالیس میل دور تھا، اس قدر گھر اور اپنے شہر کی یاد ستاتی تھی تو یہ لوگ تو اپنے وطن سے بہت دور تھے۔شاید اسی لئے جب امتحان ختم ہو کر چھٹیاں شروع ہوئیں تو ایک ہجوم تھا جو ہاسٹل کو خالی کر کے اپنے اپنے گھروں کو لوٹنے کی جلدی میں تھا۔مگر پھر یہ اعلان ہوا کہ چونکہ داخلے کی نئی پالیسی کی وجہ سے ہمارا تعلیمی سال دو مہینے تاخیر سے شروع ہوا تھا اس لئے چھٹیاں صرف دو ہفتے کی ہونگی اور چونکہ ”دماغ“ کی تشریح (DISSECTION) نہیں ہو پائی ہے اس لئے تمام طالب علم دو ہفتے کے بعد رپورٹ کریں اور دماغ کا ڈسکشن کریں۔اس سے بہت سے لڑکوں کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔میں تو اس سے بہت ہی جلبلایا اور میں نے اسی وقت فیصلہ کیا کہ میں ہرگز اپنی چھٹیاں قربان نہیں کرونگا اور پورے دو ماہ گذار کر واپس آؤنگا۔خوش قسمتی سے یہ کورس بڑی حد تک اختیاری تھا اور اسے بعد میں بھی پورا کیا جاسکتا تھا۔مگر وہ تمام لڑکے جو بڑے ”پڑھاکو“ تھے انہوں نے گھر جانا ملتوی کیا اور وہیں ڈیرہ ڈال دیا۔

گرمیوں کی چھٹیاں

میں تو ہمیشہ چھٹیوں کا بے چینی سے انتظار کیا کرتا تھا۔پہلے کچھ دن میرپورخاص میں گذار کر میں کراچی پہنچا۔اسی زمانے میں میرے ماموں زاد بھائی ذاکر محمد قریشی کی نئی نئی شادی ہوئی تھی اور انہوں نے ایک بہت خوبصورت بنگلہ ناظم آباد نمبر ایک میں کرائے پر لیا تھا۔انکی بیگم سلمٰی بھابی بہت ہی پیاری اور ہر ایک سے دوستی کرنے کی دلدادہ تھیں۔ذاکر بھائجان بھی ہمارے خاندان میں اپنی ذہانت کی وجہ سے مشہور تھے اور انہوں نے ۱۹۵۷ء میں کراچی کے NED کالج سے انجینئرنگ پاس کی تھی۔سلمٰی بھابی نے گھر اور خاص طور سے ڈرائنگ روم بہت ہی خوبصورتی سے سجایا تھا۔اس میں لیمن کلر کا دیوار تا دیوار کارپٹ تھا جو آج بھی میرے ذہن پر نقش ہے کیونکہ اس سے پہلے میں نے ایسا خوبصورت قالین نہیں دیکھا تھا۔ذاکر بھائی جان کے ساتھ ماموں جان کا باقی کنبہ بھی تھا جس میں میری فرسٹ کزن غزالہ بھی شامل تھی جسکا تذکرہ کچھ تفصیل چاہتا ہے۔

میری بہن، میری کزن اور میری دوست غزالہ

غزالہ، مجھ سے دو سال بڑی ہے اور میں بچپن سے اس سے بہت قریب رہا ہوں ادھر اس نے بھی ہمیشہ مجھ سے بے حد محبت کی ہے۔اب سالوں سے میرا اس سے ملنا نہیں ہوا ہے مگر میں جس زمانے کی بات کر رہا ہوں میں اس سے بہت قریب تھا۔آج بھی میرے دل میں اس کے لئے وہی محبت اور عزت ہے۔میں میڈیکل کالج سے جب بھی کراچی آتا، ہم طرح طرح کے تفریحی پروگرام بناتے۔کبھی فلموں کے پروگرام، کبھی شام کو چورنگی، جو اس زمانے میں صدر کی ایلفنسٹن اسٹریٹ کا مقابلہ کرتی تھی، کی سیر اور وہاں چاٹ، تکّے کباب اور دوسرے لوازمات سے لطف اٹھانا اور کبھی صدر میں میوزیکل فاؤنٹین کے قریب مٹرگشت کرنا۔اس کے علاوہ اس زمانے میں ”ایک آنہ“ لائبریریوں کا بڑا رواج تھا اور ہم دونوں کو ناولوں کا چسکا پڑ گیا تھا اس لئے دت بھارتی، گلشن نندہ، اے آر خاتون، زبیدہ خاتون، ڈاکٹر ذکاء الرباب اور دوسرے مصنفوں کی کتابیں اور ان پر دیر گئے تبصرہ ہمارا معمول تھا۔اللہ نے غزالہ کو جس قدر ظاہری حسن سے مالا مال کیا تھا وہ باطنی طور سے بھی اسی قدر خوبصورت شخصیت کی مالک تھی۔اسکا بھی خواب ڈاکٹر بننا تھا مگر انٹر سائنس میں چند نمبروں کی کمی سے وہ ڈاؤ میڈیکل کالج میں داخل نہ ہو سکی تھی اور اب کراچی یونیورسٹی سے کیمسٹری میں آنرز کر رہی تھی۔اسکی کئی سہیلیاں تھیں مگر ان میں امتیاز سب سے زیادہ چرب زبان، چلبلی اور شریر تھی (امتیاز کے والد کو لڑکوں کا شوق تھا اسلئے وہ ہر لڑکی کی پیدائش پر اسکا نام لڑکوں پر رکھتے تھے اسکی باقی بہنوں کے نام بھی عدیل، عقیل اور شکیل تھے)۔میں ان سب کے ساتھ صرف گھومنے کی غرض سے کراچی یونیورسٹی جاتا تھا۔اُس زمانے میں کراچی یونیورسٹی کا ماحول اس قدر دلنواز اور رومانٹک تھا کہ ایسا لگتا تھا کہ کسی فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہو۔اس مرتبہ اس کی سہیلیوں نے میری خاص آؤ بھگت کی کہ اب میں ”میڈیکل کالج“ کا پر وقار طالب علم تھا۔رات کو اس کی چند سہیلیاں آجاتیں اور ہم پہلے تو سڑک پر ایک لمبی چہل قدمی کرتے اور اس کے بعد گھر کے باہر پڑی بجری پر جو اس وقت بیحد ٹھنڈی ہو جاتی، بیٹھ کر رات گئے خوش گپیاں کرتے۔سب لڑکیاں میری لفاظی اور داستان گوئی سے بہت محظوظ ہوتیں۔اس وقت غزالہ مجھے چھیڑنے کے لئے کہتی ”بھئی تم تو راجہ اندر بنے بیٹھے ہو“

اسی دور کی ایک اور خوشگوار یاد میرے کزن انصار بھائجان کی شادی ہے۔انصار بھائجان میرے بڑے بھائی سلطان بھائی جان سے ذرا ہی چھوٹے تھے اور ان دونوں کی بڑی دوستی تھی۔وہ شائد خاندان میں سب سے

زیادہ چہیتی شخصیت تھے۔ یہ شادی اس لئے بھی قابل ذکر تھی کہ ان کی شادی ان کی ماموں زاد بہن سے سارے خاندان بلکہ یوں کہا جائے تو زیادہ درست ہے کہ ساری دنیا کی مخالفت کے باوجود ہو رہی تھی اور انہوں نے ایک بڑا میدان جیتا تھا۔ میں اسکو مختصر یوں بیان کرسکتا ہوں کہ انکی ہونے والی دلہن پر ہندوستانی فلم ناگن کا یہ گیت صادق آتا ہے

اونچی اونچی دنیا کی دیواریں سیاں توڑ کے
میں آئی رے تیرے لئے سارا جگ چھوڑ کے

بہرحال میری اس سے یہ خوبصورت یاد وابستہ ہے کہ جب میں ان کے گھر پہنچا تو ان کے یہاں مایوں کی تقریب تھی۔ یو پی کی روائت میں مایوں کے دن بڑی بے تکلفی سے ایک دوسرے کو پکڑ کر ابٹن میں لتھیڑ دیا جاتا ہے۔ ایک عجیب غل غپاڑہ تھا۔ اس تقریب میں خاص طور سے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے کو نشانے پر رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ میں ایک نہایت شفاف اور استری اور کلف لگی سفید قمیض پہنے تھا اور ایسی ہی چاکلیٹی پتلون میں ملبوس تھا۔ اگرچہ کئی لڑکیوں کی مجھ پر نظر تھی مگر ایک تو میرے کپڑے بہت اچھے تھے اور انہیں ابٹن میں لتھیڑنے کی ان میں ہمت نہیں تھی۔ اس کے علاوہ اب وہ مجھ سے کچھ مرعوب بھی تھیں کہ میں ڈاکٹر بننے والا تھا۔ کچھ کھسر پھسر ہوئی اور پھر میری ایک کزن راحیلہ جو بڑی پرجوش لڑکی تھی نے آناً فاناً مجھے دبوچ کر جو میرے ابٹن لگایا ہے تو یوں سمجھئے کہ اس نے مجھے بری طرح لتھیڑ دیا۔ اس کے بعد ہال دیر تک قہقہوں سے گونجتا رہا جس میں ہمارے بزرگ بھی شامل ہو گئے تھے۔ اب راحیلہ کے ماشاء اللہ پوتے پوتی بڑے ہو چکے ہیں مگر مجھے وہ خوبصورت لمحہ نہیں بھولتا۔ یہ ایک محبت اور خلوص کا دور تھا جس میں نیتیں اور دل بالکل صاف اور شفاف تھے۔

واپسی

انہی پُر مسرت لمحات میں دو ماہ آنکھ جھپکتے گزر گئے اور میں واپس میر پور خاص آیا۔ جلد ہی میڈیکل کے سال اوّل کا نتیجہ اخبارات میں شائع ہو گیا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں پاس ہو گیا تھا مگر صرف پاس۔ میری کوئی پوزیشن نہیں تھی جس کی مجھے امید بھی نہیں تھی۔ میں تو فیل ہوتے ہوتے بچا تھا مگر خدا کا شکر ہے کہ اس پاس ہونے کے نتیجے میں میرا وظیفہ برقرار تھا۔ اس سال داؤد جو میرے قریبی دوستوں کے حلقے میں شامل تھا نہ صرف اوّل آیا تھا بلکہ اس نے گولڈ میڈل بھی جیتا تھا۔ منیر عباسی دوم اور جھامن داس منجانی کی تیسری پوزیشن تھی۔ اب دوسرا سال شروع ہونا تھا۔

نجمہ شیخ کی میرے گھر آمد

اس واقعہ کو لکھنے سے پہلے میں کئی روز ایک کش مکش میں گرفتار رہا کہ آیا اسے قلمبند کروں یا نہیں کیونکہ یہ واقعہ میرے لئے بڑی حد تک باعث شرم ہے۔ مگر آخر کار یہ فیصلہ کیا کہ چونکہ میں نے اس سرگزشت کو لکھنے سے پہلے اس بات کا عہد کیا تھا کہ میں پوری دیانت داری اور سچ کے ساتھ اپنی زندگی کا ہر قابل ذکر واقعہ تحریر کرونگا میں اس واقعہ کو بھی قارئین کی نذر کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ مجھے اس بات سے بھی تقویت ہے کہ اس واقعہ کے حوالے سے میں بالکل بے قصور تھا اور میرا ضمیر بالکل صاف ہے۔ میڈیکل کالج کے پہلے سال کے دوران میرا نجمہ سے کوئی بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق نہیں رہ گیا تھا کہ نہ تو میں اس سے کسی مقابلے میں شریک تھا نہ ہی وہ کسی گنتی میں شامل تھی۔ کلاس کی چند ذہین اور غیر نصابی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والی لڑکیوں میں اس کا کوئی شمار نہ تھا اور بہت سے لڑکے تو اسے جانتے بھی نہیں تھے۔ میں یہ تو نہیں کہونگا کہ وہ آگ جو میرے دل میں تھی وہ مکمل بجھ گئی تھی مگر اس کی حدت بڑی حد تک کم ہوگئی تھی۔ مگر مجھے وہ زمانہ اب بھی یاد تھا کہ میں ہر جاگتے لمحے صرف اسی کے خواب دیکھتا تھا اور مجھے کسی قدیم شاعر کا یہ شعر بار بار ستاتا تھا کہ

ہم بند کئے آنکھ تصور میں پڑے ہوں
ایسے میں کوئی چھم سے جو آ جائے تو کیا ہو

یعنی میرے دل میں ایک شدید خواہش تھی کہ کاش اچانک وہ ہمارے گھر آ جائے اور میرے کنبے کے درمیان بیٹھ کر پیاری پیاری باتیں کرے اور ہم اس کی چائے سے تواضع کریں۔ بظاہر یہ ناممکن تھا۔

گرمیوں کی ان چھٹیوں میں ایک شام جب میں اپنے نیم کے نیچے بیٹھا تھا ایک نہایت خوبصورت تانگہ چھم چھم کرتا ہمارے گھر کے سامنے آ کر رکا۔ میں نے حیران ہو کر دیکھا۔ اس میں سے تیزی سے تین خواتین اتریں۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا، یہ نجمہ، اس کی بڑی بہن اسماء اور اس کی والدہ تھیں۔ میں ابھی ہکّا بکا ہی تھا کہ اس کی ماں نے نہایت جارحانہ طریقے سے میری کلائی پکڑی اور مجھے گھسیٹتے اور یہ کہتے ہوئے گھر کے اندر لے کر چلی کہ کہاں ہے تیری ماں، میں اس سے بات کرونگی۔ میں تو فکر اور شرمندگی سے سفید پڑ گیا تھا۔ اندر پہنچ کر نجمہ میری ماں کے گلے لگ کر زار زار رونے لگی اور بس یہی کہتی رہی کہ فیروز نے میری زندگی مشکل کر دی ہے یہ مجھے چھیڑتا ہے اور اب تو اس نے ایسی حرکت کی ہے کہ میں بتا بھی نہیں سکتی۔ میری والدہ تو جلاّد تھیں اور انہوں نے زندگی میں ہمیشہ اعلیٰ قدروں کی پاسداری کی تھی۔ وہ لمحہ شاید میری زندگی کا مشکل ترین لمحہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میری امّاں مجھے کالج سے اٹھا لینگی اور میں در در کی ٹھوکریں کھاؤنگا۔ میں اس بات پر بھی حیران تھا کہ بات کیا ہے۔ میں تو اس کو چھیڑنا تو بڑی بات ہے قابل غور بھی نہیں سمجھتا۔ بہرحال اس کی ماں نے کہا معافی مانگ اس سے۔۔۔ ادھر میری امّاں نے بھی کہا ''ہاں معافی مانگ۔۔ ابھی مانگ'' میں ابھی تک دم بخود تھا۔ اس پر میری امّاں نے میرا کالر پکڑ کر جھٹکے دئے اور کہا معافی مانگتا ہے یا نہیں۔ میں نے آنسو بھری آنکھوں اور انتہائی مجبوری کے عالم میں معافی مانگی۔ اس وقت تک اس کی ماں نے میری کلائی نہیں چھوڑی تھی۔ معافی کے بعد وہ تینوں اسی تانگے میں بیٹھ کر گھوڑے کی گردن اور پیروں میں لگے گھنگروؤں کی آواز میں چھم چھم کرتیں نظر سے اوجھل ہوگئیں۔ مگر

ہمارے کنبے کے لئے اب ایک بڑا سخت لمحہ فکریہ تھا۔ میری بھی بہنیں تھیں اور یہ سندھی فیملی تھی جن کا بدلہ مشہور تھا۔ میں نے اپنے دوست اشفاق بیگ سے مشورہ کیا۔ اس نے کہا تمہاری امّاں کو اس کے گھر جا کر اسکی ماں کو مستقبل کی یقین دہانی کروانی چاہئے اور درخواست کرنی چاہئے کہ اب یہ معاملہ یہیں ختم ہو جائے۔ اشفاق نے کہا کہ اخلاقی مدد کے لئے میری بھابی تمہاری امّاں کے ساتھ چلی جائیں گی۔ دوسرے دن اشفاق کی بھابی میری امّاں کو لے کر اس کے گھر گئیں اور یہ معاملہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوا۔ مگر میرے لئے یہ آج بھی ایک معمہ ہے کہ نجمہ نے ایسا کیوں کیا جبکہ اس پورے سال میرا نجمہ سے کوئی واسطہ نہ تھا اور میں نے اس کے ساتھ کوئی غیر اخلاقی حرکت نہ کی تھی۔ ویسے بھی یہ الزام میری شخصیت اور کردار ہی کے خلاف تھا۔

دوسرا سال

دوسرے سال میں فزیالوجی اور فارماکولوجی کے مضامین تھے۔ ان دونوں مضامین کے ڈپارٹمنٹ کالج کی دوسری منزل پر تھے۔ ان کی لیبارٹیریز اور لیکچر آڈیٹوریم بھی اناٹومی کے طرز پر عالیشان تھے۔ ان دونوں شعبوں کے سربراہ اتفاق سے ایک ہی نام کے یعنی ''زیدی'' صاحبان تھے مگر نام کی مماثلت کے سوا دونوں کی شخصیات ایک دوسرے کے بالکل برعکس تھیں۔ ایک عمر رسیدہ تھے اور دوسرے نسبتاً کم عمر اس لئے ''بڑے زیدی'' اور ''چھوٹے زیدی'' کہلاتے تھے۔

بڑے زیدی صاحب کا پورا نام شہنشاہ حسین زیدی تھا۔ وہ لکھنؤ سے تھے اور بڑے ہی مغرور اور خود کو بہت کچھ سمجھنے والوں میں تھے۔ خود ہی کہتے تھے ''میں شہنشاہ ہوں''۔ لڑکوں کی ان سے جان جاتی تھی۔ کلاس میں سوٹ میں ہوتے تھے مگر شام کی تمام تقریبات میں شیروانی اور لٹھے کا سفید بڑے پائینچے کا پاجامہ پہنتے تھے۔ ان سے پہلے ان کے ڈمانسٹریٹر ''وکیل صاحب'' حاضری لیتے تھے اور لڑکوں کو انکے آنے والے لیکچر سے ڈراتے تھے۔ یہ وکیل صاحب بھی عجیب ہستی تھے۔ انتہائی غیر حاضر دماغ اور بھلکڑ۔ شکل کے بھی معمولی اور کپڑے بھی عجب اول جلول پہنتے تھے۔ سنا ہے ڈاکٹری ختم کرنے کے بعد لا کالج جا کر قانون کی ڈگری لی تھی اور خود کو ڈاکٹر کے بجائے وکیل صاحب کہلانا زیادہ پسند کرتے تھے۔ بڑے زیدی صاحب کا پڑھانے کا بھی طریقہ عجیب تھا۔ انہوں نے پاکستان بننے سے پہلے جب وہ لکھنؤ کے کالج میں پروفیسر تھے کچھ نوٹس بنالئے تھے اور صرف انہی سے پڑھاتے تھے۔ اس زمانے میں پورے ہندوپاکستان میں ''چٹرجی'' کی لکھی فزیالوجی کی کتاب معیاری سمجھی جاتی تھی اور ہر کالج میں وہی چلتی تھی۔ انہوں نے اس پر سخت پابندی لگادی تھی۔ وہ کہتے تھے چٹرجی دراصل ''گٹرجی'' ہے۔ اس کے علاوہ مسئلہ یہ تھا کہ جب وہ زبانی امتحان لیتے تھے تو صرف وہی الفاظ سننا چاہتے تھے جو سال بھر انکی زبان سے نکلے ہوئے ہوں۔ اسی کے ساتھ انہوں نے اس سال ایک کتاب MODERN MEDICINE AND ANCIENT THOUGHTS لکھی تھی جس کا فزیالوجی کے علم یا سائینس سے تو کوئی تعلق نہ تھا مگر یہ ایک طرح سے ڈاکٹری کی تاریخ تھی۔ ان کا یہ بھی اصرار تھا (جس کا اطلاق انکے ڈمانسٹریٹر کرتے تھے) کہ ہر لڑکا یہ کتاب خریدے ورنہ اسے فیل کر دیا جائے گا۔ اپنے الفاظ کو طالب علموں سے دہروانے کا یہ عالم تھا کہ ایک دن مکئی کی وجہ سے ہونے والی بیماری کے بارے میں پڑھاتے ہوئے ہماری کلاس کی ایک لڑکی کو کھڑا کر کے پوچھنے لگے کہ MAIZE (یعنی مکئی) کو اردو میں کیا کہتے ہیں اس نے کہا کہ مکئی۔۔۔ کہنے لگے نہیں۔۔۔ وہ بچاری ''بھٹا'' کہتے شرما رہی تھی اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک اس نے بھٹا نہ کہا۔ بہت خوش ہوئے اور بار بار کہا ''یہ کہو نا کہ بھٹا'' اور اس سے اتنی دفعہ اونچی آواز میں ''بھٹا'' کہلوایا کہ وہ شرم سے رونہار ہوگئی۔

ان کے اسسٹنٹ پروفیسر ''خان صاحب'' تھے جو اس قدر شریف اور کمزور شخصیت کے مالک تھے کہ جب وہ آتے تو لڑکے ان کے پورے گھنٹے میں شور مچاتے رہتے یا شرارتیں کرتے رہتے۔ وہ بس خاموشی سے ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدن کی مثال بنے کھڑے رہتے۔ پھر ہم میں سے کوئی لڑکا ان پر ترس کھا کر کھڑا ہو کر لڑکوں سے کہتا کہ بھئی اب بہت ہوگئی اب خان صاحب کو کچھ پڑھانے دو۔ تب لڑکے خاموش ہوتے۔

مگر اس مضمون سے میری یہ یاد وابستہ ہے کہ سال شروع ہوتے ہی یہ مضمون نہ صرف میری مکمل گرفت میں آگیا تھا بلکہ مجھے اس سے عشق ہوگیا تھا (مجھے قارئین یہ لکھنے کی اجازت دیدیں کہ چونکہ یہی مضمون ڈاکٹری کے خاص الخاص مضمون ''میڈیسن'' کی بنیاد ہے اس لئے مستقبل میں میں نے اپنے اسی مضمون کی مضبوط بنیاد کی وجہ سے میڈیسن اور اپنے کیریر میں نمایاں کامیابیاں حاصل کیں) اس کے انتہائی پیچیدہ چیپٹرز میری سمجھ میں اس طرح آتے تھے اور میری یادداشت میں ایسے پیوستہ ہو جاتے تھے جیسے میں اسی کے لئے پیدا ہوا ہوں۔ اسی وجہ سے میں زیدی صاحب کا پسندیدہ طالب علم بن گیا۔ اس کے علاوہ لڑکے اب بھی چٹرجی پڑھتے تھے مگر میں نے انگلینڈ کے کالجوں کی مروجہ کتاب ''سمسن رائٹ'' پڑھنی شروع کر دی تھی۔ اس کے علاوہ میں نے یہ گر بھی سیکھ لیا تھا کہ وہ کن کن خاص الفاظ پر زور دیتے ہیں اور موقعہ کی مناسبت سے میں وہ الفاظ دہرادیا کرتا تھا۔

ایک واقعہ جو مجھے میرے ایک ہم جماعت نے یاد دلایا وہ اس لئے تحریر کر رہا ہوں کہ پیرانہ سالی کے اس عہد میں جب بہت سی صلاحیتیں زوال پذیر ہیں ایسی یادیں تقویت دیتی ہیں ورنہ اس سے کوئی خودستائی مقصود نہیں۔

فزیالوجی میں NEUROLOGICAL TRACTS بڑے اہم اور خاصے پیچیدہ چیپٹرز ہیں۔ خان صاحب یہ پڑھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ ایک ہفتے پہلے بھی یہ پڑھا چکے تھے مگر لڑکے ان کو سمجھ نہیں پائے تھے۔ اس دفعہ بھی انہوں نے بڑی کوشش کی مگر وہ جو کچھ بھی سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے اس کا نہ کوئی سر تھا نہ پیر۔ میں نے دو ہی دن پہلے انہیں پڑھ کر مکمل طور پر سمجھ لیا

تھا۔ جب خان صاحب اور لڑکے دونوں ہی بہت الجھ گئے تو میں نے خان صاحب سے کہا کہ اگر اجازت دیں تو میں بورڈ پر آ کر انہیں بیان کروں۔ میرا دوست مجھے بتاتا ہے کہ تم نے اگلے بیس منٹ میں ان کو اس طرح بیان کیا اور بورڈ پر ایسی تصویر بنائی کہ لڑکوں کی تالیوں سے ہال گونج گیا اور ''فیروز میں آج تک انہیں نہیں بھولا ہوں'' سال کے اختتام پر فزیالوجی میں میری یونیورسٹی میں پو زیشن آئی اور سال اوّل میں اناٹومی میں جو داغ میرے دامن پر تھا وہ بڑی حد تک مٹ گیا۔

مینڈکوں پر ظلم

فزیالوجی میں یوں تو کئی قسم کے پریکٹکل تھے مگر ایک ایسا پریکٹکل تھا جسے کرتے ہوئے ہمارا یا کم از کم میرا دل بہت دکھتا تھا اور بہت سی لڑکیوں کے لئے یہ کرنا مشکل ہوتا تھا۔ اس میں مینڈک کے جسم کے مختلف حصوں پر بجلی کے کرنٹ کے جھٹکے لگا کر کئی اقسام کے گراف بنانے ہوتے تھے۔ مگر اس سے پہلے مینڈک کو ''PITH'' کرنا ہوتا ہے۔ پتھ کا لفظی مطلب ایک قسم کا سپنج ہوتا ہے یا کوئی بہت ہی جیلی یا لجلجی جیسی چیز۔ اس کے لئے زندہ مینڈک کو بائیں ہاتھ میں پکڑ کر اس کی گردن کو اس طرح مڑوڑتے ہیں کہ اس کا سر بالکل نیچے ہو جائے۔ پھر ایک لمبا اور موٹا سُوا سر اور گردن کے جوڑ کے عین اوپر سے اس طرح گھسیڑتے ہیں کہ وہ ریڑھ کی ہڈی میں ہوتا ہوا نیچے تک چلا جائے۔ ایسا لگتا ہے جیسے زندہ مینڈک کو سیخ پر چڑھا دیا گیا ہے۔ اگر ایک ہی کوشش میں یہ عمل کامیابی سے مکمل ہو جائے تو ایک ''ٹھسس'' سی آواز آتی ہے جیسے ٹائر میں سے ہوا نکل گئی اور مینڈک زندہ تو رہتا ہے مگر بلکل لجلجا ہو جاتا ہے اور اسکا جسم اس قدر ڈھیلا پڑ جاتا ہے جیسے وہ جیلی کا بنا ہوا ہو اور وہ مکمل طور پر مفلوج ہو جاتا ہے۔ اب اس پر مختلف تجربات کئے جاتے ہیں۔ اگر ایک ہی کوشش میں یہ عمل نہ ہو سکے تو ادھر مینڈک اور دوسری جانب کرنے والے لڑکے کا برا حال ہو جاتا ہے۔ اب تک آپ جان ہی چکے ہونگے کہ میں ایک نہایت حساس، نازک مزاج، جمال پرست اور نرم دل انسان ہوں۔ میں اس پریکٹکل سے بہت پریشان ہوا۔ مشکل یہ تھی کہ یہ پریکٹکل تقریباً ہر ہفتے ہوتا تھا۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح اس ذمہ داری سے عہدہ برا ہوا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی لکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ کچھ لڑکیوں کے لئے بھی یہ کام مشکل تھا۔ میرا ایک ہم جماعت اور دوست ظفر اقبال بھی ایک عجب کریکٹر تھا۔ اسے لڑکیوں کو متاثر کرنے کا بڑا شوق تھا اور ان کی توجہ کے لئے عجیب مزاحکہ خیز حرکتیں کرتا رہتا تھا۔ اس نے یہ ذمہ داری سنبھال لی کہ وہ ڈیمانسٹریٹر سے نظریں بچا کر کئی لڑکیوں کے مینڈک PITH کر دیا کرتا تھا۔ اسکے بعد تو یہ معمول ہو گیا کہ تقریباً پورے سال اس نے لڑکیوں کی یہ خدمت انجام دی۔

فارماکولوجی

فارماکولوجی ادویات کا مضمون ہے۔ اس کے پروفیسر اور صدر شعبہ بھی ''زیدی'' تھے ان کا پورا نام تو سید مرتضی علی تھا مگر یہ چھوٹے زیدی کہلاتے تھا۔ نہایت خوبصورت، بے حد خوش لباس اور قیامت کے اصول پسند تھے۔ وہ کبھی انگلینڈ میں برسٹل یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر رہے تھے اس لئے تمام کالج ان سے زبردست مرعوب تھا۔ ہمیشہ سوٹ میں ہوتے تھے اور کبھی کبھی فیلٹ ہیٹ بھی پہنتے تھے۔ ان کی یہ بات لیاقت میڈیکل کالج سے فارغ التحصیل ہر لڑکے کو یاد ہوگی کہ ان کی کلاس میں ''ٹائی'' لگانا ضروری تھا اوّل تو کسی کو اتنی جرأت ہی نہیں تھی کہ وہ بغیر ٹائی لگائے ان کی کلاس میں آ جائے اور آ گیا تو وہ اسے نکال دیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ وقت کے اس قدر پابند تھے کہ وہ ریڈیو پاکستان کی گھڑیاں دیکھ کر کلاس شروع ہونے کے پانچ منٹ بعد داخل ہوتے تھے اور پھر آڈیٹوریم کے دروازے مقفل ہو جاتے تھے۔ بہت اچھے استاد تھے اور دراصل RECEPTORS کا موضوع جو فزیالوجی میں بھی شامل تھا انہوں نے بڑے زیدی صاحب سے کہیں اچھا پڑھایا۔ یوں تو لڑکے ان سے بڑے خوفزدہ تھے مگر اسی کے ساتھ وہ تمام طلبہ کے محبوب بھی تھے۔

مگر ان کے نائب، اسسٹنٹ پروفیسر اخلاق النبی صاحب تو ان پر بھی بازی لے گئے تھے۔ اخلاق صاحب قیامت کے ہینڈسم انسان تھے۔ تقریباً چھ فٹ دو انچ کا قد، جسم جیسے تراشہ ہوا یونانی مجسمہ، دلفریب مسکراہٹ، سگریٹ پینے کا قتل کرنے والا انداز اور پھر بے حد متاثر کرنے والا انگریزی کا امریکی لہجہ۔ اس پر غضب یہ کہ وہ غیر شادی شدہ تھے۔ وہ کچھ ہی سال پہلے امریکا کی انڈیانا یونیورسٹی سے فارماکولوجی میں پی ایچ ڈی کر کے آئے تھے۔ ہم تمام لڑکے جہاں ان کے انداز سے متاثر تھے وہیں ان سے بے حد حسد کرتے تھے اور ہاسٹل میں شام کی گپوں میں یہ ضرور کہتے تھے کہ اب تو ہماری کلاس کی لڑکیاں ہماری طرف دیکھتی بھی نہیں کیونکہ سب ہی اخلاق صاحب کو نظروں ہی نظروں میں کھائے جاتی ہیں۔ ہماری کلاس کے تمام طلبہ کو یہ ضرور یاد ہوگا کہ جس دن اخلاق صاحب نے ہمیں مختلف شرابوں کی کیمسٹری اور اس کے اثرات پر لیکچر دیا تو ایسا لگتا تھا کہ وہ ان شرابوں کی خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے خود بھی لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ اس کا چرچہ کئی دن لڑکوں کے درمیان رہا۔

پریکٹکل

فارماکولوجی کے پریکٹکل بھی دلچسپ تھے۔ ایک دن ہمیں ایک ایسا انجکشن لگا دیا گیا کہ ہمارے منہ سے اس قدر رال (تھوک) بہی کہ ہم منہ پونچھ پونچھ کر تنگ آ گئے۔ ایک دفعہ ایک کتے کو بیہوش کر کے اور اس کا سینہ چیر کر اسکے دل پر کئی قسم کے مانیٹر لگا کر مختلف دواؤں کے انجکشن لگائے گئے جس سے دل کی حرکت، اس کی پمپ کرنے کی قوت اور دوسرے پریشرز پر چند سیکنڈس میں اثر انداز ہوا جا سکتا تھا۔ ایک پریکٹکل میں تمام طلبہ کا وزن کیا جانا تھا۔ یہ مجھے ہمیشہ یاد رہیگا کیونکہ میں اپنی تمام کلاس میں سب سے کم وزن کے طلبہ میں دوسرے نمبر پر تھا۔ سب سے کم وزن ایک لڑکی غزالہ اسلام نعمانی کا تھا اور اس

سے ذرا سا زیادہ میرا تھا۔یعنی باقی تیرہ لڑکیوں کا بھی وزن مجھ سے زیادہ تھا۔

سال کی آخری پارٹی

حسب روایت سال کے آخر میں ایک شاندار پارٹی ہوئی۔ میں نے اس کی کمپئرنگ کی اور تمام اساتذہ کے لئے پہلے چند مزاحیہ جملے کہے اور اس کے بعد ان کو خراج تحسین پیش کیا۔اس کے بعد موسیقی کا رنگارنگ پروگرام تھا۔ تمام لوگ شاندار لباس میں تھے۔ایک عجب خوابناک ماحول تھا۔یہ فارما کولوجی کے آڈیٹوریم میں ہوئی۔اس پارٹی میں میرے ایک ہم جماعت اور قریبی دوست شبیر احمد نے کئی گانے گا کر ہمیں بڑا حیران کیا اس لئے کہ اس سے پہلے ہم نے اسے گاتے ہوئے نہیں سنا تھا۔اس کے ایک پوربی لوک گیت

''سن لو چھوٹی سی عمر جو اہمار بہوا''

گا کر محفل لوٹ لی خاص طور سے چھوٹے زیدی صاحب کو وہ گیت بہت ہی پسند آیا اور انہوں نے شبیر کی بڑی تعریف کی۔شبیر ویسے بھی فارما کولوجی میں بہت تیز تھا اور اس نے اس مضمون میں پوزیشن بھی لی تھی۔میں نے نہ جانے کیوں ایک غمزدہ گیت

بھولی ہوئی یادو مجھے اتنا نہ ستاؤ

اب چین سے رہنے دو مرے پاس نہ آؤ

سنایا تھا۔داؤد نے کچھ لطیفے سنائے اور ظفر نے کچھ شاعری کے اقتباسات۔

مجھے بار بار دکھ سے یہ خیال آتا ہے کہ وہ کیا دور تھا۔کیا اب بھی پاکستان کے تعلیمی اداروں میں اس قدر اچھا ماحول ہے۔میں تو صرف کلاشنکوف کلچر اور نقابوں یا حجابوں ہی کا تذکرہ سنتا ہوں بہر حال اس طرح یہ سال بھی اختتام کو پہنچا اور چھٹیاں ہوئیں۔ہم لوگ اس دفعہ خوشی خوشی گھروں کو روانہ ہوئے کہ اس دفعہ ''دماغ کے ڈسکشن'' کا ہوّا ہمارے سروں پر سوار نہیں تھا۔

☆

پسِ پردہ کا ایک صفحۂ رنگیں

خورشید زمانی منہ ہاتھ دھو کے بیٹھی سر گندھوا رہی تھی۔بالوں کے سرے سلجھا چکی تھی اور کنگھی میں سے بال نکال ان کی گچھی بنا گیسودانی میں رکھ کنگھی کو شانہ پیچ میں رکھ رہی تھی۔شرف النساء چوٹی میں چار پانچ پیچ دے چکی تھی کہ اتنے میں بی خانم برقع کے سموسہ کو الٹے گھیر کو سمیٹ اور پیچھے سے لے جا بائیں ہاتھ پر تہہ پوشی کے پائینچے کی طرح ڈالے کھسر کھسر کرتی آئیں۔آداب کر کے بیٹھ گئیں۔خورشید زمانی بیگم نے کہا۔ شرفن تو کچھ کل کی چوٹی گوندھتی تھیں۔آدمی سے زیادہ گوندھ چکی ہے۔میری جان بے چین ہوئی جاتی ہے۔خانم سے کہنے لگیں۔بی تم میری چوٹی گوندھ دو اور شرف النساء سے کہا کہ جا کے مغلانی جی سے کوئی ٹھپّے کا ٹکڑا لے آ ؤ۔خانم بولیں بیگم اب تو تیل گیری بھی چیکٹ ہو گئی کل سے اس کو بھی جم ڈالنا خورشید زمانی نے کہا کہ بی سر گندھواتے وقت اس سے کام پڑتا ہے۔میں روز کہتی ہوں لیکن کچھ عجیب ہیں کہ ذرا ان کو خیال نہیں ایک اتنا سا سر گوندھنے اور منہ دھلانے کا کام اُن کے ذمہ ہے۔آب چین (تولیا) میں کھوں دبدے جائیں۔زانو پوش میں بتلاؤں تو اٹھائیں۔بنی پاک اور پاپاک میں میلے بتاؤں تو انہیں نظر آئیں لیکن یہ چاہو کہ انہیں خود کو سمجھائی دے یہ ناممکن۔آپ چین کل ہی بدلوایا ہے نگوڑا برتنوں کا صافی معلوم ہوتا ہے اور ایسی بُری بو ہو گئی تھی جانے چھچھوندر پھر گئی کہ میں نے جو منہ ہاتھ پونچھے تو سڑ گئی۔بُرا بھلا کہتی گئی۔اور دوبارہ منہ دھویا۔ان سے پوچھو سارے دن تم کیا کرتی ہو۔اب ذرا سے ٹھپّے کے ٹکڑے کو بھیجا جا کے مر گئیں۔خدا جانے ان نوکروں نے تو میری عادت کا ناس کر دیا نگوڑے جتنے زیادہ رکھتی ہوں اتنے ہی اورا چھوتی کا ٹکا ہوئے جاتے ہیں، نامراد کہیں کے۔۔۔اچھی شرفن آخر تم کو اور مغلانی جی کو کس نے توشہ خانہ میں پکڑ لیا کہ نگوڑا اتنا سا ٹکڑا اب تک نہیں لایا جاتا۔میری تو بیٹھے بیٹھے گردن دکھ گئی۔خورشید زمانی کی ساس نے کہا۔دلہن! آتی ہے نگوڑی تم تو ایک بولی میں تین کام چاہتی ہو۔آخر یہ بھی تو اللہ ہی کے بندے ہیں۔فرق یہی ہے نا کہ اللہ رکھو تم امیر ہو اور یہ غریب تو اس لئے تھوڑی کہ دَل دَل مارو۔ان کی جان کو جان نہ سمجھو۔۔۔

○

''فضائے ہفت گردوں''

پروین شیر (کینیڈا)

جھیل پر تیرتے گھروندے

کہنہ وقت کے ساگر کے چوڑے سینے پر
اس دھرتی کا گول جزیرہ
جانے کب سے استادہ ہے
دھرتی کی باہوں میں سمٹا
ٹی ٹی کا کا بھی جیسے اک
ننھا منا سیارہ ہے!
اب بھی پچھلی صدیوں کی ڈوری تھامے وہ
زماں کی ہر پل بدلی صورت
دور سے بیٹھا دیکھ رہا ہے
لہروں کی آغوش میں سمٹی
چھوٹی چھوٹی نرسل کی پارینہ دنیا
وہی قدیمی رنگوں کی چادر اوڑھے اب بھی قائم ہے!
فطرت کے رنگیں ریشم کی ڈور سے اس کی
سانسیں پیہم بندھی ہوئی ہیں
ہر دھڑکن قدرت کے دل سے جڑی ہوئی ہے
بادل، بارش، دھنک کے جوہر
سورج کا سونا، پھولوں کے رنگ برنگے گوہر
چاند کی رخشاں چاندی
اس کے باشندوں کے یہ سرمائے
اب بھی ان کی مٹھی میں ہیں !
اس طوفانی رنگ بدلتی دھرتی پر بھی
یہ کتنے محفوظ ہیں اب تک
اپنی پارینہ دنیا میں کتنے آسودہ خاطر ہیں !!

(جھیل ٹی ٹی کا کا ساؤتھ امریکہ، پیرو میں دنیا کی سب سے بڑی وہ جھیل ہے جو سمندری سطح سے ۳ہزار ۸۰۰ میٹر کی اونچائی پر ہے۔ انسانی ہاتھوں سے بنائے گئے نرسل کے چھوٹے چھوٹے جزیروں پر ۱۱ ویں صدی سے قبل کی تہذیب آج بھی زندہ ہے۔ یہ نظم وہیں وجود میں آئی)

Mercy Killing

یہ دل کی دھڑکنیں، سانسوں کی پیہم آمد وشد
ان رگوں میں دوڑتا یہ خون
اور ساکت بدن کی یہ حرارت بھی
کہاں اب اس کے اپنے ہیں
یہ سب آلات مصنوعی کی بخشش ہے!
کہ اب خستہ بدن کے اس مکاں کے در دریچے پر
لٹکتی سرخ پیلی نلکیاں سب اس کے زنداں کی سلاخیں ہیں
اب اس کے دل کی ہر دھڑکن
فقط جھنکار زنجیروں کی ہے
جن سے وہ جکڑا ہے
بڑی مدت سے ان خاموشیوں کی سسکیاں سن کر
کسی نے رحم کھا کر توڑ دی ہیں
سب سلاخیں ایک ہی پل میں
رہائی مل گئی، زنداں سے آخر
گم ہوا وہ اب فضائے ہفت گردوں میں!!

اک آزاد روح کو خراج تحسین

حسن منظر
(کراچی)

گرتی پڑتی
پیروں میں لوہے کی زنجیر کی چھاگل پہنے
کلائیوں میں ہتھکڑی کے کنگن
اُدھنے بالوں میں دھول کی افشاں سنبھالے
ہونٹوں پہ پپڑیوں کی مٹیالی لپ اسٹک جمائے
گدلی بے دھلی آنکھوں میں
مُردنی کا کحل سجائے،
میلا، چیتھڑے لباس اس کا
دیدنی ہے اور اس میں سے
جھانکتے ہوئے جسم کی بدھیاں اور کھرنڈ
چہرے کی ہم نوائی میں
زنداں میں گزارے ہوئے دنوں کی
کہانی سنا رہے ہیں۔
کھینچتے، گھسیٹتے
اُسے لے کر آئے ہیں اس چوک میں
جو موت کا لنگر خانہ ہے
بے نواؤں کے لیے
ملکوں ملکوں جمہوریت
بانٹتے پھرنے والوں کا صدقۂ جاریہ
وہاں بیچوں بیچ کھڑا ہوا ستونِ دار
خود سے بیزار
کب سے اس کی باٹ تک رہا تھا
کہ آئے اور مجھ سے ٹیک لگا کر
کھڑی ہو۔

اب سجادی ہیں انھوں نے
اس کے چاروں طرف سوکھی
جلنے کو بے قرار لکڑیاں
اور ستون سے اُسے جکڑنے کو
تڑپ رہی ہیں کنواری
سفید رسیاں
سب کو دھڑکا ہے کہیں یہ
نیم مردہ جسم جو ہزار جُل سے
اس بار تو قابو میں آ گیا
کہیں ذرا غفلت ہو اور بس میں نہ رہے
نکل بھاگے
اور ایک بار پھر اپنے ساتھیوں میں
جا ملے، ہماری پہنچ سے باہر
بڑا کام اس کے ضمیر کو بے دم کرنا ہے
ایندھن کو لوکا لگا کر۔
ضمیر جل گیا تو امید ہے
اس سے پیوستہ روح بھی
بھسم ہو جائے گی، ورنہ
بڑا دھڑکا ہے کہیں وہ دوسرے
اس جیسے سر پھروں کے سینے میں
نہ گھر کر لے۔

لو چتا جل اٹھی
لکڑیاں اور انہیں نہ چھوڑنے والے
سوکھے پتے
چرچرا رہے ہیں۔
ان کا ساتھ دے رہا ہے اس کا
خوف آلودہ پیرہن۔

ان جلتی لکڑیوں کے حصار میں
جسم بھی کب تک
اس آزاد روح کا ساتھ دے گا
دھواں اس گدلی آنکھوں کو
چاٹ رہا ہے لیکن
وہ بند نہیں ہیں: بجھتے بجھتے
کچھ ڈھونڈ رہی ہیں۔
اپنے بچوں کو؟
وہ یہاں کہاں، کئی سمندر پار ہیں،
تو پھر پڑھنا چاہتی ہیں
تماش بینوں کے چہروں کو
کون کون ان میں سے کس قاتل کا ہے
اور اُن کے مددگاروں کا
جنہوں نے نہیں پکڑے تھے
قاتلوں کے ہاتھ، نہ ہی
ظلم ہوئے دیکھ کر، بغیر ایک لمحہ ضائع کیے
اٹھ کھڑے ہوئے تھے
نہ اپنی آرام گاہوں، دفتروں، کارخانوں
عبادت گاہوں سے سڑکوں پر
نکل آئے تھے پوچھنے کو کہ
'کون ہے وہ جسے تم
آج جلانے لے چلے ہو؟'
''جون، جون (Joan) کو
سُنا نہیں، جون کو۔ وہ بدعتی دیہاتی لڑکی
سینٹ جون اُوف آرک''
اچھا! جسے مٹانے کی ناکام کوشش کو
کچھ کم چھے سو سال ہوئے
اور یہ جون؟
وہ ہے جس کی عافیت اس

ہزار یونیورسٹیوں، لاکھ کولجوں،
گرجوں، معبدوں، کنشتوں کے
ملک میں
کسی کو مطلوب نہیں
اس کرایے کے وکیل تک کو بھی نہیں
جسے مقدمے کے دوران
اس لڑکی کی آزادی سے زیادہ
ہمیشہ ایک ٹن ٹھنڈی بیئر
کی طلب رہی۔
اس کی عافیت تو
اس ملک کے کرتا دھرتاؤں کو بھی
مطلوب نہیں
جہاں اس نے
احتجاج کی پہلی آواز
دنیا میں وارد ہو کر
دائی کے پیٹھ پر تھپکنے سے
نکالی تھی۔

اتنے لمحوں میں جو ہم نے
باتوں میں گنوائے
آگ اس کے کپڑوں کو چٹ کر چکی ہے
اور اس بھوکی آگ کو
رسد مل گئی ہے
اس بچی کچھی چربی کی جو
کھال کے اندر پگھل کر
ایندھن کا ساتھ دے رہی ہے۔
یہ کیسی پہیلی ہے
ایک بار آگ میں پھونکی ہوئی روح کو
(چاہے وہ جون اُوف آرک ہی کی ہو)

دوبارہ جلایا جاسکتا ہے!
روح کونہیں، جس جسم میں
وہ بستی تھی، تب اُسے
جلایا گیا تھا۔ اُس روپ کو
آج پھر ایک روپ کو جلائیں گے۔
اور روح ایک بار پھر
اس دنیا کا پھیرا مارنے آئی ہے
جہاں اپنے، پرائیوں سے مل کر
آج اُسے جلانے کا جتن کر بیٹھے ہیں

جل جائے پر کیا وہ
اُن آوازوں کی ہستی سے
انکار کر دے گا
جو کہتی رہی ہیں
''اٹھ جون، بہت سو لی
تب میں، اب میں صدیاں بیتیں
بہت کام پڑا ہے اور وقت تھوڑا ہے
بے بس چھوٹے ملکوں کو
آزاد کرا اس مہیب پرندے
کے پنجوں سے
جو موت نقد بھی بیچتا ہے،
قسطوں پر بھی،
اور جو خریدنے والے کے لیے وہ بھی ممکن نہ ہو
بلا قیمت۔
جو خالق ہے کلسٹر بموں کا
بدلتے ہوئے روز کے جدید ترین
ایٹمی اسلحہ کا
ڈرونز[1] کا
سبزے کو نابود کرنے والی
کیمیا کا۔
جس کے سائنسدان دنیا بھر میں
نمبر ایک ہیں
جو اپنے دماغوں کو اس
مہیب طاقت کے ہاتھوں گروی رکھ چکے ہیں
سفید فاسفورس اور
مہلک جراثیموں کے شیل
ان دماغوں کی Patented
اختراع ہیں اور وہی ہر دم
ہر ''آورڈر'' پر اس ذخیرے میں
اضافہ کرنے کو حاضر ہیں'
نہیں پیاری لڑکی کی روح
جسے شعلوں کی زبانیں بڑھ بڑھ کر
چاٹ رہی ہیں
تو Rouen[2] میں
جل کر بھسم نہیں ہوئی تھی
جو بھسم ہوا تھا وہ تو
تیرا جسم تھا۔ اور تو خود
اس ظالم اور مظلوموں کی
ناہموار دنیا میں بار بار
پیدا ہوئی، جلائی گئی
بار بار پیدا ہوگی
یہ تیرا آواگون اس ملک کا
نروان ہے جس نے تجھے جنم دیا
تیرے ساتھ کتنے ہی
ملکوں کی مکتی بندھی ہے
ڈیئر سینٹ جون عافیہ

۱ Drones
۲ شمالی فرانس کا شہر

احساسِ شکستگی

(آئینے میں جُھریوں زدہ چہرہ دیکھ کر)

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ

(امریکہ)

تشنہ! دھر سرا ہے مایا جال
تیرا ہی ہے پروردۂ خیال
دیکھو جسم کی گرتی دیواریں
کیوں ہوئے ہو اس قدر بے حال
جسم نہیں ہے تُو، خود کو پہچان
خاک کی خاطر ہے رنج و ملال!
روپ بدل بدل کے ہے تُو آیا
یہ ازل و ابد ہے خام خیال
تجھ سے باہر نہیں کچھ بھی اے ہمدم!
ترے میں رنج و خوشی، ہجر و وصال
گمراہی! کب تھا سے جب تُو نہ تھا؟
وہم و گماں ہیں، یہ نام و اشکال
طلسمِ حُورانِ بہشت سے نکل
آتشِ دوزخ بھی دین کی ڈھال
تُو ہے قائم، دائم، اوّل، آخر تُو
تیرا ساگر میں موجوں سا ہے حال
بعید از عقل و خرد سے ہے تشنہ
فنا فی اللہ ہونا ہے کمال

○

کم نصیبی

حسن عسکری کاظمی

(لاہور)

بظاہر ہر قدم آگے بڑھا یا رہبروں نے
مگر ایسا لگا ہے
کہ وہ الٹے قدم پیچھے چلے ہیں
جہالت کے کنوئیں میں گر نہ جائیں
سنبھلنے کی انہیں عادت نہیں ہے
کتابِ زندگی ہم نے
غلاف شیشہ ٔ حرفِ تصور میں سجائی ہے
ہمیں پڑھنے کی فرصت بھی نہیں ہے
ہماری نسلِ نو بیٹھی ہے
کمپیوٹر پہ چیٹنگ کر رہی ہے
معیشت کے مسائل حل نہ ہوں گے
مگر وحشت بڑھے گی
خون تو ہوگا
ہمیں عہد گزشتہ کی وہی تاریخ از بر ہے
کہ میزانِ مروّت غیر کے ہاتھوں میں دے کر بھی
ہماری کم نصیبی کا وہی ایک زائچہ نکلا
ہماری سرحدوں پر ہم سے بن پوچھے
فضاؤں سے زمیں پر یک بیک حملے ہوئے لیکن
کوئی بھی سرحد ادارکِ غیرت پر نہیں آیا
فقط گفتار کے غازی درون سرزمین پاک ہی دیکھے
بظاہر ہر قدم آگے بڑھا یا رہبروں نے
مگر ایسا لگا ہے
کہ وہ الٹے قدم پیچھے چلے ہیں

○

’’فروزاں ہوتی کہکشاں‘‘

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

(بہار، بھارت)

بار بار لہولہان کرتی ہیں یادیں
ڈوبتے سورج کے لال سپنوں میں ابھرتی ہیں
کچھ مٹتی ہیں
دھیرے دھیرے رنگوں کو
خستہ سامانی کو
خال وخد کے قوسوں کو
فروزاں ہوتی کہکشاں کو
خاک ہوتی کچی باس کو
پلکوں میں رہ جانے والے فسوں کو
بدل دیتی ہیں یادیں
دنیا جہاں کی خوشیاں!
کوئی پاروتی، کوئی رادھا
اب یادوں میں نہیں!
پھر بھی رنج وغم ہے
اشانت من ہے!
اور بانجھ آئینہ ہے ذہن کا!
جیون درشن کو
سمجھنے سے قاصر ہے
آسمان جیسی پگڈنڈی
قبرستان تک جاتی ہے
نیلی یادیں۔۔۔گواہ ہیں
ہاتھوں میں پیراہن تھامے
طلب کی خواہش
پیچھے ڈھکیلتی ہیں!!

○

’’تخلیقی لمحہ کا امکان‘‘

عارف شفیق

(کراچی)

مجھے اپنا ساتھ گراں گذرتا ہے
میں خود سے بچھڑنے کے دکھ سے
آشنا ہونا چاہتا ہوں
خود کو میں کئی بار
گھنے جنگلوں میں چھوڑ کر آیا
کئی بار خود کو دھوکے سے سمندر میں پھینکا
دنیا کے میلے میں چھوڑا
لیکن ہر بار جب گھر لوٹا
تو خود کو اپنے سامنے مسکراتے ہوئے پایا
میں خود سے بیزار ہو گیا ہوں
میں تنہا ہونا چاہتا ہوں
اپنے خدا کی طرح
وہ تنہائی مجھے کب میسر ہوگی
جس میں سچا شعر لکھا جاتا ہے
غیر فانی تصویریں جنم لیتی ہیں
نئے فلسفے وجود میں آتے ہیں
تخلیقی وجود نمو پاتا ہے
میں نے سوچا ہے کہ میں
اب خود کو قتل کر دوں
لیکن میں نے تو پیدا ہوتے ہی
اپنا پورا وجود
زندگی کے ہاتھ میں
گروی رکھ دیا تھا

○

منچھر جھیل کے کنارے

نورین طلعت عروبہ
(راولپنڈی)

شاخِ گُل آ کے اس کے
حسیں پانیوں پر جُھکی
اور کہنے لگی
آئینے کی طرح
دل نشیں، دلربا
جھیل کا حسن ہے
یا چمکتے ہوئے موتیوں کا خزانہ
یہاں ڈھیر ہے
ایسے موتی جو تاروں کے جیسے ہیں
من موہنے
جھلملاتے ہوئے
اک طلسمی خموشی کی صورت
فقط اک اشارے سے
اپنی طرف کو بُلاتے ہوئے
دیکھنے والی ہر آنکھ حیران ہے
جھیل منچھر ہے
یا
خالقِ دو جہاں نے
فلک کو اُٹھا کر یہاں رکھ دیا
نیلگوں خواب پر
سطحِ آب پر

آؤ! سکھر تمھیں گھماتے ہیں

ڈاکٹر انیس الرحمٰن
(سکھر)

ہم جنھیں چارہ گر بناتے ہیں
زخم وہ روز ہی لگاتے ہیں
توڑ دیتے ہیں سارے خوابوں کو
اپنے وعدوں کو بھول جاتے ہیں
خوب لوٹے گئے ہیں منصوبے
محرمِ راز یہ بتاتے ہیں
حل طلب ہیں یہاں جو برسوں سے
اُن مسائل سے جاں چھڑاتے ہیں
روز ملتا نہیں ہے پانی بھی
روز یہ بات سب بتاتے ہیں
گیس کا مسئلہ پرانا ہے
اِس لیے لکڑیاں جلاتے ہیں
راہیں تاریک ہیں تو کیا کیجیے
کچھ علاقے تو جگمگاتے ہیں
جا بہ جا ڈھیر ہیں غلاظت کے
کتّے سڑکوں پہ دندناتے ہیں
کیا ضرورت موئن جو داڑو کی!
آؤ ! سکھر تمھیں گھماتے ہیں

ڈرامہ

بغل بچے

گلزار جاوید

(راولپنڈی)

سین نمبر 1

مقام: عقیل کے گھر کا ڈرائنگ روم‘ پرانا فرنیچر‘ بوسیدہ پردے‘ سیل زدہ دیواریں اور سینٹر ٹیبل پر چائے کے ہمراہ بسکٹ‘ کیک‘ پیسٹری اور شامی کباب۔

کردار: عقیل اور عقیل کے چند مفت خورے دوست
اور ایک پھٹیچر شاعر

شاعر: (شامی کباب منہ میں رکھتے ہوئے) بھئی واہ واہ‘ سبحان اللہ‘ کیا کہنے.... عقیل میاں! ہمارے دوستوں‘ عزیزوں‘ شاگردوں اور نیاز مندوں کی تعداد سے آپ بخوبی واقف ہیں۔

عقیل: (ناگواری سے) جی‘ جی....!

شاعر: خدا جھوٹ نہ بلوائے ایک سے ایک بڑھ کر صاحب حیثیت اور بلند مرتبے کے حامل ہیں.... مگر.... تواضع اور خاطر داری کا جو اعلیٰ ذوق قدرت نے آپ کو ودیعت کیا ہے (پیسٹری کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے) اُس کی مثال کہیں نہیں ملتی.... کیوں میاں کیا نام ہے آپ کا....؟ مبارک حسین.....

مبارک حسین: (تیزی سے شامی کباب کی پلیٹ اپنی جانب سرکاتے ہوئے) واللہ آپ تو شاعری فرما رہے ہیں.... یہ بھی کوئی راز کی بات ہے! جس طرح دوستوں کو عقیل میاں عزت بخشا کرتے ہیں کبھی کسی نے بخشی ہے....؟

شاعر: آہاہا.... واہ‘ واہ.... کیا برمحل جملہ ہوا ہے....

کئی دوست ہم آواز: ارشاد.... ارشاد.... ارشاد....!

شاعر: عقیل میاں! توجہ فرمایئے....!

عقیل: (بے زاری سے) ارشاد....!

شاعر: حضرات....! توجہ چاہوں گا....!

کئی آوازیں: جی.... جی.... ارشاد....!

شاعر: عرض کیا ہے....! کباب کھالے اور پی لے چائے

کئی آوازیں ایک ساتھ: آہاہا.... سبحان اللہ.... کیا کہنے.... کیا مصرعہ باندھا ہے....!

شاعر: کباب کھالے اور پی لے چائے + ہائے.... ہائے.... ہائے

سارے دوست ہم آواز: کیا کہنے.... سبحان اللہ.... پھر پڑھیئے....

شاعر: عرض کیا ہے....! کباب کھالے اور پی لے چائے + ہائے.... ہائے.... ہائے

دلبر خان: اُستاد! مصرعہ کیا ہے.... محبوب کی چٹکی ہے چٹکی (سالم پیسٹری منہ میں رکھتے ہوئے) سارے بدن میں گدگدی ہونے لگی ہے....

شاعر: لاحول ولا قوۃ.... میاں....! داد‘ دے رہے ہو یا گھاس کاٹ رہے ہو....! عقیل میاں ملاحظہ فرمایئے....! کبا....

عقیل: (درمیان سے شاعر کا جملہ کاٹتے ہوئے) واہ‘ واہ سبحان اللہ‘ اس طرح کا مصرعہ آپ ہی کہہ سکتے ہیں (چہرے پر ناگواری اور طنز نمایاں ہے)

شاعر: اہلِ ذوق.... داد.... اس طرح دیا کرتے ہیں.... (روئے سخن دلبر خان کی طرف کرتے ہوئے شاعر نے عقیل کو مخاطب کیا) عقیل میاں....! ایک تازہ شعر آپ کی نذر ہے.... ابھی‘ ابھی ہوا ہے....!

کال بیل کی آواز پر عقیل میاں معذرت کر کے باہر جانے لگتے ہیں۔

سین نمبر 2

مقام: گھر کے باہر گلی کا منظر

کردار: عقیل‘ ڈاکیہ‘ پڑوسی اور مولوی صاحب

ڈاکیہ: لیجئے عقیل صاحب....! منہ میٹھا کرایئے.... خدا نے آپ کی سُن لی....!

پڑوسی: (بچہ کھلاتے ہوئے) میاں....! اکیلے ہی اکیلے منہ میٹھا کرو گے یا ہمیں بھی سناؤ گے خوشخبری.... اللہ قسم.... اتنے گئے گذرے ہم بھی نہیں ہیں.... عقیل میاں کی خوشی پر پاؤ‘ آدھا پاؤ مٹھائی تو ہم بھی کھلا ہی سکتے ہیں....

مولوی صاحب: (زور سے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے) کس خوشخبری کا ذکر ہو رہا ہے میاں.... ذرا ہمیں بھی تو بتلاؤ....؟ کونڈوں کے بعد سے منہ میٹھا کئے ہوئے بہت دن ہو گئے ہیں....!

عقیل: اسلام علیکم مولوی صاحب....

مولوی صاحب: وعلیکم السلام.... مگر.... خالی خُولی نہیں.... بھرا ہوا سلام ہونا چاہیئے خوشخبری کے موقع پر....!

عقیل: لاؤ بھائی‘ اب بتلا بھی دو خوشخبری کی بابت (ڈاکیہ کو مخاطب کرتے ہوئے)

ڈاکیہ: اتنی بڑی خوشخبری ہے پہلے مٹھائی کھلایئے پھر بتلاؤں گا.... سولہ گریڈ کی نوکری کا کال لیٹر لے کر آیا ہوں....

مولوی صاحب: ماشااللہ.... ماشااللہ.... بس عقیل میاں‘ آج سے نماز پنجگانہ شروع کر دیجئے پھر دیکھئے پروردگار عالم کس طرح آپ کی راہیں کشادہ کرتا ہے....

عقیل: انشااللہ‘ انشااللہ.... لو میاں.... فی الحال یہ رکھ لو نوکری ملنے کے بعد آپ کو مٹھائی میں تول دوں گا.... (جیب سے ہاتھ نکال کر ڈاکیہ کی طرف بڑھاتے

ہوئے)

پڑوسی: بھیا ہمیں تو بس پیٹ بھر کھلا دینا.... مٹھائی وٹھائی میں تلنے کا شوق انہیں ہوگا (ڈاکیہ اور مولانا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) ہمیں تو سونے، چاندی میں تلنے کا شوق ہے.... دیکھئے پروردگار کب سنتا ہے.... عقیل میاں آپ نے وہ مقولہ نہیں سنا.... دینے والا جب دینے پر آتا ہے تو چھپّڑ پھاڑ کر دیتا ہے....!

سین نمبر 3

مقام: عقیل کے گھر کا دالان اور صحن کا منظر

کردار: عقیل کی والدہ، عقیل اور صحن میں کھیلتی ہوئی چھوٹی بہن

عقیل: امی.... امی جی.... کہاں ہیں آپ....؟

عقیل کی والدہ: (کمرے سے برآمد ہوتے ہوئے) زور زور سے کیوں چیخ رہے ہو.... دیوانے ہو گئے ہو کیا....؟

عقیل: امی جی.... آپ صرف دیوانے کی بات کر رہی ہیں، میرا دل.... دیوانہ، پاگل، من موجی، ہوتق، چپڑ گنجو.... نہ جانے کیا کیا بننے کو بیتاب ہو رہا ہے....!

عقیل کی والدہ: دماغ گھاس چرنے چلا گیا ہے جو اس طرح کی باتیں کرنے لگے ہو....!

عقیل کی چھوٹی بہن: (صحن میں رسّی ٹاپتے ہوئے) لگتا ہے بھائی کو کوئی لڑکی پسند آ گئی ہے....!

عقیل کی والدہ: چل ہٹ چھچھوری.... تجھے تو خواب میں بھی بھابھی نظر آتی ہے....

چھوٹی بہن: مجھے.... یا....!

عقیل کی والدہ: اچھا چھوڑو بھی یہ بچپنا.... اصل بات بتاؤ کیا ہے....؟

عقیل: یہ دیکھئے....! (والدہ کی جانب کال لیٹر لہراتے ہوئے)

عقیل کی والدہ: یہ کیا ہے....؟

عقیل: نوکری کا پروانہ.... ایسی ویسی نہیں، سٹینوگرافر کی سولہ گریڈ کی نوکری، گھر، گاڑی، مہنگائی الاؤنس، میڈیکل، تعلیم.... تمام سہولتوں کے ساتھ....!

عقیل کی والدہ: پروردگارِ عالم تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے (آسمان کی جانب دونوں ہاتھ اُٹھا کر) میں تو آج ہی شکرانے کے سو نفل ادا کروں گی....

عقیل: امی جان....! جس قدر باقاعدگی سے آپ پانچ وقت کی فرضی نماز پڑھ کر خدا سے دعائیں مانگتی ہیں اُس کے بعد نفل وغیرہ کی کیا ضرورت ہے....؟

عقیل کی والدہ: نا بیٹا نا.... اس طرح نہیں کہتے.... یہ تو میرے اوپر اپنے پروردگار کا قرض ہے.... میں نے منّت مانی تھی کہ جس روز میرے عقیل کو نوکری کا بلاوا آئے گا اُس روز اور جس روز میرا بچہ ملازمت پر جائے گا اُس روز سو سو نفل شکرانے کے ادا کروں گی....

عقیل: یہ آپ کا اور آپ کے پروردگار کا معاملہ ہے وہ جانے اور آپ جانیں.... فوری طور پر میرا سوٹ نکال دیجئے تاکہ میں اُسے ڈرائی کلین کرا لاؤں....

عقیل کی والدہ: سوٹ....! کونسا سوٹ....؟

عقیل: آپ بھی کمال کرتی ہیں.... اکلوتا گرم سوٹ تو ہے میرے پاس....!

عقیل کی والدہ: وہ.... کتھئی والا....!

عقیل: ہاں، ہاں وہی کتھئی والا اور کونسا....؟

عقیل کی والدہ: تمھارا دماغ چل گیا ہے....!

عقیل: میرا دماغ چل گیا ہے.... کیوں....؟

عقیل کی والدہ: ارے بوڑم! پچھلے ہفتے ہی تم اپنے دوست محمود کے ہاں ڈرائی کلین کے لئے لے گئے تھے اپنا سوٹ اور میرا شال....!

عقیل: ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ (سر کو ہاتھ مارتے ہوئے) واقعی میں پاگل ہو گیا ہوں....!

سین نمبر 4

مقام: مین بازار میں "پاک" ڈرائی کلینرز کے نام سے محمود کی دکان

کردار: محمود کا چھوٹا بھائی محبوب، کارندہ زلفی اور عقیل

محبوب: آہا.... عید سے پہلے عید کا چاند کہاں چڑھ آیا....؟

عقیل: تمہارا کیا خیال ہے، عید کے چاند کو نظر آنے یا نہ آنے کے لئے تمہاری اجازت کی ضرورت پڑتی ہے....؟

محبوب: بہت دنوں بعد نظر آئے ہیں آپ.... اس لئے کہہ رہا ہوں....!

عقیل: ابے یار....! پچھلے ہفتے کوئی دو گھنٹے بیٹھا رہا ہوں.... تم نہ جانے کون سے کھڈّے میں چھپے رہتے ہو.... پوچھ لو زلفی سے....!

محبوب: مجھے علم نہیں.... میں کہاں جاؤں گا.... دکان.... گھر.... اور.... گھاٹ....

عقیل: ورکشاپ کب جاتے ہو....؟

محبوب: ورکشاپ....! (حیران ہو کر سوچتے ہوئے) اوں.... آں.... شام کو چکر لگاتا ہوں....

عقیل: کہاں ہیں پیرِ مغاں....؟

زلفی: آپ کو تو علم ہے صاحب کہ حاتم طائی نے سات سوال حل کرنے کے بعد محمود بھائی کی بابت پوچھے گئے سوال پر ہار مان لی تھی....!

عقیل: بہت بدمعاش ہو گیا ہے تُو بیٹا....! محمود نے سُن لیا تو وہ جوتے لگائے گا کہ نانی یاد آ جائے گی....!

زلفی: آپ کس وقت کام آئیں گے....؟

عقیل: چل چھوڑ باتیں نہ بنا میرا سوٹ دے دے....

محبوب: آپ کا سوٹ.... میں نے تو نہیں دیکھا.... شوکیس میں دیکھ لیں.... اگر ہے تو میں نکال دیتا ہوں....

عقیل: (شوکیس کو اُچک اُچک کر غور سے دیکھتے ہوئے) میرا خیال ہے اس میں تو نہیں ہے....!

محبوب: بھائی آتے ہیں تو میں اُن سے کہتا ہوں.....!
عقیل: کہنا نہیں ہے..... مجھے ہر حال میں کل اپنا سوٹ چاہیئے وہ بھی ڈرائی کلین کیا ہوا.....!
محبوب: فکر ای نہ کریں.....!

سین نمبر 5

مقام: یٰسین چائے والے کی دکان، چائے کی کیتلی، دودھ کا کڑھاؤ، لکڑی کی پرانی الماری کے ایک خانے میں چند ایک پرچ پیالے اور گلاس دوسرے خانہ میں بند، مکھن، رس اور انڈے یٰسین کے قریب رکھا گلہ اور دکان کے باہر چند پرانی بنچیں
کردار: عقیل، یٰسین چائے والا، ایک میلا کچیلا ملازم اور دو گاہک
یٰسین: خدا جب حُسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے.....! (اونچی آواز میں گنگناتے ہوئے)
عقیل: السلام علیکم یٰسین بھائی..... خیریت تو ہے آج بڑے اونچے سروں میں گا رہے ہیں.....؟
یٰسین: میاں! اونچے سروں میں گا ہی تو رہے ہیں رو تو نہیں رہے.....!
عقیل: مطلب.....؟
یٰسین: اتنے سادہ نہ بنو عقیل میاں..... ہم مٹھائی مانگنے والوں میں نہیں کھلانے والوں میں ہیں.....!
عقیل: اچھا تو آپ کو بھی پتہ چل ہی گیا.....!
یٰسین کا ملازم: اجی یہ آپ کو بھی سے کیا مراد ہے آپ کی.....؟ عبدالحمید پوسٹ مین یٰسین بھائی سے ماہوری پہ چائے پی وے ہے..... ان کو نہی پتہ ہوگا تو کس کو ہوگا.....؟
عقیل: دعا کریں یٰسین بھائی اس بار اللہ تعالیٰ کامیابی نصیب کر دے.....!
پہلا گاہک: میاں.....! یہ بے چارا تو ہر کسی کے لئے دعا کرے ہے مگر کوئی سننے والا بھی ہو.....!
دوسرا گاہک: لگتا ہے اللہ میاں بھی بڑے لوگوں کی سنتا ہے ورنہ بے چارے یٰسین کا لونڈا دسویں کر کے جُوتیاں نہ چٹخاتا پھر رہا ہوتا.....!
یٰسین: میاں ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے..... بس اپنے عقیل بھائی کو نوکر ہونے دو پھر دیکھنا یہ اپنے شکورے کو کس طرح کام پہ لگاتے ہیں..... کیوں عقیل بھائی ٹھیک کہہ رہا ہوں نا.....! (بائیں آنکھ دباتے ہوئے)
عقیل: ہاں، ہاں..... کیوں نہیں..... کیوں نہیں.....!
یٰسین: لو پھر اسی بات پہ ایک مالی والی چائے ہو جائے.....!
عقیل: نہیں ابھی نہیں، بہت بہت شکریہ..... میں ابھی ابھی محمود کی دکان سے چائے پی کر آ رہا ہوں.....!
یٰسین: میاں رہنے بھی دو..... اُس لپاڑیئے کا نام نہ لیا کرو میرے سامنے.....!

سین نمبر 6

مقام: عقیل کا گھر اور پرانے کمرے میں بچھی مسہری، چند صندوق اور دو کرسیاں، کارنس پر سجے چینی اور تانبے کے برتن
کردار: عقیل، عقیل کی والدہ، عقیل کی ممانی یعنی ہونے والی ساس اور چھوٹی بہن
عقیل: السلام علیکم امی جان..... السلام علیکم ممانی جان..... کیسی ہیں آپ..... کب آئیں.....؟
عقیل کی ممانی: میں واری..... میں صدقے..... میں قربان..... کِتا سا منہ نکل آیا میرے بچے کا نوکری کی تلاش میں.....!
چھوٹی بہن: بھائی جان تو کل کہہ رہے تھے کہ ان کا وزن بڑھ گیا ہے.....؟
عقیل کی والدہ: چُپ کر لفتی کہیں کی..... ہر وقت کتر کتر زبان چلتی رہتی ہے..... وقت دیکھتی ہے نہ موقع..... ہاں بیٹا.....! (عقیل کو مخاطب کرتے ہوئے) کپڑے مل گئے محمود کے ہاں سے.....؟
عقیل: نہیں امی..... محمود دکان پر نہیں تھا..... اُس کے بھائی سے کہہ آیا ہوں..... صبح مل جائیں گے.....!
عقیل کی والدہ: اور ہاں بیٹا جب کپڑے لینے جاؤ تو یہ جھاڑ بھی کٹاتے آنا.....! (عقیل کے بالوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے)
عقیل: کل تو شاید وقت نہ ملے، میں ابھی کٹا آتا ہوں.....! (باہر جانے کے لئے مڑتا ہے)
ممانی: ٹھہرو بیٹا.....! ایک منٹ ٹھہرو.....! (سفید چوغی برقعے کی بغل سے مٹھائی کا ڈبہ نکال کر کھولتی ہیں اور نوکری ملنے کی خوشی میں عقیل کے منہ میں لڈو ٹھونستے ہوئے دعائیں دینے لگتی ہیں) اللہ کامیاب کرے..... اور ہاں بیٹا سُنو.....! میں نے امام ضامن بنوایا ہے تمہارے لئے، صبیحہ نے اپنے ہاتھوں سے آب زم زم میں کریب کا کپڑا ڈبو کر سیا ہے..... بس صبیحہ کے ابا آ جائیں تو میں اور وہ آ کر خود تمہارے بازو پہ باندھیں گے..... انشااللہ اس بار کامیابی ضرور تمہارے قدم چومے گی.....!

سین نمبر 7

مقام: مین بازار میں ''پاک'' ڈرائی کلینرز کے نام سے محمود کی دکان
کردار: عقیل، محمود اور محمود کا ملازم زلفی
محمود: میری جان..... میرے بھائی..... میرے عزیز..... کہاں ہوتے ہو.....؟
(عقیل سے معانقہ کرتے ہوئے محمود نے گرمجوشی کا مظاہرہ کیا)
عقیل: میں تو یہیں ہوتا ہوں..... تم سناؤ، تم کہاں ہوتے ہو.......؟
محمود: میں نے کہاں جانا ہے..... ملّا کی دوڑ مسجد تک..... گھر سے دکان اور دکان سے گھر (زلفی کھانسنے لگتا ہے)

عقیل: سنا ہے.....! اگلے الیکشن میں کھڑا ہونے کی تیاری کر رہے ہو (زلفی اور زور سے کھانسنے لگتا ہے)

محمود: یار مذاق مت کرو..... میں اور سیاست..... خدا کا نام لو..... خدا کا.....!

عقیل: اچھا..... ایسی بات ہے..... تو پھر کل کہاں تھے جناب.....؟ (زلفی منہ نیچے کر کے مسکرانے لگتا ہے)

محمود: کل..... اچھا..... وہ..... وہ..... میں..... اماں کو ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا تھا.....!

عقیل: محبوب تو کہہ رہا تھا.....؟

محمود: (چونکتے ہوئے) کیا کہہ رہا تھا محبوب.....؟ (زلفی کے ہاتھ سے استری پھسل جاتی ہے) تیری تو..... ہاں تو عقیل بھائی..... محبوب کیا کہہ رہا تھا آپ سے.....؟

عقیل: ابے بھائی.....! محبوب نے مجھ سے کیا کہنا ہے..... میں البتہ اُس سے اپنے سوٹ کی بابت تاکید ضرور کر گیا تھا.....!

محمود: کون سے سوٹ کی بابت (بے گانگی سے)

عقیل: تم اتنے بھلکّڑ ہو نہیں جتنا ظاہر کر رہے ہو..... لاؤ جلدی نکالو.....!

محمود: کیا نکالوں.....؟

عقیل: میرا سوٹ..... اور..... کیا.....؟

محمود: اچھا..... تو یہ کہو نا تمہارا سوٹ.....!

عقیل: آپ کے خیال میں..... اتنی دیر سے میں کیا کہہ رہا ہوں.....؟

محمود: میرا خیال ہے تم بھی یہی کہہ رہے ہو شاید.....! (جھینپتے ہوئے)

عقیل: شاید نہیں بھائی..... یقیناً..... یقیناً اتنی دیر سے میں اپنے سوٹ کی بابت ہی بک بک کر رہا ہوں..... پتہ ہے کیوں.....؟

محمود: (بھولا سا منہ بنا کر) کیوں.....؟

عقیل: کیونکہ..... کیونکہ صبح مجھے..... بہت اہم انٹرویو پر جانا ہے..... اور..... میرے پاس..... صرف ایک ہی سوٹ ہے.....!

محمود: (گھبراہٹ کو چھپاتے ہوئے) ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے..... پہلے چائے تو پی لو..... اُلّو کے پٹھے اتنی دیر سے عقیل بھائی کھڑے ہیں اور تُو چائے تک لینے نہیں گیا.....! (محمود نے زلفی کو پھٹکارتے ہوئے چائے کے بہانے بھگا دیا)

عقیل: چائے وائے..... چھوڑو یار..... جلدی سے میرا سوٹ نکال دو (قدرے غصے سے)

محمود: (سراسیمگی کے لہجے میں) عقیل بھائی..... وہ..... بات یہ ہے..... کہ..... آپ کا سوٹ.....!

عقیل: ہاں..... میرا سوٹ.....؟

محمود: (گھبرا کر جلدی سے) دھلنے گیا ہے.....!

عقیل: دھلنے گیا ہے.....؟

محمود: جی..... جی..... دھلنے گیا ہے.....!

عقیل: تم تو کہتے تھے کہ تمہاری ڈرائی کلیننگ کی ورکشاپ ہے اور اُس میں ڈرائی کلیننگ کا امپورٹڈ پلانٹ لگا ہوا ہے.....؟

محمود: غ..... غلط..... تھوڑا کہتا تھا بھائی.....! (قدرے ڈھٹائی کے ساتھ)

عقیل: میں کچھ نہیں جانتا..... مجھے ہر حال میں اپنا سوٹ ابھی چاہیئے.....!

محمود: ابھی.....!

عقیل: ہاں..... ہاں..... ابھی.....!

محمود: اس کا تو ایک ہی حل ہے.....!

عقیل: وہ کیا.....؟

محمود: یار..... فلحال..... تم میرا سوٹ پہن کر کام چلا لو.....!

عقیل: تمہارا سوٹ..... (ہنسی ضبط کرتے ہوئے) میں نے تو زندگی بھر تمہیں، سوٹ تو دُور کی بات ہے پینٹ شرٹ پہنے ہوئے بھی نہیں دیکھا.....!

محمود: (پکا سا منہ بنا کر) اب اتنا بھی بونگا نہیں ہوں..... پہنتا ہوں..... کیوں نہیں پہنتا..... شادی بیاہ کے موقع پر ضرور پہنتا ہوں.....!

عقیل: (یقین نہ کرتے ہوئے) پہنتے ہوں گے یار..... تمہارا سوٹ مجھے کب آئے گا.....؟

محمود: اب اتنا بھی موٹا نہیں ہوں، جتنا تم بنا رہے ہو..... جتنا ڈھیلا ڈھالا لباس پہن کر جاؤ گے اُتنے سوبر اور بردبار لگو گے..... اور جانتے ہو.....!

عقیل: اچھا بابا اچھا..... (عقیل نے محمود کا جملہ درمیان سے کاٹتے ہوئے) جیسے تمہاری مرضی..... انٹرویو تو ہر حال میں دینا ہے.....!

سین نمبر 8

مقام: بڑے دفتر کی بلڈنگ کا ایک بڑا کمرہ، بہت سے ملازم اور کمرے کے باہر پی۔اے کی میز کُرسی

کردار: عقیل و دیگر اُمیدوارانِ آسامی اور صاحب کا پی۔اے

پی۔اے: بھائی.....! اس پر تو عقیل لکھا ہے.....!

عقیل: جی..... جی..... میں ہی..... عقیل ہوں.....! (خوشی سے سینہ پھلاتے ہوئے)

پی۔اے: کان کب سے صاف نہیں کروائے.....؟

عقیل: (پریشان ہوتے ہوئے) کیا فرمایا آپ نے.....؟

پی۔اے: میرے بھائی..... شکیل پکارا ہے میں نے..... شکیل..... سمجھے..... (جھلاہٹ سے عقیل کو کاغذات واپس کرتے ہوئے)

پی۔اے: ہاں بھئی.....! شکیل ہے کوئی..... (خاموشی کے وقفے میں تمام اُمیدوار، اشتیاق سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے) محمد رفیق..... (اس آواز پر

ایک پرجوش نوجوان آگے بڑھ کر' پی۔اے کو کاغذات دکھاتا اور اندر چلا جاتا ہے) جان محمد..... عمر سلطان..... محمد اسمعیل..... سکندر علی..... (تمام آوازوں پرُخوش شکل اور پریشان حال نوجوان پرجوش انداز میں اندر جاتے اور مایوسانہ طریق پر باہر آتے رہے)

عقیل: ......جی..... (پی۔اے کی تیسری آواز پر' حیرت' پریشانی اور شرمندگی کے انداز میں عقیل پی۔اے کے روبرو کاغذات پیش کرتا ہے)

پی۔اے: ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے..... میری چیکنگ تو بس رسمی ہے..... اصل پرکھ پڑچول تو صاحب نے کرنی ہے..... (عقیل کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے فائل اندر لے کر جاتا ہے)

سین نمبر 9

مقام: باس کا ویل فرنشڈ کمرہ

کردار: میز کے پیچھے آرام دہ کرسی میں کمپیوٹر کی سکرین پر نظر جمائے بیٹھا ہوا باس اور کمرہ میں داخل ہوتا ہوا عقیل

عقیل: مے۔آئی۔کم۔ان سر.....!

باس: ہوں.....! (عقیل کی فائل کو غور سے دیکھتے ہوئے لمبی ہوں) گڈ..... وری گڈ..... میٹرک سے ایم۔اے تک فرسٹ ڈویژن ہے آپ کی..... ایکسی لینٹ..... (فائل سے نظر اوپر اٹھاتے ہوئے) بیٹھئے.....!

عقیل: تھینک یو..... تھینک یو وری مچ..... سر..........! (باس کے کمپلیمنٹ پر اعتماد بحال کرتے ہوئے عقیل باس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے لگتا ہے)

باس: کھڑے ہو جایئے..... (عقیل کا بہ غور جائزہ لیتے ہوئے)

عقیل: جی.....! (پریشان ہوتے ہوئے)

باس: میں نے کہا کھڑے ہو جایئے (تحکم سے)

عقیل: جی..... جی.....! (کھڑا ہو جاتا ہے)

باس: پیچھے مڑیئے.....!

عقیل: جی.....! (پریشان ہو کر)

باس: میں نے کہا' پیچھے مڑیئے.....!

عقیل: کمال ہے.....! (منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے پیچھے مڑ جاتا ہے)

باس: ہوں.....! (عقیل کا گھوم پھر کر چاروں جانب سے جائزہ لیتے ہوئے) سوٹ کب سے پہنتے ہیں آپ.....؟

عقیل: سر.....! ان باتوں کا میرے انٹرویو سے کیا تعلق ہے.....؟ (زچ ہوتے ہوئے)

باس: آپ کی ملازمت سے تو شاید نہیں..... مگر..... اس سوٹ سے ضرور ہے.....!

عقیل: (جھینپتے ہوئے) سر.....! میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا.....؟

باس: میں ہمیشہ..... ماڈرن ٹیلر سے کپڑے سلواتا ہوں.....! (فخریہ انداز میں)

عقیل: جی سر.....! (ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے)

باس: جی.....! (گردن مٹکا کر)

عقیل: کیا عرض کروں سر.....! (شرمندگی سے کوٹ کے بٹن کھولتے ہوئے باس کی طرف دیکھنے لگتا ہے..... (آہستہ آہستہ' عقیل کے چہرے پر' شرمندگی کے آثار دور ہونے لگتے ہیں اور اُس کی جگہ استہزایہ انداز ابھرنے لگتا ہے) سر.....! (اعتماد سے سینہ پھلاتے ہوئے) میرے ٹیلر کا نام مشرق ٹیلر ہے.....!

باس: (بے زاری سے) آپ کے ٹیلر کے نام سے مجھے کیا فرق پڑتا ہے..... مشرق ٹیلر ہو کہ مغرب ٹیلر.....!

عقیل: گستاخی معاف..... سر..... اگر..... آپ بھی..... ب' ٹ.....!

باس: (چونکتے ہوئے) ہیں.....! کیا مطلب ہے آپ کا.....؟ (گھبراہٹ میں' کوٹ کے بٹن کھول کر اندر جھانکتا ہے..... اور..... حیرت سے عقیل کا منہ تکنے لگتا ہے) اوہ..... نو..... ہاؤ..... اِز..... پاسیبل.....؟

(آہستہ آہستہ دونوں کی خفت دور ہونے لگتی ہے اور دونوں ہی ایک ساتھ زور کا قہقہہ لگاتے ہوئے ہاتھ ملانے لگتے ہیں جبکہ باس دوسرے ہاتھ سے کال بیل پر زور ڈالنے لگتا ہے)

---جرأت اظہار---

متنازعہ انٹرویو کی اشاعت کے باعث بند ہونے والا کرایہ مکان اور ماہانہ خرچ کی ضیاء الحق کی جانب سے بحالی کے بعد سیکرٹری اطلاعات نے جوش صاحب کو بلا کر یہ کہتے ہوئے اطلاع دی کہ آپ کا ماہانہ وظیفہ اور رہائش گاہ کا کرایہ بحال کر دیا گیا ہے۔ جواب میں جوش صاحب نے نہایت تُرش لہجے میں سیکرٹری اطلاعات کو مخاطب کرتے ہوئے کہا'' بھئی کچھ تو شرم کرو، اطلاعات کے سیکرٹری ہو کر قیام گاہ کو رہائش گاہ کہے رہے ہو، اگر رہنے کی جگہ کو رہائش گاہ کہو گے تو پیدا ہونے کے مقام کو پیدائش گاہ کیوں نہیں کہتے''۔ سنا ہے! اس کے بعد بحالی کے باوجود کئی ماہ تک جوش صاحب کا وظیفہ اور کرایہ مکان رُکا رہا۔

❍

ایک صدی کا قصہ
لتامنگیشکر

دیپک کنول (ممبئی بھارت)

28 ستمبر **1929** کو اندور کے سردار محلے میں ایک مہاراشٹرن پریوار میں ایک لڑکی نے جنم لیا۔اندور کا یہ شہر تب ریاست مہارشٹر میں شامل تھا ۔بعد میں یہ شہر مدھیہ پردیش میں ضم ہوگیا۔چونکہ یہ اس پریوار کا پہلوٹھی کا بچہ تھا اسلئے گھر میں دیوالی کے تیوہار جیسا سماں تھا۔اُنہوں نے اس بچی کو لکشمی کا اوتار سمجھ لیا اور اس کی ماں شودھامتی اور باپ دینا ناتھ ہردیکر نے اس بچی کا نام ہیما رکھ دیا۔اس لڑکی کا باپ دینا ناتھ ہردیکر گوا کے کلاونت قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔وہ ایک جانا مانا کلاسیک گلوکار اوراسٹیج کلا کار تھا۔اُسکی اپنی ایک ناٹک منڈلی تھی جسکا نام اُنہوں نے ''بلونت ناٹک منڈلی'' رکھا تھا۔اس بچی کی پیدائش کے ساتھ ہی اُن کی یہ ناٹک منڈلی خوب چل پڑی۔اُنہی دنوں اُنہوں نے ایک ناٹک کھیلا جسمیں لتیکا نام کا ایک نسوانی کردار تھا جسے دینا ناتھ نے خود نبھایا کیونکہ اُن دنوں عورت کے کردار مرد کلا کار ہی ادا کرتے تھے۔اس ناٹک نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دئے۔دینا ناتھ نے اس ناٹک کی بے مثال کامیابی کے بعد اپنی بیٹی کا نام ہیما سے بدل کر لتا رکھ دیا۔

لتا کی پیدائش پریوار کے لئے اتنی مبارک ثابت ہوئی کہ دیکھتے ہی دیکھتے اُنکے پو بارہ ہونے لگے۔دینا ناتھ کی ناٹک منڈلی ایسے چمک اُٹھی کہ گھر میں ہن برسنے لگا۔دینا ناتھ نے سانگلی (مہاراشٹر) میں ایک بہت بڑی حویلی خریدی جسمیں گیارہ بارہ وشال کمرے تھے۔دینا ناتھ نے اپنی امارت کا مظاہرہ کرنے کے لئے چار گھوڑی والی ایک بگھی خریدی جس پر وہ بیٹھ کر نکلتا تھا اور لوگ حسرت بھری نظروں سے اس بگھی کو دیکھا کرتے تھے۔لتا کو موسیقی کی طرف بچپن سے ہی لگاؤ تھا۔بچی کا رجحان دیکھ کے دینا ناتھ نے پانچ سال کی عمر سے ہی اُسے سنگیت کی تربیت دینی شروع کی۔کہا جاتا ہے کہ لتا نے جب اسکول میں داخلہ لیا تو پہلے دن سے ہی وہ بچوں کو گانا سکھانے بیٹھ گئی۔اُسکے اسکول ٹیچرس نے جب اُسے اس بات کے لئے ٹوکا تو وہ اس قدر ناراض ہوئی کہ اگلے روز سے اُس نے اسکول جانا چھوڑ دیا۔اسی بیچ لتا چائلڈ آرٹسٹ کے طور پر ڈراموں میں حصہ لینے لگی جس سے چند قدامت پسند برہمن برہم ہو اُٹھے یہاں تک کہ اُسکے اپنے خاندان کے لوگ بھی اُس سے کنارہ کرنے لگے کیونکہ ان لوگوں کا تعلق پجاریوں کے قبیلے سے تھا۔اُن دنوں لوگ آرٹ اور کلا کے پیشے کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔عام لوگ اسے بھانڈوں اور میراثیوں کا پیشہ سمجھتے تھے۔دینا ناتھ کو اپنے ہی گاؤں میں کافی ذلت اور مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔گاؤں والوں نے اُنکا جینا مشکل کر دیا۔رشتہ داروں نے اُن سے بول چال بند کر دی۔حالات اسقدر سنگین ہو گئے کہ وہ اپنے ہی گھر میں اسیر بن کر رہ گئے۔وہ اس حبس اور گھٹن بھرے ماحول سے اوبنے لگے۔ایک دن اُنہوں نے اُس گاؤں کو چھوڑ کر جانے کا فیصلہ کیا۔دینا ناتھ اپنے پاس پڑوسیوں اور قرابت داروں سے اسقدر دکھی اور دلبرداشتہ ہو چکے تھے کہ نقل مکانی سے پہلے اُس نے اپنی ذات سے برہمنی کا طوق ہٹا لیا یعنی اُس نے اپنا خاندانی نام ہردیکر ہٹا کر اُسکی جگہ اپنے گاؤں منگیش کا لاحقہ اپنے نام کے ساتھ جوڑ لیا۔اس طرح وہ ہردیکر سے منگیشکر ہو گئے۔

دینا ناتھ نے سونے کا دل پایا تھا۔وہ بڑا سخی اور رحم دل تھا۔اُسکی یہی سخاوت اُسے لے ڈوبی۔لتا جب چھ سال کی تھی اُسے چیچک ہوگئی۔وہ چیچک سے نکل تو پائی البتہ چہرے پر داغ دھبے رہ گئے۔ایک طرف لتا کی بیماری اور دوسری طرف دینا ناتھ کی ناٹک منڈلی پر بدبختی کے سایے منڈھلانے لگے تھے۔ناٹک منڈلی گلے گلے تک قرضے میں ڈوبی ہوئی تھی۔جونہی یہ بات ادھر اُدھر پھیلنے لگی لین دار دینا ناتھ کے سر پر سوار ہو کر اپنے پیسے کا تقاضا کرنے لگے۔حالت ایسی ہوگئی کہ دینا ناتھ پائی پائی کا محتاج ہونے لگا۔وہ اپنے کلا کاروں کی فیس تک ادا نہ کر سکا۔گھر کی حالت دیکھ کر لتا کو سات سال کی عمر سے اسٹیج پر کام کرنا پڑا۔وہ مسلسل کام کرتی رہی۔اسی بیچ اُس نے ایک مراٹھی ڈرامے ''راج بو ہلے واچا'' میں اداکاری کے ساتھ ایک گانا بھی گایا جسے ناظرین نے قطعی پسند نہ کیا۔عام رائے یہ تھی کہ وہ اداکاری تو کر سکتی ہے البتہ گلوکاری اُس کے بس کی بات نہیں ہے۔لتا نہ جانے کس مٹی کی بنی ہوئی تھی کہ چند لوگ اُسکی گائیکی کو ہدف ملامت بناتے رہے تاہم اُسمیں اسقدر خود اعتمادی تھی کہ وہ اس ساری تنقید و تبصرے کو پسِ پشت ڈال کے ریاض کرتی رہی۔وہ ابتدا سے ہی سنگیت کا زیادہ سے زیادہ گیان حاصل کرنے کے درپے رہی۔وہ موسیقی کی تربیت باضابطہ طور پر سنگیت کے مہا گوروں سے وقفے وقفے سے لیتی رہی۔پہلے اُس نے اُستاد امان علی خان کی زیرِ نگرانی کلاسیکی سنگیت کی تعلیم حاصل کی۔اُسکے بعد اُس نے امانت خان سے مزید تربیت پائی۔

لتا منگیشکر نے لڑکپن دیکھا ہی نہیں۔اُسکے کھیل کود کے دن اسٹیج پر کام کرتے کرتے گزر گئے۔وہ دن رات کام کرتی رہی۔دیکھتے ہی دیکھتے وہ تیرہ سال کی ہوگئی۔پریوار میں اور چار بچوں کا اضافہ ہوا تھا۔تین بہنیں اور ایک بھائی۔آشا، اوشا، مینا اور بھائی ہردے ناتھ۔لتا سب سے بڑی تھی۔دینا ناتھ کا برا وقت شروع ہوا تھا۔کوئی بھی ساہوکار اُسکی ناٹک منڈلی میں پیسے لگانے کے لئے تیار نہ تھا۔دینا ناتھ کو پچھلے قرضے چکانے کے لئے اپنی حویلی بیچنی پڑی۔انہیں حویلی سے نکل کر ایک چال میں جا کر رہنا پڑا۔ان ناکامیوں کا دینا ناتھ کی صحت پر بڑا برا اثر پڑا۔وہ مے نوشی کی طرف مائل ہو گیا۔اُسکی بلا کی مے

نوشی اُس کے لئے جان لیوا ثابت ہوئی بیالیس سال کی عمر میں ہارٹ فیل ہونے سے اُسکی موت واقع ہوئی۔ پریوار پر دکھوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ مرنے سے ایک دن قبل دینا ناتھ نے لتا کو اپنے پاس بلایا اور رقّت بھری آواز میں اُس نے اپنی چہیتی بیٹی سے کہا ''تمہیں شاید معلوم نہ ہوگا کہ ہم نے تمہاری پیدائش سے قبل بیٹے کی کامنا کی تھی۔ جب کہ بیٹے کی جگہ تم پیدا ہوئی۔ اب تم میرے لئے کسی بیٹے سے کم نہیں ہو۔ مجھے پورا یقین ہے کہ میرے مرنے کے بعد تم اپنے پریوار کا پورا خیال رکھوگی۔'' اگلے روز وہ اس جہانِ فانی سے رخصت ہوا اور اپنے پیچھے ایک روتا بلکتا خاندان بے سروسامانی اور کسم پرسی کے عالم میں چھوڑ گیا۔

دینا ناتھ کے مرنے سے پورے پریوار پر قیامت آ پڑی تھی۔ چناچہ گھر کی ذمہ داری لتا کے نازک کاندھوں پر آ گئی اسلئے اپنی کم عمری میں ہی اُسے وقت کی تپتی ہوئی دھوپ میں حالات کے تند و تیز تھپیڑوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لتا نے باپ کی آخری خواہش کو پورا کرنا اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا۔ باپ کے مرنے کے بعد وہ پائی پائی کو محتاج ہو کے رہ گئے تھے۔ حالت یہ تھی کہ چولھے آگ نہ گھڑے پانی تھا۔ صبح کا کھانا کھاتے تو فکر یہ لاحق ہوتی تھی کہ رات کا کھانا کہاں سے آئے گا۔ لتا باپ کی موت کے چند ہفتے بعد اس اُمید کے ساتھ اپنے گاؤں اپنے رشتہ داروں سے ملنے چلی گئی کہ شاید اس آڑے وقت میں وہ اُن کی کچھ مدد کر سکیں مگر مدد تو دور وہاں اُسے رشتہ داروں کے طعنے و تشنیع سننے پڑے۔ اُنہوں نے نہ صرف اُسکی تذلیل کی بلکہ ساتھ ہی اُسے تنبیہہ بھی کی کہ وہ آئندہ ان سے ملنے نہ آیا کرے۔ وہ لتا کے پریوار سے کوئی رشتہ بنا کے رکھنا نہیں چاہتے تھے کیونکہ بقول اُنکے اُنہوں نے غیر اخلاقی پیشہ اپنا کر اُنکے خاندان پر بٹہ لگایا تھا۔ اس بے رخی اور بے مروتی نے لتا کا نازک سا دل بری طرح توڑ کے رکھ دیا۔ اُس نے قسم کھائی کہ اب وہ دوبارہ اس گاؤں میں قدم نہیں رکھے گی، چاہے اُسے بھوکوں کیوں نہ مرنا پڑے۔ اُسنے اپنے بھائی بہنوں کو بھی سختی سے اس بات کی تنبیہہ کر کے رکھی کہ وہ کسی کی دی ہوئی کوئی چیز قبول نہ کریں۔ چاہے بھوک سے اُنکا دم کیوں نہ نکل جائے۔ وہ بھیک میں ملی ہوئی کوئی بھی چیز کو چھوئیں گے تک نہیں۔ کہتے ہیں کہ امیری اور فقیری کی بو چالیس برس تک نہیں جاتی۔ یہی حال لتا کا تھا۔ وہ اپنی خودداری کو تلانجلی نہ دے سکی۔

ایک طرف لتا کی خود داری اور دوسری طرف بھوک سے بلکتے چھوٹے بھائی بہن۔ اُن کے یہاں ایک نوکرانی کام کرتی تھی جو اچھے دنوں میں ساتھ تو تھی ہی وہ برے دنوں میں بھی اُن کے یہاں آیا جایا کرتی تھی۔ چنانچہ ایک دن اُس نے جب بھوک کے مارے بے حال ہوئے بچوں کو بلکتے دیکھا تو اُس سے دیکھا نہ گیا۔ وہ دوڑ کر گئی اور کسی اور گھر سے وہ بچوں کے لئے کھانا لے کر آ گئی۔ اسی بیچ لتا آ گئی۔ اُسکی غیرت کو کبھی یہ گوارہ نہ تھا کہ اُسکے بھائی بہن مانگے کے کھانے سے اپنا پیٹ بھر لیں۔ اُسنے یہ کھانا لینے سے صاف انکار کر دیا۔ اُسنے اپنی نوکرانی سے صاف لفظوں میں کہا کہ اگر اُنہوں نے آج یہ کھانا لیا تو وہ اس غریبی کے دلدل سے کبھی بھی باہر نکل نہیں پائیں گے۔ اس طرح اُس نے اپنے چھوٹے چھوٹے بھائی بہنوں کو بھوکوں رکھنا قبول کیا مگر اپنی انا اور خودداری سے کوئی سمجھوتہ نہ کیا۔ یہ خودداری اُسے اپنے ماں باپ سے ورثے میں ملی تھی۔

لتا کو وہ واقعہ بار بار یاد آ رہا تھا جب اندور کے راجہ نے دینا ناتھ اور اُسکی ناٹک منڈلی کو راج محل میں پروگرام کرنے کے لئے مدعو کیا تھا۔ دینا ناتھ طے شدہ وقت پر جب راج محل میں پہونچا تو یہ سن کر اُسے بڑا تعجب ہوا کہ راجہ جی شکار کھیلنے چلے گئے ہیں اسلئے اُنہیں دوسرے دن پروگرام پیش کرنے کے لئے کہا گیا ہے۔ دینا ناتھ کو راجہ کی اس حرکت سے بڑی گہری ٹھیس پہونچی۔ اُسے لگا کہ راجہ نے اُن کی بے عزتی کی ہے۔ اُس نے سود و زیاں کی پرواہ نہ کر کے راجہ کے حکم کو پاپوش پر مار دیا اور اُسی رات اندور چھوڑ دیا۔ اُس دن کے بعد اُسنے دوبارہ کبھی راج محل میں جھانکنا تک گوارہ نہ کیا۔ اسی طرح ایک اور واقعہ لتا کو یاد آتا رہا۔ جب اُسکا باپ صاحب فراش ہوا تو ایک دن اُسکا ایک دوست خیریت پوچھنے کے بہانے گھر پر آ گیا۔ اُسنے دینا ناتھ کو حوصلہ دینے کی بجائے اُسکا مذاق اُڑانا شروع کیا۔ وہ اُس کی کھِلّی اُڑاتے ہوئے کہنے لگا کہ دیکھا شراب نے تمہارا کیا حال کر دیا ہے۔ اپنی صحت دیکھ اور میری صحت دیکھ۔ لتا کی ماں یہ سب کچھ سن رہی تھی۔ اچانک اُس نے چنڈی کا روپ دھارن کیا اور اُس نے اُس مہاشے کو آڑے ہاتھوں لے کر اُسکی وہ گت بنائی کہ وہ کھڑے کھڑے پانی پانی ہو کر رہ گیا۔ لتا کی ماں اُس شخص کے لتے لے کر پوچھنے لگی کہ آخر وہ ہوتا کون ہے اس طرح کے سوال اُسکے شوہر سے پوچھنے والا؟ بات اتنی بڑھ گئی کی اُس شخص کو سب سے معافی مانگنی پڑی۔

یہ خاندان برے وقت سے گزر رہا تھا۔ وہ کہتے ہیں نہ کہ جس کا کوئی نہیں ہوتا اُس کا خدا ہوتا ہے۔ ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد ایک نیک بندہ خدا کا فرشتہ بن کر اُنکی زندگی میں در آیا۔ اس شخص کا نام ماسٹر ونائیک دامودر کرناٹکی تھا۔ یہ دینا ناتھ کا اچھے دنوں کا دوست تھا۔ ماسٹر ونائیک نے اسٹیج کو خیر باد کہہ کے اپنی فلم کمپنی ''نو یگ چترپٹ'' نام کی پروڈکشن کمپنی کھول لی تھی ،جسکے تحت وہ مراٹھی میں فلمیں بنایا کرتا تھا۔ اُسے جب اس خاندان کی بپتا کسی کی زبانی سننے کو ملی تو وہ بڑا مغموم اور آزردہ خاطر ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ لوگ بڑے خود دار ہیں سیدھے طور پر کوئی مدد قبول نہ کریں گے اسلئے اُس نے لتا کو ایک دن اسٹوڈیو میں بلایا اور اُسکو ایک مراٹھی گانا گانے کی پیش کش کی۔ گانا جب ریکارڈ ہوا تو کسی کو بھی پسند نہ آیا۔ سب لوگوں کی یہی رائے تھی کہ لتا کی آواز کسی بیمار لڑکی کی آواز کی طرح لگ رہی ہے۔ سچ تو یہ تھا کہ دو دن سے لتا کے منہ میں ایک کھیل تک اُڑ کے نہیں گئی تھی۔ ایسے میں آواز بیمار نہیں لگتی تو کیا تر و تازہ اور شگفتہ لگتی۔ بہر حال گانا تو ریکارڈ ہوا لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اس گانے کو کبھی کسی فلم میں استعمال کیا ہی نہیں گیا۔ دراصل ماسٹر ونائیک لتا کے پریوار کی مدد کرنے کی نیت سے یہ سب کچھ کر رہا تھا۔ اُس نے لتا کو اس گانے کے عوض پچاس

روپے ادا کیئے جو کہ اُس زمانے میں ایک بڑی رقم تھی۔اسی سال یعنی 1942 میں ماسٹر ونائیک نے لتا کو اپنی مراٹھی فلم ''پہلی منگلا گور'' میں کام کرنے کے لئے آمادہ کرلیا۔اس فلم میں اُسے ہیروئین سنہیہ پربھا پردھان کی چھوٹی بہن کا کردار ادا کرنے کے لئے کہا گیا۔علاوہ ازیں ماسٹر ونائیک نے اس فلم کے لئے بھی لتا کی آواز میں پھر ایک گانا ریکارڈ کیا۔جب فلم بن کر ریلیز ہوئی تو ناظرین نے لتا کی اداکارانہ صلاحیتوں کی کھل کر تعریف کی مگر کسی نے اُسکی گلوکاری کی تعریف میں ایک لفظ تک نہ بولا۔اگر کچھ کہا بھی تو وہ سوائے نکتہ چینی کے اور کچھ نہ تھا۔ان ساری حکایتوں اور شکایتوں کے باوجود پتا نہیں ماسٹر ونائیک کا دل بار بار اس بات کی گواہی کیوں دے رہا تھا کہ اس آواز میں کوئی الگ بات ہے جسے لوگ پہچان نہیں پا رہے ہیں۔بہرحال وہ اس آواز کا ہمیشہ حمایتی رہا۔

ماسٹر ونائیک کی معرفت لتا کو نہ صرف اپنی فنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے کا موقع ملا تھا بلکہ اس آدمی کی مہربانیوں کی وجہ سے وہ اپنے پریوار کو زندہ رکھ پائی تھی۔ماسٹر ونائیک کی نوازشیں اُس پر بدستور جاری رہیں۔وہ ایک کے بعد ایک مراٹھی فلم میں کام کرتی رہی۔1944 میں ماسٹر ونائیک نے اُسے ہندی فلموں میں متعارف کرنے کا فیصلہ کیا۔وہ اُسے پونا سے بمبئی لے آیا۔ماسٹر ونائیک کی ہدایت میں بننے والی فلم ''بڑی دیدی'' میں اُسے ایک اہم رول ادا کرنے کا موقع مل گیا۔اس فلم کی ہیروئین نور جہاں تھی جس کی اُس زمانے میں بڑی دھوم تھی۔اُسکی آواز کا جادو پورے برصغیر پر سرچڑھ کے بول رہا تھا۔لتا بھی نور جہاں کی زبردست پرستار تھی۔ایک دن جب اُسے ماسٹر ونائیک سے پتا چلا کہ لتا ایک گلوکارہ بھی ہے تو اُس نے لتا سے گانا گانے کیلئے کہا۔لتا نے اُسی کا ایک مشہور گانا گنگنایا۔''بلبلو مت رو یہاں ، آنسو بہانا ہے منع۔''جب نور جہاں نے لتا کی آواز سنی تو وہ اس آواز سے اسقدر متاثر ہوئی کہ اُس نے بے ساختہ لتا کو گلے سے لگایا اور ماسٹر ونائیک سے دعوی کے ساتھ کہا۔''آج سے میری ایک بات گرہ میں باندھ کے رکھنا یہ آواز ایک دن پوری دنیا میں دھوم مچائے گی۔یہ آواز بالکل الگ اور منفرد ہے۔''

اس سے پہلے کہ لتا کی قسمت کا ستارہ چمک اُٹھتا اُس کے برے دن پھر سے لوٹ کر آ گئے۔اُسکے مربی اور محسن ماسٹر ونائیک کا اچانک انتقال ہو گیا۔وہ پھر عرش سے فرش پر آ گئی تھی۔ماسٹر وٹھل نے اُنہیں جس گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا ہوا تھا،اُسکی موت کے ساتھ ہی اُنہیں وہاں سے دھکے مار کر باہر کر دیا گیا۔لتا پھر سے فٹ پاتھ پر آ کے کھڑی ہو گئی تھی۔اُس وقت لتا کے بینک کھاتے میں صرف چودہ روپے کی رقم بچی تھی۔کچھ کم ظرف لوگوں نے لتا اور ماسٹر ونائیک کے رشتے پر چھینٹا کشی بھی کی تھی جب کہ اُنکا رشتہ باپ اور بیٹی کا تھا۔ماسٹر ونائیک خود ایک بیٹی کا باپ تھا جو بعد میں ہندی فلموں کی نامی گرامی ہیروئین بن کر اُبھری۔اس اداکارہ کا نام نندہ تھا جو شروع میں کریکٹر رول کرتی تھی۔بعد میں فلم ''جب جب پھول کھلے'' نے اُسے کامیاب ہیروئینوں کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا۔لتا کو ان مضحکہ خیز باتوں سے ٹھیس تو ضرور پہونچی تاہم اُسنے اسطرح کے گندے الزامات کا کوئی جواب نہ دیا۔اُسنے پونا یا کولہاپور لوٹنے کی بجائے بمبئی میں ہی رکنے کا فیصلہ کیا۔دریں اثنا اُس نے بمبئی کی ایک چال میں ایک چھوٹا سا کمرہ کرایے پر لیا۔اس کمرے کے بغل میں ایک مندر تھا۔یہاں کا پرسکون اور بھکتی بھاؤ سے بھرا ماحول لتا کو بڑا بھا گیا۔اُسنے کچھ دنوں بعد اپنے پریوار کو بھی بمبئی بلا لیا۔وہ تانپورہ لے کر صبح صبح سنگیت کا ریاض کرنے بیٹھ جاتی تھی۔اُسے اپنے آپ پر اور اپنی کلا پر اب بھی پورا پورا بھروسہ تھا۔یہ اُس کی خود اعتمادی ہی تھی کہ اتنی ذلت کا سامنا کرنے کے باوجود وہ گانے کی مشق سے ناغہ نہیں کر رہی تھی۔کوئی ایسا جذبہ اُسکے دل کے کسی کونے کھدرے میں پنہاں تھا جو اُسے بار بار یہ ہمت دلا رہا تھا کہ ''گائے چلا جا، گائے چلا جا۔ایک دن تیرا بھی زمانہ آئے گا۔''

لتا اُن لوگوں سے ملنے لگی جو ماسٹر ونائیک کے قریبی تھے۔اُن میں ایک نام تھا پرڈیوسر ڈائرکٹر وسنت جوگلیکر۔وسنت جوگلیکر ہندی فلموں کا ایک جانا پہچانا پرڈیوسر ڈائرکٹر تھا۔اُسنے لتا کی آواز میں ایک گانا اپنی فلم ''آپ کی سیوا میں'' کے لئے ریکارڈ کیا جسکے لئے اُسے چار سو روپے کا معاوضہ ملا جو اُس زمانے میں ایک بہت ہی کثیر رقم مانی جاتی تھی۔لتا کو گانے کے پیسے تو مل گئے مگر اُس کے گانے کو کوئی پزیرائی نہیں ملی۔ایک بار پھر سنگیت کے مہارتھیوں نے لتا کی آواز پہ یہ کہہ کر قدغن لگا دیا کہ اُس کی آواز فلموں کے لئے موزوں نہیں ہے۔ایک تو اس کی آواز پتلی ہے اور ایک اُسکا سرا اونچا ہے۔اُنہوں نے اُسے مشورے دینے بھی شروع کیئے کہ یا تو اسے کورس میں گانا چاہیے یا کامیڈی فلموں میں قسمت آزمائی کرنی چاہیے۔لتا بھی اپنے باپ کی طرح سخت جان تھی۔اُسکو کورس میں گانا گانا کسی بھی قیمت پر منظور نہ تھا۔دراصل اُن دنوں جتنی بھی خاتون گلوکارئیں تھیں وہ سب کی سب ناک سے گایا کرتی تھیں۔وہ چاہے شمشاد بیگم ہو یا امیر بائی کرناٹکی۔اُوما دیوی ہو یا راجکماری۔لتا کی آواز صبح کی شبنمی پھوار کی طرح تھی۔اُسکی آواز میں جیسے شہد کی مٹھاس گھلی ہوئی تھی۔پھولوں کی طرح نازک اور امرت کی حلاوت میں ڈوبی یہ آواز اُس دور کی آوازوں سے میل نہیں کھا رہی تھی۔ایکطرف نور جہاں نے فلمی موسیقی کو ایک نئی جہت اور معنی عطا کئے تھے اور دوسری طرف ایک ایسی آواز جو ناشناسی کی بھول بھلیوں میں کہیں کھو کر رہ گئی تھی۔لتا ان ساری مشکلوں اور مخالفتوں سے اکیلے نبرد آزما تھی۔وہ بھی ایسی بالی عمر میں۔بہرحال والد کی موت نے اُسے بالیدگی بخشی تھی۔قدرت کا دستور تو یہی ہے کہ وہ اگر بندے سے کچھ چھین کے لے لیتا ہے تو بدلے میں کچھ ایسا ہنر دے جاتا ہے،جس سے اُسکے وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔

ایک طرف جہاں لتا کی آواز کی مخالفت کرنے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی وہیں خوش کن بات یہ تھی کہ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جنہیں لتا کی آواز میں کوئی الگ ہی بات نظر آ رہی تھی۔لتا کے کٹر حمایتیوں میں ایک ماسٹر غلام حیدر تھے۔ماسٹر جی لتا کو میم صاحب کہہ کر بلایا کرتے تھے۔اُن کو پرڈیوسر ششا

دھرمکر جی نے اپنی اگلی فلم ’’شہید‘‘ کے موسیقار کے طور پر سائن کیا تھا۔غلام حیدر نے لتا کو سنا تھا اور وہ اُسکی آواز سے بیحد متاثر ہوا تھا۔وہ جوہر شناس تھے۔اُسے لتا میں مستقبل کی ایک بہت بڑی گلوکارہ نظر آرہی تھی۔ وہ لتا کو ’’شہید‘‘ میں گنوانا چاہتے تھے سو وہ لتا کو مکر جی کے پاس لے کر گئے۔تیرہ سال کی دبلی پتلی لتا کو جب مکر جی کے سامنے پیش کیا گیا تو اس چھوٹی سی لڑکی کو حقارت سے دیکھ کر اُس نے غلام حیدر سے کہا کہ یہ چھوٹی سی لڑکی کیا گائے گی۔غلام حیدر نے ایس مکر جی سے گزارش کی کہ وہ ایک بار اس لڑکی کو سنے۔مکر جی نے جب لتا کی آواز سنی تو اُس نے ایسی پتلی آواز کو اپنی ہیروئین کامنی کوشل کے لئے غیر موزوں قرار دے کر اس آواز کو خارج کر دیا۔جب ماسٹر جی ضد پکڑ کر بیٹھ گیا کہ اُسے لتا سے ہی گنوانا ہے تو ششید ھر مکر جی اتنا برہم ہوا کہ اُس نے غلام حیدر کو ہی اپنی فلم سے باہر کر دینے کی دھمکی دی۔غلام حیدر تو چلا گیا مگر جاتے جاتے وہ مکر جی کو یہ کہہ کے گیا کہ وہ اُسی دن اس دفتر میں دوبارہ قدم رکھے گا جب ہر طرف لتا کے نام کا ڈنکا بج رہا ہوگا اور پرڈیوسر اُس سے گوانے کے لئے اُسکے قدموں پر گر جائیں گے۔غلام حیدر نے لتا سے وعدہ کیا کہ وہ اُسے جب تک چانس نہیں دلوائے گا تب تک وہ چین سے بیٹھے گا نہیں۔اسی بیچ ماسٹر غلام حیدر کو ایک اور فلم میں کام کرنے کا موقع مل گیا۔اس فلم کا نام ’’مجبور‘‘ تھا۔وہ اپنا وعدہ بھولے نہیں تھے۔اُسنے لتا کو بلوا کر اُس سے فلم ’’مجبور‘‘ کے لئے ایک گانا گوایا جس کے بول تھے۔’’دل میرا توڑا‘‘۔لتا اُن دنوں کو یاد کرتے ہوئے کہتی ہے کہ ماسٹر غلام حیدر اور وہ لوکل ٹرین میں سفر کر رہے تھے جب ماسٹر جی نے ٹرین کے اندر لگی ٹین کی شیٹ کو طبلہ سمجھ کر لتا کو ٹرین میں ہی ریہرسل کروا دیا۔یہ تھا اُن لوگوں کے کام کرنے کی لگن اور جنون جو آج کی پود میں عنقا ہے۔

کھیم چند پرکاش کو بھی کسی کی معرفت لتا کی آواز سننے کا موقع ملا تھا۔1949 میں اداکار اشوک کمار نے فلم ’’محل‘‘ پرڈیوس کرنے کا فیصلہ کیا جس کے لئے کھیم چند پرکاش کو بطور موسیقار سائن کیا گیا۔وہ لتا سے گوانا چاہتے تھے اسلئے اُس نے اشوک کمار سے لتا کو ملوا دیا۔بڑی مشکل سے وہ اُسے لتا سے گوانے کے لئے راضی کر پائے۔اُس نے لتا کی آواز میں ایک گانا ریکارڈ کرنے کی اجازت دی۔یہ گانا تھا ’’آئے گا آنے والا‘‘۔اشوک کمار سے ہم ایک بار دلیپ صاحب کے گھر پر انٹرویو کر رہے تھے تو اُنہوں نے بتایا کہ کھیم چند پرکاش کے اصرار پر میں نے اُسے ایک گانا ریکارڑ کرنے کی اجازت دی لیکن جب میں نے یہ گانا سنا تو میں اتنا متاثر ہوا کہ میں نے کھیم چند پرکاش سے کہا کہ وہ اس آواز میں دوسرا گانا بھی ریکارڑ کر سکتا ہے۔’’مشکل ہے بہت مشکل ، چاہت کو بھلا دینا۔‘‘ دوسرا گانا تھا جو اسی فلم کے لئے صدا بند ہوا۔دادا منی نے کہا کہ لتا اُن دنوں چاکلیٹ کی بڑی شوقین تھی۔جب اُنہوں نے اُسے چاکلیٹ پیش کیا تو وہ بہت خوش ہوئی۔ اُسوقت لتا کی عمر صرف اُنیس سال کی تھی۔یہ گانے جب ریلیز ہوئے تو ان گانوں نے ایسی دھوم مچائی کہ لتا راتوں رات شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگی۔

اسی بیچ ششا دھر مکر جی نے فلم ’’انارکلی‘‘ کے لئے موسیقار سی۔ رامچند ر کو سائن کیا۔وہ بھی لتا سے گوانے کی ضد پکڑ کر بیٹھ گیا۔مکر جی اپنے فیصلے پر اب بھی کاربند تھے۔سی۔رامچند ر اپنی ضد چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھا اور ششا دھر مکر جی جھکنے کے لئے راضی نہ تھا۔زچ ہو کے سی۔رامچند ر نے فلم ’’انارکلی‘‘ سے الگ ہونے کا فیصلہ کیا۔ششا دھر مکر جی نے کئی موسیقاروں سے فلم ’’انارکلی‘‘ کی موسیقی دینے کی پیش کش کی مگر کوئی راضی ہی نہیں ہو پایا۔دراصل ایسی تاریخی فلم کے لئے موسیقی ترتیب دینا کوئی بچوں کا کھیل نہیں تھا۔ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد مجبوراً ششا دھر مکر جی کو سی۔رامچند ر کے آگے گھٹنے ٹیکنے پڑے۔سی۔رام چندر نے لتا کی آواز میں پہلا جو گانا ریکارڑ کیا وہ تھا ’’محبت میں ایسے قدم ڈگمگائے، زمانہ یہ سمجھا کہ ہم پی کے آئے۔‘‘اس گانے میں بیچ بیچ میں ہچکیوں کی آواز ڈالی گئی۔جب یہ گانا منظر عام پر آیا تو ششا دھر مکر جی نے اس گانے سے برہم ہو کر سی رامچند ر پر 7500 روپے کا ہرجانہ ٹھونک دیا۔اسی بیچ ’’انارکلی‘‘ ریلیز ہوئی۔جس گانے پر ششا دھر مکر جی نے اتنا واویلا کھڑا کیا تھا وہی گانا اتنا مقبول ہوا کہ لوگ اس گانے کو دیکھنے اور سننے کے لئے بار بار تھیٹر میں جانے لگے۔

اُس زمانے میں سیٹھ چندو لال شاہ کی فلم جگت میں طوطی بولتی تھی۔ ایک بار موسیقار نوشاد نے سیٹھ چندو لال کو لتا کے گانے کا ٹیپ سننے کے لئے بھیجا۔سیٹھ نے جب لتا کا فلم ’’انارکلی‘‘ کا گانا سنا تو وہ یہ آواز سن کر اسقدر بر افروختہ ہوا اُٹھا کہ اُسنے نوشاد سے کہا کہ یہ تو سڑک پر بیٹھنے والی گھٹیا سی طوائف کی آواز لگتی ہے۔موسیقار کھیم چند پرکاش جو اُسوقت سیٹھ کے کمرے میں موجود تھا اس طرح کے الفاظ سن کر چپ رہ نہ سکا۔اُس نے سیٹھ سے برملا کہہ دیا۔’’سیٹھ جی ! آج آپ جس آواز کی اس طرح بے حرمتی کر رہے ہیں آنے والے وقت میں یہ آواز ساری دنیا میں چھا جائے گی اور یہ لڑکی سب سے بڑی اسٹار ہوگی۔‘‘سیٹھ چندو لال پہلے سے ہی برہم تھا۔کھیم چند پرکاش کی اس دلیل سے وہ اپنا آپا ہی کھو بیٹھا اور اُس نے کھیم چند پرکاش سے کہا کہ اُسے اگلی فلم سے الگ کیا جاتا ہے۔وہ کل سے اُسکے آفس میں نہ آیا کرے لتا اس طرح کی ذلت چپ چاپ سہتی چلی گئی۔ایسا ہی ایک موسیقار تھا ،شیام سندر۔ اُسے تھوڑی بہت کامیابی کیا ملی تھی وہ تو کسی کو کچھ سمجھتا ہی نہیں تھا۔وہ شراب کا ایسا عادی ہو چکا تھا کہ دن میں بھی پی لیتا تھا۔ایک دن جب وہ فلم ’’لاہور‘‘ کی ریکارڈنگ کر رہے تھے تو شیام سندر اُسے طرح طرح کے نام لے کر بلانے لگا۔لتا کو شیام سندر کے اس رویے سے بڑا دکھ ہوا۔وہ اُسی وقت ریکارڈنگ چھوڑ کر اپنے گھر چلی گئی۔جب فلم کے پروڈیوسر کو یہ بات معلوم پڑی تو وہ سیدھے لتا کے پاس گیا اور اُسے منا کر ریکارڈنگ روم میں لے آیا۔لتا اس شرط پر گانا گانے کے لئے تیار ہوئی کہ شیام سندر اُس کے ساتھ دوبارہ بدتمیزی سے پیش نہیں آئے گا۔ایک دن تو شیام سندر شریف بن کے رہا۔جب دوسرا گانا ریکارڑ ہونے والا تھا تو اُس نے

لتا کی شان میں ایسے گستاخانہ الفاظ استعمال کئے کہ لتا نے اُس دن کھڑے کھڑے ریکارڈنگ روم میں یہ قسم کھائی کہ وہ اس موسیقار کے ساتھ دوبارہ کام نہیں کرے گی۔

ایک طرف لتا کا ستارہ عروج کی طرف بڑھ رہا تھا اور دوسری طرف شیام سندر کا ستارہ گردش میں تھا۔لتا کی کامیابی دیکھ کر شیام سندر نے لتا سے معافی تو مانگ لی تھی مگر لتا کے معاف کرنے سے پہلے وہ انڈسٹری سے خود ہی صاف ہوا تھا۔اُسکی مےنوشی اُسے لے ڈوبی تھی۔اسی طرح اُس زمانے کا مشہور گلوکار درانی کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔وہ شراب اور شباب کا رسیا تھا۔وہ عورت کو جنسی تسکین کا سامان سمجھتا تھا۔وہ اُسکے ساتھ ایک رومانٹک گانا گا رہی تھی جب درانی نے عامیانہ پن دکھا کر اُسکے ساتھ ایسی چھچھوری حرکتیں کیں جو قابلِ مذمت تھیں۔لتا کو درانی کی ان حرکتوں سے گہری چوٹ پہونچی۔وہ ایک اچھا فن کار تھا۔ایک اچھے فن کار کو اس طرح کی حرکتوں کا ارتکاب کرنا قطعی زیب نہیں دیتا تھا پر عادت کا کیا کیجئے۔خدا کا کرنا کہ شیام سندر کی طرح درانی بھی فلمی اُفق سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے غائب ہو گیا۔

لتا تیزی سے کامیابی کی سیڑھیاں چڑھتی جا رہی تھی۔پر اس نے کبھی بھی اپنے اُن مہربانوں کو فراموش نہیں کیا جن کی وجہ سے وہ اس مقام تک پہونچی تھی۔جب لتا کو معلوم پڑا کہ اُسکا محسن غلام حیدر پاکستان میں بہت ہی شدید بیماری سے دوچار ہے اور اُسکے پاس اتنے پیسے بھی نہیں ہیں کہ وہ ڈھنگ سے اپنا علاج کروا سکے تو لتا کا دل بھر آیا۔اُسنے سفارت خانے کی معرفت اُس تک مالی مدد پہنچائی۔وہ تو ماسٹر جی کو ہندوستان لے کر آنا چاہتی تھی تا کہ اُسکا ٹھیک ڈھنگ سے علاج ہو سکے مگر ماسٹر جی اُس حالت میں نہ تھے۔اسی طرح وہ نوشاد صاحب کے احسان کو کبھی نہیں بھولی۔اُسی کے طفیل اُسے محبوب خان کی فلم ''انداز'' میں گانا گانے کا موقع مل گیا تھا۔اس فلم میں اُسوقت کے ٹاپ کے اسٹار دلیپ کمار، راج کپور اور نرگس کام کر رہے تھے۔وہ کہتی ہے کہ جب نوشاد صاحب اُسے محبوب صاحب سے ملانے لے گئے تو محبوب صاحب نے نوشاد سے کہا ''نوشاد صاحب اس فلم کی ہر چیز بڑی ہے۔کیا آپ کو نہیں لگتا کہ اُسکے مقابلے میں لتا کا نام بہت چھوٹا ہے؟'' نوشاد صاحب نے بیزار ہو کے کہا ''آپ کو ایسا لگتا ہو گا لیکن مجھے ایسا نہیں لگتا''

ایک دن موسیقار انل بسواس اور دلیپ کمار لوکل ٹرین میں سفر کر رہے تھے۔اسی ٹرین میں لتا بھی سفر کر رہی تھی۔انل بسواس نے لتا کا تعارف دلیپ کمار سے کراتے ہوئے کہا۔''یوسف بھائی یہ لتا منگیشکر ہے۔بہت اچھا گاتی ہے۔'' دلیپ صاحب نام سن کر فوراً سمجھ گئے کہ یہ لڑکی مراٹھی ہے۔اُنہوں نے بڑے فلسفیانہ انداز میں کہا۔''انل دا! یہ مراٹھی لڑکی کتنی بھی اچھی باتیں کرے لیکن انکے منہ سے دال بھات کی بو نہیں جاتی۔'' یہ بات لتا کے دل میں تیر کی طرح چبھ گئی۔اصل میں دلیپ صاحب اُسے جتلانا چاہتے تھے کہ ہندی فلموں کے لئے گانے کے لئے تلفظ کو جاننا بہت ضروری ہے۔لتا بھی بہت تیز تھی۔دلیپ صاحب کے طنز کو تڑ پڑ سمجھ گئی۔اُسنے اُسی وقت عہد کر لیا کہ وہ اُردو سیکھ کر ہی رہے گی۔وہ موسیقار غلام محمد کے اسسٹنٹ محمد شفیع کو اپنا بھائی مانتی تھی۔اُس نے شفیع سے کہا کہ وہ اُس کے لئے کسی اُردو ٹیچر کو ڈھونڈ کر لے آئے۔شفیع نے ایک دو دن میں اُردو ٹیچر کا انتظام کرا لیا جو اُسے باضابطہ اُردو پڑھانے لگا۔بعد میں اُردو زبان پر دسترس ہونے کے سبب وہ بہت آگے نکل گئی جس کا خود دلیپ کمار نے بھی اعتراف کیا۔اسکے لئے وہ ہمیشہ دلیپ کمار کی احسان مند رہی کہ اُسنے اُسے ترغیب و تحریک دی اُردو سیکھنے کی۔

فلم ''انداز'' کے بعد کامیابی لتا کے قدم چومنے لگی۔اُسکے گائے ہوئے گیتوں نے دھوم مچا دی مگر ستم ظریفی یہ رہی کہ اُن دنوں خواتین گلوکاروں کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ستم بالائے ستم یہ کہ گلوکارہ کا نام ریکارڈ پر دیا نہیں جاتا تھا بلکہ اُس کی جگہہ فلم کی ہیروئین کا نام شائع ہوتا تھا۔لتا کے ظہور کے بعد وقت نے ایسی کروٹ بدلی کہ جس آواز کا کچھ لوگ مذاق اُڑایا کرتے تھے وہی آواز فلم کی کامیابی کی ضمانت بن گئی۔لتا نے دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ پایا جس کی کوئی کلپنا بھی نہیں کر سکتا مگر وہ ہمیشہ اکیلی اور تنہا رہی۔نہ کوئی ہمدم نہ کوئی دمساز۔ابتدائی دور میں سی۔رام چندر کو لے کر لتا کے رومانس کی کچھ افواہیں اُڑنے لگیں۔اس بات سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ لتا کے کیریئر کو سجانے سنوارنے میں سی۔رام چندر نے جس طرح کا کلیدی رول ادا کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔اُسنے لتا سے ہر طرح کے گانے گوائے وہ چاہے ''البیلا'' کے گانے ہوں یا ''بارش'' کے۔''آزاد'' کے گانے ہو یا ''نوشیروان عادل'' کے۔ان گانوں کی بدولت ہی لتا کامیابی کی معراج تک پہونچ گئی۔

لتا نے اپنی زندگی اپنے بھائی بہنوں کے لئے وقف کی۔لتا کو چھوڑ کے باقی سبھی لوگوں نے اپنے گھر بسائے۔بچے پیدا کئے۔آشا نے تو ایک نہیں دو دو شادیاں کیں۔پہلے بھونسلے سے۔دوسری شادی آر۔ڈی۔برمن سے جب کہ لتا اکیلی تھی اکیلی ہے اور اب آخری وقت تک اکیلی ہی رہے گی۔یہ سچ ہے کہ کئی بار اُسکے دل میں بھی پیار کی ترنگیں اُٹھیں۔جہاں تک میں جانتا ہوں کہ کرکٹ کی دنیا سے تعلق رکھنے والے راج سنگھ ڈونگرپور سے اُسکی قربت رہی۔وہ جب بھی کسی شو کے سلسلے میں کسی بیرونی ملک میں جاتی تھی تو راج سنگھ کو اُس کے ساتھ دیکھا گیا۔مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب ہم فلم ''کالنگا'' کی مہورت کی تیاریاں کر رہے تھے تو دلیپ صاحب راج سنگھ ڈونگرپور کو بھی مدعو کرنا چاہتے تھے۔اُنہوں نے مجھ سے لتا منگیشکر کا فون ملانے کو کہا۔رسمی علیک سلیک کے بعد دلیپ صاحب نے لتا سے راج سنگھ کے بارے میں پوچھا۔مجھے اس بات کی تصدیق اُسی دن ہو گئی کہ لتا اور راج سنگھ ڈونگرپور کے بیچ رشتہ بڑا گہرا ہے۔عام طور پر لتا کے بارے میں یہی رائے ہے کہ وہ دیوداسی ہے۔دیوداسی وہ عورت کہلائی جاتی ہے جو ساری زندگی کنواری رہنے کا عہد لیتی ہے۔کہتے ہیں کہ لتا

نے دیوداسی بن کر رہنے کی قسم اسلئے کھائی تھی کہ وہ اپنی زندگی اپنے بھائی بہنوں کے لئے وقف کرنا چاہتی تھی۔

نور جہاں اور لتا کو لے کر بھی کیا کیا افواہیں اُڑائی نہ گئیں۔ سچ تو یہ ہے کہ لتا منگیشکر ہمیشہ نور جہاں کی مداح و پرستار رہی۔ نہ صرف پرستار بلکہ وہ اپنے آپ کو اُس ہستی کی زیر بار سمجھتی رہی۔ یہ نور جہاں ہی تھی جس نے ماسٹر ونائیک کے سامنے یہ پیش گوئی کی تھی کہ لتا ایک دن دنیا کی بہت بڑی گلوکارہ بن جائے گی۔ اُسکی پیش گوئی حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی۔ لتا نے اپنی آواز سے پوری دنیا میں دھوم مچا دی۔ اتنی بے پناہ کامیابی ملنے کے باوجود اُسکے قدم ہمیشہ زمین پر رہے میڈیم نور جہاں کے ساتھ اُسکا رشتہ ہمیشہ دوستانہ اور مخلصانہ رہا ہے۔ وہ نور جہاں سے آخری دم تک برابر رابطے میں رہی۔ وہ جب بھی ہندوستان آئیں، لتا نے اُسے سر آنکھوں پر بٹھا لیا۔ اسی طرح وہ ماسٹر غلام حیدر کے پاکستان میں مقیم ہونے کے بعد بھی اُسے کبھی نہیں بھولی۔ آخری دم تک اُس کے ساتھ رابطہ بنا کے رہی۔

میری لتا منگیشکر سے کئی بار ملاقاتیں رہیں۔ 2007 کے جون مہینے میں اُسکے گھر پر جو میری ملاقات ہوئی وہ ایک یادگار ملاقات تھی۔ اس سے قبل لتا منگیشکر کے ساتھ دلیپ صاحب کے گھر پر میری کئی ملاقاتیں ہوئیں ہیں مگر وہ ملاقاتیں محض رسمی تھیں۔ اُن کے گھر پر ہونے والی ملاقات میرے لئے اس لئے اہم تھی کہ ایک دن پہلے میں نے اُنکا ایک گانا سنا تھا جسے سن کے میں سچ مچ رویا تھا۔ یہی بات میں نے اُنکے بھتیجے کو سنائی۔ اُس نے گانے کے بارے میں پوچھا تو میں نے گانے کے بول اور موسیقار کا نام بتا دیا۔ گانے کے بول تھے۔ ’’کالی کالی رات۔ بڑی تڑپائے‘‘۔ اس گانے کو سجاد نے دھن سے آراستہ کیا تھا۔ موسیقار سجاد بڑا گنی آدمی تھا۔ اُسکے ساتھ بدقسمتی یہ رہی کہ اُسے وہ مقام نہ ملا جسکا وہ حقدار تھا۔ اس بات کا اعتراف لتا منگیشکر اور اُسکے بھتیجے نے بھی کیا۔ اُس دن لتا منگیشکر ہمارے ساتھ دو گھنٹے تک بیٹھی رہی۔ ساتھ ہی وہ ہماری خاطر مدارت بھی کرتی رہی۔ وہ سچ مچ سروں کی ملکہ ہے۔ لتا نے اب تک تیس ہزار سے زائد گانے گائے ہیں۔ اُس نے صرف ہندی پر اکتفا نہ کیا بلکہ چودہ کے قریب علاقائی زبانوں کے گانوں کو اُس نے اپنی آواز بخشی۔ لتا منگیشکر نے نرگس سے لے کے کاجول تک کو اپنی پلے بیک آواز سے نوازا۔ وہ 1948 سے لے کے 2004 تک فعال رہی۔ سنگیت کے بگڑتے معیار کو دیکھ کے اُس نے پچھلے دو تین سالوں سے گلوکاری سے ایک طرح کا سنیاس لیا ہے۔

لتا منگیشکر نے ہندوستان کے ہر چھوٹے بڑے سنگیت کار کے ساتھ کام کیا۔ انل بسواس، ماسٹر غلام حیدر، سجاد، غلام محمد، نوشاد، سی۔ رام چندر، شیام سندر، ایس۔ ڈی۔ برمن، روشن، چترگپت، کھیم چند پرکاش، حسن لال بھگت رام، وسنت ڈیسائی، این، دتہ، سلیل چودھری، مدن موہن، شنکر جے کشن، روی، رام لال، لکشمی کانت پیارے لال، یہاں تک کہ نئی پود کے موسیقار آنند ملند، جتن للت، اے۔ آر۔ رحمان، وغیرہ کے ساتھ بھی اُس نے گانے گائے۔ لتا کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جتنی بھی پرانی ہیروئینیں تھیں جیسے نرگس، مینا کماری، نوتن، مدھوبالا، ٹلی جیونت یا نمی۔ وہ فلم کا کنٹریکٹ سائن کرنے سے پہلے یہ شرط لگا دیتی تھیں کہ اُنکے گانے صرف لتا منگیشکر گائے گی۔ کئی ہیروئنوں کی کامیابی میں لتا کی آواز کا بھی کافی عمل دخل رہا ہے۔ لتا کو اب تک ڈھیر سارے اعزازات سے نوازا گیا ہے۔ اُسکی آواز کے جادو سے اب تک کوئی نہ بچ سکا۔ اُسنے روتے ہوئے کو ہنسایا ہے اور ہنستے ہوئے کو رلایا ہے۔ یہ لتا کی آواز کا ہی اثر ہے کہ آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو لتا کا گانا سن کر اپنے آنسو روک نہ سکا۔ لتا کو ہمہ گیر شہرت ملی ہے۔ اس آواز کے چاہنے والے جتنے ہندوستان میں ہیں اُس سے کہیں زیادہ بنگلہ دیش اور پاکستان میں ہیں۔ لتا نے ہمیشہ معاف کرو اور بھول جاؤ کی پالیسی اختیار کی۔ اُس نے اُن کو بھی معاف کیا جنھوں نے برے دنوں میں اُسکے ساتھ برا سلوک کیا تھا۔ ماسٹر غلام حیدر نے جو پیشن گوئی کی تھی وہ سچ ثابت ہوئی تھی۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب لتا کے دروازے پر پرڈیوسروں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ ششادھر مکرجی جس نے ماسٹر غلام حیدر کو اپنی فلم سے اسلئے چلتا کر دیا تھا کہ اُسنے لتا سے گوانے کی ضد کی تھی ایک دن ایسا بھی آیا جب اُسی ایس۔ مکرجی کو لتا کے پاس جا کر اُس سے معافی مانگنی پڑی۔

لتا نے ہر طرح کے گیت گائے۔ بھجن، نعت، قوالی، ڈسکو، کلاسیکل۔ وہ ہمہ جہت فن کار ہے۔ ایک کٹر مہاراشٹرن برہمن قبیلے سے تعلق رکھنے والی لتا نے جب فلم ’’مغل اعظم‘‘ کا یہ گانا گایا۔ ’’بے کس پہ کرم کیجئے، سرکار مدینہ‘‘ تو ہر دردمند انسان کی آنکھیں نم ہوئیں۔ اسی طرح جب اُس نے فلم ہم دونوں کا یہ بھجن ’’اللہ تیرو نام، ایشور تیرو نام، سب کو سمتی دے بھگوان‘‘ تو خدا کے ماننے والے ہر فرد کا سر عقیدت سے جھک گیا۔ راکھی کا تیوہار جب بھی آیا تو لتا کو ہر بھائی اور ہر بہن نے یاد کیا۔ فلم ’’بھابی‘‘ کا یہ گانا ’’بھیا میری چھوٹی بہن کو نہ بھلانا‘‘ ہر راکھی کے تیوہار پر بجتا ہے اور ہر بھائی کا دل اپنی بہن کے لئے تڑپ اُٹھتا ہے۔ لتا نے جب اپنی من موہنی آواز میں فلم ’’البیلا‘‘ کی یہ لوری گائی۔ ’’دھیرے سے آجا اکھین میں۔‘‘ تو ہر ماں کا لال یہ لوری سن کر سپنوں کی آغوش میں چلا گیا۔ لتا نے مشکل سے مشکل ترین گانے گائے ہیں۔ وہ چاہے مرحوم بسملا خان کی شہنائی ہو یا برجو مہاراج کی بانسری کی میٹھی تان۔ ایسے سازوں سے ہم آہنگ ہونے میں لتا کا کوئی ثانی نہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ابتدائی دور میں لتا نور جہاں کی طرح گاتی رہی۔

ایک دن انل بسواس نے اُسے اپنے سامنے بٹھایا اور اُسے ڈانٹتے ہوئے بولا۔ ’’تم نور جہاں ٹو کیوں بننا چاہتی ہو۔ مالک نے تمہیں ایک خوبصورت آواز سے نوازا ہے۔ تم اپنے انداز میں گاؤ نا۔‘‘ انل بسواس کی ڈانٹ کام کر گئی۔ اُسکے بعد اُسنے اپنے اسٹائل سے گانا شروع کیا۔ اُسے اپنے اسٹائل میں لوگوں نے خوب پسند کیا۔ لتا ہمیشہ تنازعوں سے دور رہی ہے تاہم جہاں اُسنے جانبداری یا

زیادتی ہوتے دیکھی وہاں وہ چپ نہ رہی۔ جب اُسے فلم ’’چوری چوری‘‘ میں گائے ہوئے گانے ’’رسک بلما‘‘ پر فلم فیئر ایوارڈ ملا تو اُس نے ایوارڈ لینے سے انکار کر دیا۔ وجہ فلم فیئر اعزازت میں پلے بیک سنگر کی کیٹگری کا نہ ہونا تھا۔ اگلے سال سے فلم فیئر نے اپنے اعزازات کی کیٹ گری میں پلے بیک سنگر کا اضافہ کر دیا۔ وہ صدا سادگی کا پیکر بنی رہی۔ اُسنے دکھاوے سے ہمیشہ احتراز کیا۔ جھیل کی طرح شانت رہنے والی لتا جب بھی بپھری ہے تو اُس نے کھولتے ہوئے سمندر کا روپ دھارن کیا ہے۔ جب وہ رائلٹی کے معاملے میں راج کپور سے اُلجھ پڑی تو وہ تب تک میدان میں ڈٹی رہی جب تک اُس نے راج کپور کو اپنی شرطوں پر منوا نہیں لیا۔ وہ باغیانہ طبع کی عورت ہے۔ اپنے حق کے لئے لڑنے میں اُسنے کبھی عار نہ کیا۔ ضدی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ سراپا پیکر محبت ہے۔ کچھ لوگ اُسکے بیحد قریب رہے جیسے دلیپ کمار ، مدن موہن ، مکیش ، یش چوپڑہ اور گیت کار پردیپ۔ پردیپ کو چھوڑ کے وہ باقی سب کو بھائی سمجھتی رہی۔ پردیپ کو وہ اپنے والد کا درجہ دیتی ہے۔ ایکطرف باکمال سنگیت کار جیسے ماسٹر غلام حیدر، کھیم چند پرکاش، نوشاد، سی۔ رام، چندر، انل بسواس، ایس۔ ڈی۔ برمن، شنکر جے کشن، سلیل چودھری، سجاد، غلام محمد اور مدن موہن اس دنیا سے رخصت ہوئے، دوسری طرف اُسکے ساتھی کلا کار ایک ایک کر کے ساتھ چھوڑتے چلے گئے۔ جیسے محمد رفیع، طلت محمود، مکیش اور کشور کمار۔ اُس نے سب سے زیادہ دوگانے محمد رفیع کے ساتھ گائے تھے۔ وہ شروع سے ہی فلاحی کاموں کے ساتھ جڑی رہی۔

لتا کو ہیرے موتی بیحد پسند ہیں۔ وہ سونے چاندی کے زیورات کا قطعی استعمال نہیں کرتی۔ اُسے بس ہیرے پہننے کا شوق ہے۔ وہ اپنے بچپن کے دنوں کو یاد کر کے کہتی ہے کہ جب وہ چھوٹی تھی تو اُسکے والد کاغذ پر اچھے اچھے زیورات کی ڈیزائن بنایا کرتے تھے۔ وہ تب ان ڈیزائنوں سے ہی اپنے دل کو بہلایا کرتی تھی کیونکہ اُن دنوں اُنکی مالی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ زیور خریدنے کی کلپنا بھی کر سکے۔ جب وہ بڑی ہوئی اور خود کمانے لگی تو اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ ساری زندگی ہیرے جواہرات ہی پہنا کرے گی۔ وہ اپنے اس فیصلے پر آج تک قائم ہے۔ کھیلوں میں اُسے کرکٹ بیحد پسند ہے۔ اُسکا محبوب کرکٹر سچن تنڈولکر ہے جو اُسے آئی (ماں) کہکر مخاطب کرتا ہے۔ وہ طرح طرح کے کھانے پکانے کی شوقین ہے۔

اُسکی سبھی بہنوں نے فلمی سنگیت میں طبع آزمائی کی مگر آشا کو چھوڑ کے اُسکے خاندان میں اور کوئی آگے نہ بڑھ سکا۔ لتا نے اپنے بھائی اور بہنوں کے لئے وہ کیا جو آج کے زمانے میں شرون کمار جیسا سپوت بھی نہیں کر پائے گا۔ لتا کی آواز اس کائنات کو خدائے برتر کی طرف سے بخشا ہوا ایک نایاب تحفہ ہے۔ پھولوں کی نکہت کی طرح خوشبو بکھیرنے والی یہ سحر طراز آواز تب تک گونجتی رہے گی جب تک یہ کائنات قائم و دائم ہے۔ اُسکے گانے اسی طرح چار دانگ گونجتے رہیں گے۔

’’اُردو زبان‘‘

صابر چھتاروی

(راولپنڈی)

اُردو زبان ہے یہ اُردو زبان
میری زبان ہے یہ تیری زبان
اُردو زبان ہے یہ اُردو زبان
ہر کوئی سمجھے اِسے ہَر کوئی بولے اِسے
ایسی آسان ہے یہ ایسی آسان
اُردو زبان ہے یہ اُردو زبان
اُردو لِکھو اور اُردو پڑھو
قومی زبان ہے یہ قومی زبان
اُردو زبان ہے یہ اُردو زبان
اِس کے رِسالے اَخبار اور کُتب
ہر گھر کی زینت، ہر گھر کی پہچان
اُردو زبان ہے یہ اُردو زبان
فِطرت میں شامل چاروں ہیں اس کے
پیار، محبت، عِشق ، رُومان
اُردو زبان ہے یہ اُردو زبان
محافظ ہیں اِس کے یہ چار بھائی
سِندھی، پنجابی، بلوچی، پٹھان
اُردو زبان ہے یہ اُردو زبان
میری زبان ہے یہ تیری زبان

○

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وقار جاوید (راولپنڈی)

محبی گلزار جاوید!

آپ سے رابطہ رکھ نہیں پایا ہوں۔ دو مہینے کا علاج دلّی میں ختم ہوا تو کل شملہ واپسی ہوئی۔ ’’چہارسُو‘‘ کا خصوصی نمبر جو آپ نے مجھ خاکسار کے نام وقف کیا اُس کے بارے میں دلّی میں اور شملہ میں مسلسل مجھے بھارت، پاکستان اور امریکہ سے بذریعہ ٹیلی فون اور خطوط بہت سے ہم عصر ادیبوں نے مبارکباد سے نوازا ہے۔ لگ بھگ چالیس ارباب ذوق کے ٹیلی فون اور خطوط موصول ہوئے ہیں۔ یہ خصوصی شمارہ آپ کے خلوص، فراخ دلی اور نیاز مندی کا عکاس ہے اور اس میں مجھ ناچیز کے حالاتِ زندگی، ساٹھ برسوں سے زائد کے طویل ادبی سفر اور اب تک کے تخلیقی سرمایہ کے جائزہ کی افادیت اور معلوماتی اعتبار سے بھرپور تسلیم کیا گیا اور بہت سے احباب نے اس کی اہمیت پر مثبت اور توضیحی تبصرے کئے ہیں۔ زندہ باد، ہمیشہ خوش اور آسودہ، تندرست وشاد کام رہیے۔

ڈاکٹر شباب للت (شملہ، بھارت)

عزیزی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

اس مرتبہ شباب للت صاحب کا گوشہ بڑا مکمل ہے۔ میں شباب صاحب سے نام اور کام سے اس سے قبل آگاہ نہ تھا۔ اس شمارے کے بعد بہتر طور پر آشنائی ہوگئی ہے۔ آپ کا افسانہ ’’ادھ کھائی بوٹیاں‘‘ اپنے اندر ناول کا مواد رکھتا ہے۔ پاکستان کے پورے معاشرے کا اس میں آپ نے احاطہ کیا ہے۔ خوب ہے لیکن کیوں نہ اس سب کو ناول کی شکل دی جائے! ہمت کر ڈالیے۔

امین راحت چغتائی صاحب کہاں ہیں؟ کیا کر رہے ہیں؟ میرا سلام پہنچا دیجیے۔ دیپک کنول کا فلمی باب بڑی دلچسپی کی چیز ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے فلمی جرنلزم سے زیادہ غلط بیانی سے کام کسی اور جرنلزم کی فورم میں دیکھنے میں نہیں آتا ہے۔ وجہ لکھنے والے کی سہل پسندی۔ کون صحیح مواد جمع کرنے کی تکلیف اٹھائے۔ فیروز عالم صاحب نے تعلیم حیدرآباد میں پائی، میں نے لاہور میں۔ پھر بھی ان کی تحریر کی خوبی یہ ہے میں محسوس کرنے لگتا ہوں ان کا کلاس فیلو رہا ہوں۔ ویسے آپ کی بھابھی ڈاکٹر طاہرہ بھی لیاقت میڈیکل کالج کی پڑھی ہیں۔ ’’ہوا کے دوش پر‘‘ بڑی خوش کن تحریر ہے۔

عبداللہ جاوید صاحب نے amyotropic lateral sclerosil کو اپنے افسانے میں بنیاد کے طور پر استعمال کیا ہے۔ یہی حال ہر اُس مرض کو بھگتنے والے کا ہوتا ہے جو آ کر جانے کا نام نہیں لیتی۔ ’’رویہ‘‘ ہمارا Attitude ہمیں جینے کا حوصلہ دیتا ہے اگر مثبت ہو۔

حسن منظر (کراچی)

رونق چہارسو، محترم گلزار جاوید، السلام علیکم۔

تازہ شمارے میں ڈاکٹر شباب للت کو پاکر ازحد خوشی ہوئی۔ نام تو بہت سنا تھا شخصی اور ادبی تفصیلات اب زیادہ روشن ہوئیں۔ چہارسو کا پیرایۂ قرطاس اعزاز بڑے کام کی چیز ہے۔ تعلق اور تعارف کے اس قبیل کے قرینے یہیں دیکھنے میں آتے ہیں۔ شباب للت ’’بیان و اظہار‘‘ میں کہیں کہیں یک طرفہ ہو رہے ہیں حالانکہ چاہنے والے چہارسو ہیں۔ چلئے یونہی سہی۔ آپ نے دیکھا ہمارے پیارے ملک پاکستان میں عام انتخابات کا مرحلہ طے پا گیا۔ اب ووٹر کا سیاسی اور تفہیمی شعور ترقی پا چکا ہے۔ ووٹر نے کئی مقتدر شخصیات کو محض اس لیے مسترد کر دیا ہے کہ ان کی کارکردگی اپنی ذات تک محدود رہی۔ پرانے صوبہ سرحد میں پختونخواہ کی ’’برائے نام آئیڈیالوجی‘‘ کو بھی معرض استرداد میں ڈال دیا گیا ہے۔ عوام نے تحریک انصاف کے حوالے سے پختونخواہ کے ’’دعوے داروں‘‘ کو بیک قلم شکست سے دوچار کر دیا ہے۔ جب اسے ’’ترمیم نمبر اٹھارہ‘‘ میں پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ نون کی اشیرباد حاصل تھی۔ الیکشن میں مسلم لیگ نون بڑی پارٹی بن کر ابھری ہے۔ میاں نواز شریف پارٹی کے سربراہ، ملک و قوم کی ترقی اور بہتری کے لیے اپنی سعی دیکھنے کو پُرعزم ہیں خدا ان کی مدد کرے۔ چہارسو کے مشمولات حسبِ معمول پسندیدہ ہیں۔ افسانے خوب ہیں ’’ادھ کھائی بوٹیاں‘‘ حالیہ تناظر میں خاصا چوٹیلا ہے۔ آپ وقار بن الٰہی کو بھی کھینچ لائے گویا کمال کر دیا۔ نوید سروش کی لکھائیوں میں موہنی ہے۔ احباب پر وہ بڑی پیاری نظر رکھتے ہیں۔

آصف ثاقب (بوئی ہزارہ)

برادرم جناب گلزار جاوید۔

آداب کے بعد عرض ہے کہ کچھ دن پہلے زندگی کے ساتھ ساتھ ہر دل عزیز چہارسو کا شمارہ برائے ماہ مئی جون کا موصول ہوا یادآوری کا بہت بہت شکریہ۔ محترم شباب للت صاحب کا ادبی گوشہ قابل غور ہی نہیں بلکہ قابل تعریف ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ شباب صاحب اس عزت افزائی کے صحیح حقدار تھے۔ آپ نے ان کے ادبی سرمائے کو چہارسو کی زینت بنا کر ادب نواز قارئین تک پہنچا کر ایک نیک کام کو سرانجام دیا ہے اس کے لیے آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ شباب للت صاحب بذات خود ایک ملنسار اور نیک انسان ہیں۔ باقی صفحوں پر سماجی حقیقتوں پر بنی بکھرے ہوئے موتی خواہ وہ افسانوں، غزلوں یا نظموں کے علاوہ ماہیوں کی صورت میں ہیں، سراہنا یوگ ہیں، پڑھ کر دلی تسکین ہوتی ہے اور دوبارہ پڑھنے کی تمنا رہتی ہے۔ یوں تو ہر تحریر اپنے آپ میں ایک اہم مقام اور سندیش لئے ہوئے ہے لیکن خاص کر نظموں میں ’’شکرانہ محبت‘‘، افسانوں میں

''شکریہ مہرباں''، ''بڑادل''اور ہمشیرہ رینو بہل کی ''رشتوں کی تقدیس'' نے متاثر کیا۔قارئین کے خطوط میگزین کی شان کو دوبالا رکھتے ہوئے تنقیدی تبصروں سے ایڈیٹر صاحب کو ایک نئی راہ دکھاتے ہیں۔ دیپک کنول کا ''ایک صدی کا قصہ'' فلمی دنیا کی در پردہ تصویر پیش کرتا ہے۔ایسے معلوماتی مضامین کی آج ہر رسالے اور اخبار کو ضرورت ہے اور قارئین بھی دلچسپی سے پڑھتے ہیں خواہ وہ کسی عمر کے بھی ہوں۔ کے۔ آصف صاحب ایک عظیم ہستی کے مالک تھے فلمی دنیا میں اُنہیں سدا ہی یاد رکھا جائے گا۔ میرے خیال میں کوئی بھی ڈائریکٹر مغلِ اعظم جیسی عمدہ فلم پیش نہ کر سکے گا۔ میری ناچیز تحریر کو چہارسو میں جگہ دے کر میرا تعارف کرانے کے ساتھ ساتھ مجھے ایک بار جنم دھرتی سے تلک کرنے کا جو ثواب آپ نے دلایا ہے بندہ اُس کے لیے تہہِ دل سے شکر گذار رہے گا۔

امرناتھ دھمیجہ (لدھیانہ، بھارت)

محترم جناب گلزار جاوید، آداب۔

آپ کا ارسال کردہ ''چہارسُو'' جلد۲۲۔ شمارہ مئی جون ۲۰۱۳ء موصول ہوا اور ہمیشہ کی طرح یوں لگا جیسے پوری دُنیا مٹھی میں آ گئی ہے۔ کیونکہ اس میں پوری دنیا کے قلم کاروں کی تخلیقات یکجا ہوتی ہیں۔ جس سے اس پرچے کی سرکولیشن کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ شمارہ ہذا میں ڈاکٹر شباب للت کا تعارف ان کو لکھے گئے خطوط اور مضامین پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں پہلے بھی ایک خط میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ تعارفی سلسلہ بہت خوب ہے اور اسے جاری رہنا چاہیے بلکہ دوسرے جرائد میں بھی اس کا اہتمام ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ پرچہ ہذا میں جو شباب للت کی نعت شامل کی گئی ہے یقیناً خوبصورت نعت ہے جس میں محبت اور زبان کا تقدس برقرار رکھا گیا ہے اور کہیں سوئے ادب کا شائبہ تک نہیں۔ تاہم نعت کا آخری مصرعہ کمپوزنگ کی نذر ہو گیا ہے۔ یہاں درج ہے ''میں بھی شباب ادنیٰ پرستارِ محمدؐ '' جبکہ شاید اصل مصرعہ یہ ہوگا ''میں بھی ہوں شباب ادنیٰ پرستارِ محمدؐ ''۔ افسانوں میں حنیف باوا کا ''نام کیا دوں'' اور شفیع ہمدم کا ''لمحات کا سایہ'' پسند آئے۔ حصّہ غزلیات میں جناب محمود الحسن کی غزل کا یہ شعر کہ

''ساقی کی چشمِ مست کو جب دیکھتے ہیں ہم
رقصاں دکھائی دیتی ہیں موجیں شراب کی''

اگرچہ روایتی پن لیے ہوئے ہے کہ مصرعہ ثانی میں اسلوب کی طاقت نے اسے چار چاند لگا دیئے ہیں۔ جناب سرور انبالوی کی غزل کے مطلع میں سوزِ دلی کی ترکیب اجنبی سی محسوس ہوتی ہے۔ المختصر پرچہ خوبصورت ہے۔ تاہم پروف ریڈنگ کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے خاص طور پر حصّہ شاعری میں کیونکہ اس میں ایک حرف کی کمی بیشی بھی شعر کو بے وزن کر دیتی ہے۔

انتظار باقی (جھنگ)

جناب گلزار جاوید، السلام علیکم۔

چند روز قبل چہارسو کا شمارہ مئی جون ۲۰۱۳ء موصول ہوا جس کے لیے شکر گزار ہوں۔ یوں تو مندرجات میں سے بیشتر کا مطالعہ تسکین کا باعث ہوا لیکن اس مرتبہ دیپک کنول کا ''ایک صدی کا قصہ'' میرے لیے دلچسپی کا باعث ہوا کیونکہ اس میں جس مایہ ناز مشہور زمانہ اور تاریخ ساز ہدایت کار کے۔ آصف کا ذکر ہے اُن کی فلم ''مغلِ اعظم'' سے وابستہ کئی یادیں میری نوجوانی کے زمانے کی ہیں جنہیں میں اپنی یادداشت سے کبھی بھی نہیں مٹا سکتا۔ اُس زمانے میں جب ۱۹۶۰ء کے اگست میں یہ فلم سارے ہندوستان میں نمائش کے لیے پیش کی جانے والی تھی اُسی سال جنوری یا فروری میں پہلی بار ''شمع'' نئی دہلی میں اس فلم کی ساکت تصویریں کئی صفحات پر پیش کی گئی تھیں میں اور میرا بھتیجا (ہم عمر) اس جریدے کے پرانے قاری تھے لیکن وقت سے پہلے ہی یہ شمارہ جب قریبی تمام بک اسٹالوں پر ختم ہو گیا تو اس شمارے کی تلاش میں گلی گلی بھٹکنے کے بعد ہم دونوں ٹاٹا نگر ریلوے اسٹیشن (جو شہر سے پانچ میل دور واقع تھا) جا پہنچے وہاں بھی اس کی ایک ہی کاپی بچ گئی تھی اور ہمیں بلیک میں ۷۵ پیسے میں دے کر خریدنی پڑی جبکہ اس زمانے میں اس کی قیمت ۵۰ پیسے تھی۔ یہ تو ہوئی اس فلم کی ریلیز سے پہلے اس کی کشش جس نے فلم کی نمائش کے لیے سب کو بے چین کیا ہوا تھا۔

پھر جب ۵/اگست ۱۹۶۰ء کو فلم ریگل سینما میں نمائش کے لیے پیش کی گئی تو کس طرح پیشگی بکنگ کے لیے ہم نے کیا کیا پاپڑ بیلے وہ الگ کہانی ہے۔ اُس وقت فلم کی صرف چار ریلیں ہی رنگین (Technicolor) پیش کی گئی تھیں جن میں (۱) ''موہے پنگھٹ پہ نندلال چھیڑ گیو رے'' (۲) پیار کیا تو ڈرنا کیا'' (۳) تیسرا گانا قوالی۔ تیری محفل میں قسمت آزما کر۔۔۔'' (۴) چوتھا گانا بھی قوالی۔ جب رات ہے ایسی متوالی پھر صبح کا عالم کیا ہوگا۔ یاد آ رہا ہے۔ ہاں انٹرول کے پہلے ''پیار کیا تو ڈرنا کیا'' جب پردے پر پیش کیا جا رہا تھا تو شیش محل کے ہر شیشے میں رقص کا عکس جس خوبصورتی سے آر۔ ڈی۔ ماتھر نے پیش کیا تھا اُس کی تعریف انٹرول کے وقت باہر نکلنے والا ہر شخص کرتے ہوئے نہیں تھکتا تھا بہر حال اُس کے بعد میں نے اور میرے ہم عمر بھتیجے نے جب تک فلم سینما ہال میں لگی رہی نہ جانے کتنی بار دیکھا یہ یاد نہیں پھر آپ کو یہ بھی بتاتا چلوں کہ دوبارہ جب رنگین فلم نمائش کے لیے پیش کی گئی اور نئی نسل نے دیکھا تو اداکاری سے لے کر فلم کے ہر شعبے کی کارکردگی پر بھارت اور پاکستان کے ہر اخبار میں خوبصورت تبصرے شائع کیے گئے اور تو اور روزنامہ ''ڈان'' میں وہاں (بھارت) کے مشہور صحافی ایم۔ جے۔ اکبر نے اپنے تبصرے کی سرخی لگائی:

It is urdu & only urdu which has given about fully Coloured version on its leak in India.

غزل کی اشاعت کا شکریہ لیکن اُس میں مسودہ بینی کی غلطیاں دیکھ کر دکھ ہوا۔ تیسرے شعر کے دوسرے مصرع میں مری پہنچ سے ''بھی'' دور جا گا۔ پھر مقطع میں ''صدا بہ صحرا'' کی جگہ ''صدا بہ صدا'' کمپوز ہو گیا ہے۔ امید ہے

آئندہ اس کا خیال رکھیں گے۔

غالب عرفان (کراچی)

برادرم گلزار ہی گلزار، سلام مسنون۔

تازہ شمارہ ڈاکٹر شباب للت کے نام قرطاسِ اعزاز لے کر آیا تو دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں۔ جدہ میں طویل قیام کے دوران میں ہندوستان سے تقریباً سبھی ادبی مجلّے موصول ہوا کرتے تھے اور اُن میں سے اکثر میں ان کا کلام پڑھتا اور ذوقِ ادب کی تسکین کیا کرتا تھا۔ اب تازہ شمارے میں ان کے بارے میں بہت سی نگارشات اور ان کی بہت سی تخلیقات یکجا دیکھ کر خوشی ہوئی کہ مَیں تو ایک ایک پھول سے ہی مشامِ جاں معطر کیا کرتا تھا جبکہ اب ایک سبدِ گل ''چہارسُو'' کے اِس شمارے کی صورت میں میرے پاس ہے۔ ہر شمارے میں آپ جس شخصیت کو قرطاسِ اعزاز عطا کرتے ہیں اُس کے بارے میں اتنی محنت سے اتنا کچھ یکجا کر دیتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ آپ نے 'اِک آدمی' اور 'اکادمی' کا فرق بہت کم کر دیا ہے۔

اس سے قبل مارچ اپریل ۲۰۱۳ء کا ''چہارسُو'' واقعی چہارسُو کا احاطہ کرتے ہوئے نظر نواز ہوا۔ اِس شمارے میں قرطاسِ اعزاز قمر علی عباسی کے نام ہے مگر سرورق بھی اور بہت سی تحریریں بھی ''ایک میں دو'' (Two in One کا لفظی ترجمہ) کا منظر پیش کر رہی ہیں اور یہ ہے بھی سچ کہ یہ زرخیز جوڑا اپنی اپنی جگہ انفرادیت رکھنے کے باوجود ایک اکائی کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ جہاں قمر علی عباسی کے سفر نامے، کالم اور دیگر بہت سی شگفتہ تحریریں نہایت خوشبودار ہوتی ہیں وہیں نیلوفر عباسی اپنے کئی مضبوط حوالے رکھتی ہیں۔ اسی شمارے میں شامل خود نیلوفر عباسی کی تحریریں بھی اس کی گواہ ہیں۔ حصہ منظومات میں جہاں کچھ نہایت عمدہ تخلیقات پڑھنے کو ملیں وہیں یہ احساس بھی ہوا کہ ''چہارسُو'' جیسے جریدے میں شامل کسی تخلیق کے بارے میں بھی معیار پر سمجھوتا نہیں کرنا چاہئے۔ آگے حدِ ادب! آپ کا ایک نہایت ہی جلتی ہوئی صورتِ حال پر لکھا ہوا افسانہ یا مکالمہ ''جانِ آرزو'' جانِ چہارسُو بھی ہے۔ 'مقطع' تو اور بھی لاجواب ہے جس کی جتنی داد دوں کم ہوگی، کیا خوب کہا ہے آپ نے ہمارے 'اَن داتا' آئی ایم ایف کو: ''ہر گھر سے بھوکا نکلے گا تم کتنے بھوکے مارو گے''۔

نسیم سحر (راولپنڈی)

محترم گلزار جاوید، تسلیمات۔

ادیبوں شاعروں کو ان کی اپنی ادبی کاوشوں اور کامرانیوں کا اک گلدستہ سا بنا کے پیش کرنے کا یہ سلیقہ جو آپ نے اپنا رکھا ہے اس کی جتنی بھی داد آپ کو دی جائے کم ہے۔ چہارسو کا قرطاس اعزاز جناب ڈاکٹر شباب للت صاحب کو مبارک ہو۔ اور آپ کو بھی کہ آپ اس فرض سے سبکدوش ہوئے۔ صاحبِ قرطاسِ اعزاز کی ادبی خدمات نصف صدی سے زیادہ کا قصہ ہیں اور اس کے پیشِ نظر یہ ان کا حق تھا جسے آپ نے بروقت ادا کیا۔ ''براہِ راست'' میں آپ کے سوالات ہمیشہ ہی آپ کے عمیق مطالعہ و تحقیق کے غماز ہوتے ہیں اس لئے بہت اہم ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی ان سوالوں کے جواب خوب دل لگا کے دئے۔ ان کی نعت ''دربارِ محمدؐ'' نے بہت متاثر کیا۔ نظموں میں سے نظم ''شکرانۂ محبت'' اک کامیاب نظم ہے گہرے تاثر کی حامل سچی معصوم اور برجستہ۔ ماہیے اور غزلیں بھی اچھی لگیں۔

دوسرے حصے میں حصۂ غزل میری توجہ کی پہلی منزل ہوتی ہے۔ اکثر مفصل تبصرہ بھی کرنا چاہتی ہوں مگر خوف یہ ہوتا ہے کہ رائے دی تو کئی دل افسردہ و ملول ہوں گے اور یہ میں نہیں چاہتی مگر اتنا ضرور عرض کروں گی کہ اس حصہ کا معیار اب وہ نہیں رہا جو پہلے ہوتا تھا۔ کم از کم بے بحرے بے وزن غزلیں تو چہارسو جیسے معتبر رسالے کو زیب نہیں دیتیں۔ میری یہ رائے انتہائی خلوص پر مبنی ہے اس لئے امید ہے طبعِ نازک پہ گراں نہیں گزرے گی۔ حصۂ نظم میں امجد اسلام امجد کی نظموں کے کیا کہنے خصوصاً پہلی نظم ''ہاں یہی وقت ہے'' اک شاہکار نظم ہے۔ آپ کا افسانہ ''ادھ کھائی بوٹیاں''۔۔۔ میری ناقص رائے میں اس کا عنوان ''بھوراہلا'' ہونا چاہئے۔ باقی یہ کہ جس قرینہ سے آپ نے اس افسانے کو بغیر کسی روائتی قسم کی کہانی کے آہستہ سے اٹھایا پھر ذرا پھیلایا پھر اور پھیلایا اس کے بعد سمیٹا اور سمیٹ کے اک شہکار کی طرح اک خاص جگہ پہ لا کے رکھ دیا جہاں اب یہ اپنے آپ میں ہی داستان در داستاں ہے بلکہ خود اک داستاں گو ہے۔ آپ نے اور کچھ نہیں بس کمال کیا ہے۔ رسالے کا باقی حصّہ زیرِ مطالعہ ہے۔

پنہاں (یو۔ایس۔اے)

پیارے بھائی گلزار جاوید، سلامِ مسنون۔

قرطاسِ اعزاز کا سلسلہ خوب ہے۔ ڈاکٹر شباب للت سے آپ کے مکالمے کے ذریعے تفصیلی ملاقات ہوئی۔ بہت مزا آیا۔ ڈاکٹر صاحب کا اسلام کے بارے میں مطالعہ وسیع ہے۔ وہ خوبصورت نعت بھی کہتے ہیں۔ غزل گوئی کے تو وہ استاد ہیں۔ قرطاس اعزاز پڑھ کر ان سے پیار ہو گیا ہے۔ عبداللہ جاوید، وقار بن الٰہی، عذرا اصغر اور امرناتھ دھمیجہ کے افسانے پسند آئے۔ حصہ شاعری میں مشکور حسین یاد، محمود الحسن، سرور انبالوی اور آصف ثاقب جیسے اساتذہ کا کلام شامل ہے جن سے ہم نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ انہیں فنِ شعر پر مکمل دسترس حاصل ہے۔ مہندر پرتاپ چاند خاصے عرصے بعد شامل ہوئے۔ زہیر کنجاہی، عارف شفیق، تصور اقبال، نوید سروش کی غزلیں پسند آئیں۔ افسانوں کے دوسرے حصے میں حنیف باوا، محمد طارق علی، شفیع ہمدم اور گلزار جاوید کے افسانے بہت اچھے لگے۔ آپ ان دنوں ملکی حالات کے پس منظر میں خوبصورت اور چونکا دینے والے افسانے لکھ رہے ہیں۔ محمد طارق علی بھی حصہ بٹا رہے ہیں۔ فیروز عالم کا میں شیدائی ہوں زندگی کے سفر میں امجد اسلام امجد، یوگیندر بہل تشنہ، سلیم آغا قزلباش، کرامت بخاری جیسے اچھے شاعر شامل ہیں۔ دیپک کنول نے کے۔آصف کا خوبصورت تعارف کرایا ہے۔

انوار فیروز (راولپنڈی)

مدیرِ محترم، سلام و رحمت۔

"چہارسُو" کی ہارڈ کاپی کے علاوہ سافٹ کاپی بھیجنے کا بھی بے حد شکریہ! دولتِ یقیں سے مالا مال ہو کے دربارِ محمد کے مطالعے کی سعادت سبحان اللہ! خلعتِ زریں سے خیرہ ہو کر براہِ راست تک آئے تو ڈاکٹر شباب للت صاحب کی نہایت مفصل، مدلّل، متوازن اور مثبت جوابات پڑھنے کو ملے، ادبی رویوں کا نہایت حقیقت پسندانہ تجزیہ نیز مختلف ادیان کا تقابلی مطالعہ و مشاہدہ ان کی شاعری کے کینوس کو وسیع تر کر دیتا ہے۔ مختلف اصنافِ نظم و نثر میں بھی اُن کے یہاں مذہبی رواداری، ذہنی کشادگی، وسیع النظری اور فکری عمیق پایا جاتا ہے اور وہ علامہ منور لکھنوی کے شاگردِ رشید ہونے کا حق ادا کرتے محسوس ہوتے ہیں۔

اگر ظرافت و صحت معاشرہ میں پروفیسر انور مسعود، ڈاکٹر انعام الحق جاوید اور سرفراز شاہد صاحب کا مزاحیہ کلام کسی حد تک ہی شامل ہو جاتا تو حسنِ مضمون مزید اپ ٹو ڈیٹ ہو جاتا۔ رقص کی ایک صورت تو زنجیر پہن کر ہوتی ہے مگر جب پاؤں تلے زمین نہ رہے تو پشت پہ پُرخلوص گرفت کہانی کو عام ڈگر سے ہٹا کر غیر معمولی موڑ دے دیتی ہے۔ "ہم سے تو پرندے اچھے" کے سوانحی بیانیے، خاکہ نگاری اور مکتوباتی انداز کی تثلیث نے اسے مؤثر بنا دیا۔ خواب و حقیقت کی تکنیک نے لمحوں کی مسافت کو متجسس بنائے رکھا۔ دراصل "ادھ کھائی بوٹیاں" قارئین کے لیے لطف مکرر تو ہے ہی کہ یہ ایسا ہمہ جہتی استعارہ و بھرپور علامت ہے جس کا زندگی کے کئی پہلوؤں پر بڑی کامیابی سے اطلاق ہوتا ہے۔

"ہوا کے دوش پر" طالبعلمانہ نشیب و فراز سے فیصلہ کن نتیجے کے مختلف مراحل پہ محیط ڈاؤن ٹو ارتھ دلچسپ رہی۔ ٹھکر صاحب کے ناول کی خصوصیات اپنی جگہ سب درست مگر خوشی انتساب پڑھ کر ہوئی کہ یہ اعزاز آپ کا استحقاق ہے۔ محبوب عزمی صاحب کا پُرمزاح کلام بلاشبہ اطراف و جوانب پہ اُن کی گہری نظر کا غماز ہے اور منظرِ عام پر آنا بھی لائق ستائش! نظمیں بیشتر اچھی لگیں مگر بالخصوص "ولایت ہو کہ امریکہ میری پہچان ہے اردو، وہ جن کو اوڑھ کر سوتا ہوں میرے خواب بھی اُردو!"

"امریکہ مت جیئو" (ای۔ میل بھی کی تھی) کی کتاب ملنے پہ دریافت کولمبس کے امریکہ دریافت کرنے سے کم نہیں رہی۔ ۷۷ء اور ۶۵ء کے بعد تیسری مرتبہ امریکہ کی سیاحت (انتباہ کے باوجود) بقلم و بکتاب عباسی صاحب جاری ہے۔

شگفتہ نازلی (لاہور)

مکرمی گلزار جاوید، آداب و تسلیم۔

"چہارسُو" کا تازہ شمارہ مئی جون ۲۰۱۳ء میرے ہاتھوں میں ہے۔ ڈاکٹر شباب للت کے قرطاس اعزاز نے ہمیں اردو کے ایک مؤقر ستارے سے روشناس کرایا۔ ان کا دم غنیمت ہے کہ اب سرحد پار اردو لکھنے پڑھنے کا چلن ذرا کم کم ہے۔ ہمارے عزیزوں کے خط اور میل انگریزی یا رومن اردو میں آتے ہیں۔ جدہ کے انڈین کونسلیٹ کے مشاعرے میں یہ شعر سنا تھا۔ آپ بھی ملاحظہ کریں:

بولتے ہیں سب جسے پڑھتا نہیں کوئی
حضرت میر تم یہ کیسی زبان چھوڑ گئے

کچھ ایسا ہی دکھ ڈاکٹر صاحب کے اس شعر میں بھی ہے۔

غیر مسلم ہو کے بھی عاشق ہوئے اردو پہ ہم
زندگی بھر اس حماقت پر ہمیں رونا پڑا

ڈاکٹر صاحب کی نعت کے اس شعر نے بہت شاد کیا:

انسان کو انسان بنانا ہے ابھی
ہے تشنۂ تکمیل ابھی کارِ محمدؐ

عبداللہ جاوید کا افسانہ "شکریہ میرے مہرباں" پڑھ کے بے ساختہ زبان سے یہ آیت نکلی "واذ مرضت فھو یشفین" مصنف نے اپنا وزن خود کشی کے مخالف پلڑے میں ڈالا ہے۔ "بڑا دل" وقار بن الٰہی کا افسانہ۔ آپ ایک مستند اور منجھے ہوئے افسانہ نگار ہیں۔ ٹریٹمنٹ اور بیان میں بڑی کشش ہے۔ بزرگوں کی نصیحتوں پر عمل کرتے۔ دل بڑا کرتے کرتے یعنی درگذر کرتے اتنی مایوسیاں سمیٹیں کہ مریض ہوئے اور طبعی طور پر واقعتاً دل بڑا ہو گیا۔ "ہم سے تو پرندے اچھے" امرناتھ دھمیجہ نے ہجرت کے دکھ کو جو سرحد کے دونوں جانب پائے جاتے ہیں اور بعض یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ہم سے تو پرندے اچھے جنہیں کسی پابندی کا سامنا نہیں۔ "رقص کرنے کی سزا" عذرا اصغر نے بڑی مہارت سے وہ المیہ بیان کیا ہے جہاں انتہا پسندی کا عفریت کیسے کیسے کومل اور معصوم احساس کو کچلتا جا رہا ہے۔

حنیف باوا کا "نام کیا دوں" ابھی ہمارے معاشرے میں اولڈ ہوم کا چلن نہیں اور ہم اس پر فخر بھی کرتے ہیں کہ ہم اپنے بزرگوں کو سینے سے لگائے رکھتے ہیں۔ لیکن کیا ہمارے روّیے بدلتے بدلتے مغرب زدہ نہیں ہو گئے جہاں اخلاص، احساس کو موت کے گھاٹ اتارا جا رہا ہے۔ "بیتے لمحوں کا لمس" محمد طارق علی زندگی کے حقائق اور سچے کرداروں پر افسانہ بننے کا فن جانتے ہیں۔ مشرقی پاکستان کے ایک بنگالی کردار منظور سے انہوں نے قاری کو احساس دلا دیا کہ ہم نے صحیح وقت پر صحیح فیصلہ نہیں کیا ورنہ آج ہماری تاریخ کچھ اور ہوتی۔ شفیع ہمدم کا "لمحات کا سایہ" یہ جوانی آتی ہے صرف جانے کے لیے اور جا کر پھر کبھی نہیں آتی۔ اس حقیقت پر مبنی افسانہ لیکن بعض احساس، رویّے بدل دیتے ہیں۔ یورپ میں کسی بوڑھے کو Old man کی بجائے Old boy کہا جاتا ہے۔ عرب دنیا میں آپ کسی کو "شیبا" یعنی بوڑھا کہہ دیں تو وہ پلٹ کر جواب دے گا "ما انا شیبا" میں بوڑھا نہیں ہوں "انا ابو شباب" یہ ذو معنی ہے یعنی میں بڑا جوان یا جوانوں کا باپ ہوں۔

آپ کا افسانہ "ادھ کھائی بوٹیاں" حالاتِ حاضرہ اور خصوصاً

انتخابات کے ماحول میں ایک فکرانگیز افسانہ ہے۔دعا کیجیے کہ ہم وطنوں کو اپنے ہر طرح کے بھورے بلّوں سے نجات مل جائے۔

نجیب عمر (کراچی)

پیارے گلزار! جگ جگ جیو۔

ڈاکٹر شباب للت سے منسوب چہارسو پڑھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ شباب صاحب محبت کرنے والے انسان اور وسیع المشرب ادیب وشاعر ہیں۔ شمارے میں شامل اُن کی نعت کا یہ شعر ہماری رائے کو تقویت دے رہا ہے:

جنّت نہ ملے حشر میں تو اپنی بلا سے
خوش ہوں کہ ملے گا مجھے دیدارِ محمدؐ

تمام محترم مقالہ نگاروں نے بھی عرق ریزی سے شباب صاحب کے اوصاف نمایاں کرنے کی سعی کی ہے۔آپ کے تلخ وشریں سوالات کے جوابات بھی شباب صاحب کے تحمّل، بردباری اور وسعت نگاہی کی گواہی دے رہے ہیں۔آپ نے تو مکالمے کو سیدھا سیدھا آپریشن کلین اپ بنا دیا ہے۔ انگریزی زبان کے شاعر میتھو آرنلڈ نے کہا ہے کہ اسلوب نگارش کردار کی غمازی کرتا ہے۔بلاشبہ آپ کا اندازِ تحریر آپ کے پاکیزہ احساسات وکردار کا غماز ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو براہِ راست کے ساتھ اپنی کہانیوں میں بھی وقت اور حالات کے تقاضوں کو مدِنظر رکھنا چاہیے۔

اس بار کہانیاں بہت دھانسو ہیں۔عبداللہ جاوید اور وقار بن الٰہی تو فن کی انتہا پر نظر آتے ہیں البتہ امرناتھ دھمیجہ صاحب نے بھی کچھ کم ستم نہیں ڈھایا ''ہم سے تو پرندے اچھے'' کہانی نہیں ہجرت کے ماروں کا نوحہ ہے۔شعری حصہ میں جناب مشکور حسین یاد، جناب انتظار باقی، پنہاں اور مہندر پرتاپ چاند نمایاں نظر آتے ہیں۔چاند صاحب کا یہ شعر دل کو اب تک مضطرب کیئے ہوئے ہے۔

رہینِ درد ہوا، وقفِ رنج ویاس ہوا
بچھڑ کے تجھ سے مرا دل بہت اُداس ہوا

انل ٹھکّر صاحب ہمارے دور کے سچے اور کھرے لکھاری ہیں۔اُن کے ناول ''رشتے'' پر عزیزہ رینو بہل نے مختصر مگر جامع تبصرہ تحریر کیا ہے۔ڈاکٹر فیروز عالم نے میڈیکل کالج میں پہلے دن کی روداد تفصیل سے بیان کرکے جوانی کے دن یاد کرادیئے۔دیپک کنول صاحب نے جس محبت سے کے۔ایل۔سہگل کو یاد کیا ہے اُس سے سہگل صاحب کی روح ضرور خوش ہوگی۔

یوگیندر بہل تشنہ (یو۔ایس۔اے)

گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

آپ کا ارسال کردہ چہارسو مئی جون ۲۰۱۳ء نظر نواز ہوا۔شکریہ۔ سب سے پہلے ''رس رابطے'' کا مطالعہ کیا کیونکہ مکتوبات بڑے دلچسپ اور معلومات افزا ہوتے ہیں۔اپنے ایک مراسلے میں پروفیسر انتظار باقی صاحب نے گزشتہ شمارے کی غزلوں میں سے کچھ اشعار پسند فرمائے ہیں میری غزل کا بھی ایک شعر انہیں پسند آیا۔اُن کی پسندیدگی کا شکریہ! ''خلعتِ زریں'' میں ڈاکٹر شباب للت کے بارے میں اکثر شعراء اور ادباء کے خیالات پسند آئے۔ ''براہِ راست'' میں مجھے ڈاکٹر شباب للت کی دو باتیں پسند نہیں آئیں۔یہ قابلِ اعتراض ہیں یا نہیں مگر مجھے اچھی نہیں لگیں۔ایک جگہ سوال کے جواب میں فرماتے ہیں کہ روح اپنے اعمال کی سزا و جزا پانے کے لیے بار بار جنم لیتی ہے مکافاتِ عمل کا یہ عقیدہ اسلام اور دوسرے مذاہب میں بھی تسلیم کیا گیا ہے۔ دوسرے مذاہب کا تو علم نہیں مگر اسلام میں ایسا نہیں ہے۔ایک اور جواب میں فرماتے ہیں کہ اردو حقیقتاً ایک ہندوستانی زبان ہے جس میں 67 فیصد ذخیرہ الفاظ ہندی کا ہے 20 فیصد عربی اور 12 فیصد فارسی کا دودھ پی کر پروان چڑھی۔تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ جس زبان کی ماں فارسی ہو اُس کی آمیزش میں فارسی کے صرف 12 فیصد الفاظ ہوں۔بھارت میں کئی ایک اردو رسائل شائع ہوتے ہیں جو ہمیں بھی آتے ہیں اُن میں وہی اردو ہوتی ہے جو ہم بولتے اور لکھتے ہیں اور یہ وہی اردو زبان ہے جو فارسی کا دودھ پی کر پروان چڑھی ہے۔وہ کون سی ہندوستانی اردو ہے جس میں 67 فیصد ہندی الفاظ ہیں؟

عبداللہ جاوید نے اپنے افسانے ''شکریہ میرے مہرباں'' میں نسرین کی گفتگو میں اس بات کا اشارہ کیا ہے کہ مایوسی گناہ ہے۔اسلام ایک مکمل دین ہے اور اس کی ہر بات بامعنی ہوتی ہے جولیا کو اس بات کا علم نہ تھا۔باقی افسانے بھی سارے پڑھ لیے۔غزلیں اور نظمیں بھی اپنے عروج پر ہیں۔باقی تخلیقات بھی پڑھنے کے قابل ہیں۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ''چہارسو'' روز بروز ادبی دستاویز بنتا جا رہا ہے اور پھر اس میں ''قرطاسِ اعزاز'' والا سلسلہ ہے وہ بھی ہر شمارے میں موجود ہوتا ہے۔گویا یہ ایک قسم کا ایسا گوشہ ہے جو صاحبِ قرطاس کے بارے اچھے خاصے تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہوتا ہے۔صاحبِ قرطاس کی اپنی تخلیقات بھی شامل ہوتی ہیں۔صاحبِ قرطاس سے آگاہی نہ بھی ہو تو آگاہی ہوجاتی ہے۔

پروفیسر زہیر کنجاہی (راولپنڈی)

گلزار جاوید، السلام علیکم۔

میں صدقِ دل سے آپ کی اور عذرا اصغر کی شکرگزار ہوں کہ مجھے چہارسو جیسے ادبی ماہنامہ سے نوازا گیا۔چہارسو میں مضامین کی ترتیب اور طباعت میں جو سلیقہ اور نفاست ہے وہ آپ کے حسنِ ذوق کا غماز ہے۔اس دیکھنے اور سُننے کے دور میں پڑھنے کی دل پذیر چیز کو تیار کرنا اور جو لوگ اس کے قدردان ہیں اُن تک پہنچانا ایک بڑا کام ہے۔آپ جس حوصلے اور محبت سے یہ کام کررہے ہیں اس پر آپ کو جتنی بھی داد دی جائے وہ کم ہے:

اللہ کرے پروازِ تخیل اور زیادہ۔

متاعِ چہارسو ایک جگمگاتی کہکشاں ہے جو میری تنہائی اور بیزاری پر رنگ ونور کی مدھم مدھم پھوار برسا رہی ہے۔حنیف باوا کا افسانہ میری قلبی کیفیت کا آئینہ دار ہے۔عذرا اصغر کے افسانے ''رقص کرنے کی سزا'' کا ہیرو بلال

انسانیت کی معراج ہے۔'' صبا۔۔۔اب تا حیات میں تمہارے پیر بن کر تمہارے ساتھ چلوں گا'' زندہ باد! بے لوث محبت زندہ باد۔ محمد طارق علی کا ''بیتے لمحوں کا لمس'' پڑھ کر آنکھیں بے اختیار نمناک ہوگئیں۔ ہائے۔۔۔میرا سنہری ریشوں والا مشرقی پاکستان کہاں کھو گیا۔ میں کس کے ہاتھوں پہ اس کا لہو تلاش کروں۔ آپ کا افسانہ ''ادھ کھائی بوٹیاں'' چونکا دینے والی بلکہ تڑپا دینے والی تحریر ہے۔ توانا، طاقتور اور شاطر بُھورا بلاّ آ کاس بیل کی طرح ''ادھ کھائے پاکستان'' پر آسن جمائے بیٹھا ہے۔ کل گیارہ مئی ہے۔ ووٹ ڈالے جائیں گے۔ دل رک رک کر دھڑکتا ہے۔ ایک مسلمان گھرانے کی پیداوار ہوں۔ مایوسی کفر ہے۔

جب سُنی لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ کی نوید
یاس کی تاریکیوں میں جگمگا اُٹھی اُمید

جمیلہ شبنم (اسلام آباد)

محترم گلزار جاوید، السلام علیکم۔

اس بار قرطاسِ اعزاز جناب ڈاکٹر شباب للت کے نام دیکھ کر دل خوش ہوا۔ ڈاکٹر شباب بھارت کے معروف شاعر ہیں لیکن پاکستان میں بھی اُسی شوق اور جذبے کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی لکھی ہوئی نعت ''دربارِ محمدؐ'' سے آپ کی نسبت و محبت حضورؐ کے ساتھ عیاں ہوتی ہے شاید یہی وجہ ہے کہ چہارسو کے سرِورق پر آپ کی تصویر میں لفظ ''محمدؐ'' ٹھوڑی پر دیکھا اور پڑھا جا سکتا ہے۔ پرچے کے دیگر مندرجات میں افسانے مجھے اپنی طرف کھینچتے ہیں لیکن افسانہ وہی پڑھتا ہوں جو آغاز میں مجھے قرأت کا پابند کر لے۔ ''شکریہ میرے مہرباں'' عبداللہ جاوید نے لکھا۔ افسانے کا مرکزی کردار جولیا وارڈ ایک اے ایل ایس نامی مرض میں مبتلا ہے جو اس کے جسم کو دن بہ دن متاثر کر رہا ہے اور جولیا اس خوف سے کہ بالآخر اس کا سارا جسم ناکارہ ہو جائے گا، صرف دل اس کو زندہ رہنے کے لیے سانسیں مہیا کرتا رہے گا، یوں ایک عذاب زندگی کا آغاز ہوگا جس سے نجات کے لیے جولیا نے عدالت سے خودکشی کی اجازت چاہی، جولی کے وطن میں ایسا ہوتا ہوگا ہمارے ہاں ایسا تصور ہی نہیں، ہم سوچتے ہیں اور جان پر کھیلتے ہوئے پس ماندگان کو رسوائیوں اور مختلف عذابوں کے حوالے کر جاتے ہیں۔ افسانے میں نسرین ایک مسلم کردار ہے جس نے جولی کے سامنے اپنا نقطہ پیش کیا، جولی نے اگرچہ اس نظریے کی تصدیق یا تردید نہیں کی تاہم قدرے متوجہ ضرور ہوئی، یہی لمحۂ نجات تھا جب جولی نے خدا کی طرف رجوع کیا، ہولے ہولے اس کے جسم کے خوابیدہ حصے بیدار ہو رہے تھے۔ افسانہ مسلسل ہے اور بغیر پڑاؤ کے پڑھا جا سکتا ہے۔

''بڑا دل'' شاخسانہ ہے وقار بن الٰہی کے قلم کا۔ عصرِ حاضر کی کروٹیں بدلتی کہانی۔۔۔ افسانے کا مرکزی کردار والدین کا سب سے بڑا بیٹا ہے، اسی ناطے چھوٹے بھائیوں کی گستاخیاں سہنا اس کا سماجی فرض ہے، ان کی بات ماننا اور والدین سے منوانا تو گویا فرض سے بھی اہم فریضہ ہو۔ والدین کا ایسا لاڈ پیار جائے بھاڑ میں جس سے اولاد کی تربیت میں رخنہ پڑتا ہو۔ امّاں نے بھی ہمیشہ ذمہ داری بڑے بیٹے کے سر تھوپی اور اسے بڑے دل والا کہا، کوئی مستجابی کا لمحہ تھا جب ''بڑے دل والا'' محاوراتی معانی کے خول سے نکل کر حقیقت کا روپ دھار گیا۔ رواں نثر میں لکھی گئی کہانی میں افسانہ نگار نے کیا کہا، فکر کی ضرورت ہے۔

حنیف باوا نے ''نام کیا دوں'' لکھا جو ہمارے اپنے معاشرے، اپنے ماحول سے چنیدہ ہے۔ موضوع نیا نہ ہونے کے علاوہ اسلوب بھی متاثر نہیں کر سکا۔ لفظ ''جب'' کے بے تحاشہ استعمال نے نثری حسن کو مجروح کیا ہے، لگتا ہے یہ زود نویسی کا شاخسانہ ہے کہ واقعات بھی درہم برہم سے ہیں، کہانی کا راز اختتام سے بہت پہلے افشا ہو جاتا ہے جس سے کہانی تاثر کھو دیتی ہے۔ کہانی کا عنوان ہمیشہ پُرکشش ہونا چاہیے اور یہ اسی صورت ہو سکتا ہے کہ یہ کام یا مرحلہ کہانی کے سپرد کر دیا جائے۔ کہانی ہمیشہ ایک ماحول سے برآمد ہوتی ہے حنیف ماحول استوار کرنے میں کامیاب رہے۔

گلزار جاوید ''اُدھ کھائی بوٹیاں'' کا قضیہ لائے ہیں۔ علامت کی زبان میں لکھی گئی کہانی کا ہر پیراگراف قاری پر حقائق آشکار کرتے ہوئے قریب ترین محسوس ہوتا ہے۔ کہانی کا آغاز انتہائی مضبوط ہے۔ دونوں کرداروں مومو اور بُھورے بلے کے ڈانڈے کہیں نہ کہیں جا کر ہر واقعے سے مل جاتے ہیں۔ جب افسانہ نگار اپنے فرائض سے بخوبی آگاہ ہوتا ہے تو اس کا قلم کہانی کے کرداروں کی زما میں اپنے ہاتھوں میں لے کر آغاز تا انجام الفاظ کے ہیرے ٹانکتا چلا جاتا ہے۔ جن ہاتھوں میں چہارسو پہنچ جائے اُنہیں اور کیا چاہیے۔

احسان بن مجید (اٹک)

برادرِ عزیز گلزار جاوید، آداب۔

چہارسو کا شمارہ روایت کے عین مطابق پوری آن بان سے مختلف معاصر ادیبوں کے دلچسپ اور معلومات افزا تخلیقات سے مزّین پورے وجود کو سرشار کر جاتا ہے۔ قرطاسِ اعزاز کا سلسلہ عام طور پر بہت شاندار ہوتا ہے لیکن اگر خاص طور پر کسی بہت ہی قریب جان پہچان والی شخصیت کے بارے میں ہو تو کیا کہنے۔ اس بار کا قرطاسِ اعزاز ڈاکٹر شباب للت صاحب کے نام پڑھ کر ایک انوکھی مُسرت کا احساس ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے ابتدائی دور میں میری کچھ کہانیوں کی اصلاح بھی کی اور مجھے گرانقدر نصیحتوں سے بھی نوازا۔ آج بھی مجھے جب ضرورت محسوس ہوتی ہے میں اُن کے در پر ہی جاتا ہوں میں تہہِ دل سے ڈاکٹر شباب للت کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ چہارسو میں تمام مشمولات قابل تعریف ہیں۔ ''براہِ راست'' کے علاوہ فاری شا کی ''خلعتِ زریں'' جو پچھلی صدی کے اور موجودہ دور کے عظیم شخصیتوں کے خطوط پر مبنی مضمون بہت ہی دلچسپ ہے۔ کبھی یہ شعر کہنے والے جناب ڈاکٹر شباب للت:

دنیا کبھی تو مجھ کو بھی دے گی میرا مقام
یہ بھی شبابؔ اپنا خیالی پلاؤ ہے

آج آسمانِ ادب کے درخشاں ستارے ہیں۔ڈاکٹر صاحب ہر میدان کے منجھے ہوئے کھلاڑی ہیں چاہے وہ سنجیدہ ادب ہو،شعر وشاعری ہو ظرافت اور طنز جیسے مضامین ہوں اُن کا طرز بیان منفرد اور اسلوب الگ ہے۔جناب دیپک کنول نے تو فلمی ہستیوں کے بارے میں اتنا دلچسپ لکھ کر ایک سماں باندھ رکھا ہے ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کا ''خامشی کا طلسم'' بہت اچھا لگا۔اور یہ سب کچھ آپ کی ان تھک کوششوں کا ہی نتیجہ ہے۔

کرشن نندہ (چندی گڑھ، بھارت)

گلزار جاوید صاحب،سلام مسنون۔

سب سے پہلے اس شدید رنج وغم کا ظہار ضروری ہے جو نہ صرف مجھے بلکہ چہارسو کے تمام قارئین کو قمر علی عباسی صاحب کی وفات سے پہنچا ہوگا۔وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔اسی کے ساتھ اس بات کی خوشی ہے کہ آپ نے ان کی وفات سے قبل ان پر ایک دقیع نمبر شائع کیا۔ان کے آخری ایام میں ان کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی تحفہ نہیں ہوسکتا تھا اور میری معلومات کے مطابق وہ اس کو دیکھ کر بے پناہ خوش ہوئے تھے۔ان کا نام ان کی کتابوں اور سفرناموں کے حوالے سے ہمیشہ زندہ رہیگا۔ان کے جانے کا غم اپنی جگہ پر مگر بقول مرزا شوق قدوائی

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ، کل ہماری باری ہے

گزشتہ شمارہ جناب شباب للت صاحب کے نام ہے۔ان کے نام سے کون واقف نہیں اور میں،اس کے باوجود کے بیالیس سال سے باہر ہوں اور اس سے قبل سندھ کے ایک چھوٹے شہر میں رہتا تھا،ان کے نام اور اردو ادب میں ان کی خدمات سے ایک حد تک واقف تھا مگر جس طرح چہارسو نے ان کے حالات زندگی،ان کے تعلیمی پس منظر اور ادب میں ان کے مقام کو اجاگر کیا ہے اس سے نہ صرف میری بلکہ تمام قارئین کی معلومات میں گراں قدر اضافہ ہوا۔میں تو ان کے کارناموں سے بے حد متاثر ہوا ہوں کہ کس طرح نامساعد حالات کے باوجود انہوں نے اردو سے اپنے عشق کی رواداری نبھائی۔میں ان کے اس جذبہ کو سلام کرتا ہوں۔افسانے سارے ہی اچھے ہیں مگر میں طارق علی کے ''بیتے لمحوں کا لمس'' سے بہت متاثر ہوا۔ان کا طرز تحریر دل کو چھور رہا تھا۔آپ کی کہانی ''ادھ کھائی بوٹیاں'' میں آپ کا سابقہ انداز قائم ہے کہ کہانی میں وہی نشتر والی کاٹ موجود تھی جو آپکا خاصہ ہے۔

اس خط کی ایک خاص تقریب یہ ہے کہ میں قارئین کو جواب میرے دوست بن گئے ہیں یہ اطلاع دینا چاہتا ہو کہ میں جون کی تیس تاریخ کو رضا کارانہ طور پر ریٹائر ہو رہا ہوں۔کچھ عجیب سے جذبات ہیں۔زندگی کے پینتالیس سال اس پیشے کی نظر کئے۔اپنے طور پر پوری پوری کوشش کی کہ اس پیشے کو شروع کرنے پر انسانی زندگی کی تقدیس کا جو حلف اٹھایا تھا اس کی مکمل پاسداری کروں۔اس لمبے سفر میں زندگی کی نیرنگیوں کے عجب تماشے دیکھے،ہر مریض ایک نئی کہانی تھا۔میں نے اپنی کتاب ''دھنک کا آٹھواں رنگ'' میں ان میں سے کچھ کہانیوں کو قلمبند بھی کیا۔کسی بھی معالج کا سب سے بڑا صلہ اس کے مریض ہوتے ہیں اور ان آخری ہفتوں میں مریضوں سے الوداعی گفتگو سے میرے بچپن دل کو یہ سکون نصیب ہوا ہے کہ میری کوششیں رائیگاں نہیں گئیں اور مجھے اپنی محنت کا صلہ اسی دنیا میں مل گیا ہے۔اب زندگی کو کچھ فراغت حاصل ہوگی اور ایک بار پھر میں لکھنے سے زیادہ ادب،ہر زبان کے ادب کے مطالعے پر اپنی توجہ مرکوز کرسکوں گا۔قارئین میرے لئے دعائے خیر کریں۔

ایک بار پھر احبابِ ''چہارسو'' کا تہہ دل سے شکریہ کے وہ احقر کی تحریر ''ہوا کے دوش'' کو اپنی توجہ اور آراء سے مالا مال کر رہے ہیں۔

فیروز عالم (امریکہ)

گلزار جاوید صاحب،آداب۔

ڈاکٹر شباب للت صاحب کی گفتگو کافی دلچسپ رہی ان کے ماضی کے بارے میں جاننا اچھا لگا مگر آپ نے جیسے ہی اُن کی شاعری پر تنقیدی انداز اپنایا وہ فوراً دفاعی انداز میں اپنی شاعری کا بچاؤ کرتے نظر آئے مکالمہ کافی خوبصورت ،برجستہ اور بے ساختہ تھا۔آپ کے ایک سوال پر جو آج کل کے مشاعروں کے حوالے سے ترنم سے پڑھنے کے رویے پر تھا ڈاکٹر شباب صاحب نے کُھل کر انڈیا کی صورتِ حال بتائی،میں سمجھتی ہوں کہ اب پاکستان،خاص طور پر کراچی میں یہ صورتِ حال اور زیادہ خراب ہے اور یہی وہ وجہ ہے کہ ہماری اچھے اور جینوئن شاعر اور شاعرات نے مشاعروں میں جانا ترک کر دیا ہے۔ڈاکٹر شباب صاحب کی اُردو رسم الخط کے حوالے سے کی جانے والی گفتگو میں،میں اُن کے خیالات سے متفق ہوں۔

'زندگی کا احساس' جناب نند کشور ورم صاحب کے مضمون نے جہاں ڈاکٹر شباب صاحب کی شاعری کے حوالے سے جامع گفتگو کی وہاں آخری سطور میں اُن کی شخصیت کے کمزور پہلو پر بھی بڑی ایمانداری سے روشنی ڈالی۔اس کے علاوہ ڈاکٹر شکیل الرحمٰن اور ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید صاحب نے بھی اُن کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل گفتگو کی۔جناب کرشن کمار طور صاحب نے اُن کے پی ایچ ڈی کے اُس مقالے پر بات کی جو ڈاکٹر شباب للت صاحب کے استادِ محترم جناب حضرت علامہ منور لکھنوی پر لکھا گیا تھا یہ بھی ایک مختصر مگر جامع تبصرہ تھا۔ڈاکٹر شباب بانو سرتاج صاحبہ نے اُن کی شاعری کو ایک مختلف زاویہ سے دیکھا اور اُن کی شاعری میں شامل دیو مالائی واقعات کو جو اُنہوں نے اپنی شاعری میں منظوم کیے ہیں اُس حوالے سے بات کی۔۔اس سے جہاں ڈاکٹر شباب للت صاحب کی اپنی تہذیبی ورثے سے اُن کی محبت کا ثبوت ملتا ہے اور اس بات کا اندازہ بھی ہوا کہ اُنہوں نے اپنے اس اساطیری ورثے سے کس قدر اکتسابِ فیض حاصل کیا ہے۔اس مضمون کے لیے ڈاکٹر شباب بانو سرتاج خاص طور پر

مبارک باد کی مستحق ہیں کہ اُنھوں نے نہایت باریک بینی سے اُن کی شاعری کا بغور مطالعہ ہی نہیں کیا بلکہ یہ ثبوت بھی دیا کہ وہ خود بھی اساطیری علوم پر مضبوط گرفت رکھتی ہیں۔

ڈاکٹر شباب للت صاحب کا منتخب کلام بھی پسند آیا جہاں غزلیں اپنے اندر ایک نیا انداز رکھتی ہیں وہاں اُن کی نظموں کا کینوس بھی دوسرں سے جدا ہے ۔۔'زندگی ایک سمجھوتا' 'شکرانۂ محبت' اور 'سفر تمام ہوا' اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

اس بار غزلوں میں جناب غالب عرفان صاحب کی غزل ایک منفرد لہجہ اور انداز لیے خوبصورت غزل لگی۔ کسی بھی تخلیق پر تبصرہ کرنے کا فن بہت کم لوگ جانتے ہیں اور جو اس پر عبور رکھتے ہیں وہ اپنے زورِ قلم سے کسی بھی قاری کو اُس تحریر کے مطالعے پر مجبور کر ڈالتے ہیں جن پر اُن کے قلم نے اپنے خوبصورت لفظوں کی نقش کاری کی ہوتی ہے اور پھر میرے جیسے قاری ایک پیاس کی مانند اُس کنواں کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتے ہیں ۔۔۔ایسا ہی ایک واقعہ ایک سے ڈیرھ سال پہلے میرے ساتھ پیش آیا جو جناب یونس جاوید صاحب کے ایک ناول پر جناب آغا گل صاحب کے تبصرے سے شروع ہوا اور پھر میں نے کراچی، لاہور کے تقریباً سارے بک اسٹال چھان لیے مگر وہ ناول آج تک نہیں مل پایا اور اب ڈاکٹر رینو بہل صاحبہ کے جناب انل ٹھکر صاحب کے ناول 'رشتے' پر تبصرہ پڑھنے کے بعد اس ناول کو پڑھنے کی خواہش اُسی شدت سے محسوس ہونے لگی جو یونس جاوید صاحب کے ناول کے لیے ہے۔۔۔ایک اور بات اس ناول کے حوالے سے اچھی لگی کہ جناب انل ٹھکر صاحب نے اپنی اس خوبصورت تخلیق جو ایک بہترین انسان کے نام انتساب کر کے نا صرف اُس تخلیق کا بلکہ ایک اچھے انسان کی اُن اچھائیوں کا حق بھی ادا کر دیا جو اُنھوں نے اپنی زندگی میں ادب کے کام کے حوالے سے پوری زندگی انجام دیا۔

'ایک صدی کا قصہ' میں دیپک کنول صاحب نے 'کے۔ آصف' کے بارے میں اور خاص طور پر فلم 'مغلِ اعظم' کے حوالے سے جو معلومات بہم پہنچائی ہم اس بات کے لیے اُن کا شکریہ ادا کرتے ہیں ہم نے یہ فلم کئی بار دیکھی ہے اس کی موسیقی اور اس کی فلم بندی لاجواب اور بے مثال ہے یہ صرف ایک فلم نہیں بلکہ ایک تخلیق کار کی بے مثال تخلیق ہے۔

رومانہ رومی (کراچی)

برادرم عزیز جاوید صاحب، سلام مسنون۔

اس بار ڈاکٹر شباب للت کے نام قرطاس اعزاز پڑھ کر بڑا مزہ آیا۔ یہ کریڈٹ آپ کو جاتا ہے کہ آپ نے ایک بھرپور ادبی شخصیت کو منتخب کیا۔ ویسے تو آپ ہمیشہ ہی کسی نہ کسی قابلِ لحاظ اہل قلم کو متعارف کراتے ہیں مگر مجھے ڈاکٹر شباب للت کچھ زیادہ ہی پسند آئے۔ خداوند تعالیٰ اس بے غرض ادبی خدمت کو جاری رکھنے کی بیش از بیش توفیق عطا کیئے رکھے۔

صدیق شاہد (شیخوپورہ)

گلزار بھائی، آداب۔

اس بار ڈاکٹر شباب للت سے منسوب قرطاس اعزاز دیکھ کر طبیعت خوش ہوئی۔ میری ادبی زندگی کے ابتدائی ایام سے ڈاکٹر صاحب میرے مہربان اور کرم فرما رہے ہیں مگر جس مفصل طریق پر آپ نے اور فاضل مقالہ نگاروں نے ڈاکٹر صاحب کا تعارف کرایا ہے اُس سے بہت کچھ نیا جاننے اور پڑھنے کو ملا۔ براہِ راست کے ادھ بد سوالوں نے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے تمام اوراق قاری کے سامنے کھول کر رکھ دیئے۔ شباب صاحب ایک دانشور، شاعر، ادیب اور نقاد ہیں۔ اُن کے ہاں رومان بھی ہے طنز بھی، حالات حاضرہ اور مزاح بھی سب سے بڑھ کر مذہبی رنگ بھی مگر نہایت اعلیٰ و ارفع انداز میں۔ زیر نظر شمارے میں شامل ڈاکٹر صاحب کی نظم ''شکرانہ محبت'' کئی سال پہلے میں نے ڈاکٹر صاحب کی زبانی سنی تھی۔ یہ نظم قریب ہر ماں باپ کے دل کی آواز ہے۔

عبداللہ جاوید صاحب نے ایک طرح سے عالمی کہانی لکھی ہے، وقار صاحب نے دیہاتی ماحول کی عکاسی کرتے ہوئے کڑوی حقیقت خوب جم کر بیان کی ہے۔ عذرا صاحبہ نے وقت اور حالات کو مصوّر کیا ہے۔ حنیف باوا، شفیع ہمدم بھی اپنی بات کہنے میں کامیاب رہے ہیں۔ طارق علی نے پرانی یادوں سے خوب کہانی بنی ہے اور انجام پر آ کر قاری کو گرفت میں لے لیا ہے۔ امرناتھ دھمیجہ صاحب نے آپ کی فرمائش پر آپ بیتی لکھ بھیجی ہے جسے اسی نام سے افسانوں سے الگ شائع کیا جاتا تو زیادہ تاثر قائم ہوتا۔ آپ نے ہمیشہ کی مانند اس بار بھی قلم سے نشتر کا کام لیتے ہوئے علامتی افسانے میں سماج کے چھوٹے بڑے بھورے بلّوں پر خوب طنز بھی کیا اور ان کا شکار ہونے والے سویٹی جیسے مظلوم لوگوں کی نشاندہی بھی۔ شعری حصہ لطف لے کر پڑھنے کا متقاضی ہے سو وہ آرام سے پڑھوں گی۔ ''رس رابطے'' میرا پسندیدہ سلسلہ ہے جو میں سب سے پہلے پڑھتی ہوں۔ اس کی وساطت سے احباب چہارسو سے تفصیلی ملاقات ہو جاتی ہے۔

شاید آپ کو علم ہو کہ آج کل ڈاکٹر شباب للت سخت علیل ہیں اور اُن کا بیشتر وقت علاج کی غرض سے دہلی میں گزرتا ہے۔ کمزور بھی بہت ہو گئے ہیں خدا معلوم اُن کی صحت نے اس امر کی اجازت دی کہ نہیں کہ وہ آپ کو چہارسو کی رسید اور رائے ارسال کر سکیں۔ آپ اور قارئین چہارسو سے ڈاکٹر صاحب کی صحت یابی کے لیے دعا کی درخواست ہے۔

ڈاکٹر رینو بہل (چندی گڑھ، بھارت)

محترمی گلزار جاوید، السلام علیکم۔

چہارسو کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ قرطاسِ اعزاز سے لے کر رس رابطے تک کوئی تحریر چھوڑنے کو دل نہیں کرتا۔ ترتیب و پیشکش میں آپ کی محنت اور لگن اپنی جگہ لیکن ایک قاری کی ذمہ داری اور دیانت داری کا عمل دخل پرچے کی کامیابی اور مقبولیت میں از بس ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ اپنی تحریر پڑھ کر پرچے کو الماری یا طاق میں سجا دینا اتنا ہی آسان ہی جتنا پورا پرچہ پڑھنا مشکل۔ ادبی

بددیانتی اور کسے کہتے ہیں؟ دوسروں کی تحریریں پڑھنا جذبے اور شوق کا متقاضی ہوا کرتا ہے۔ الحمداللہ ''چہارسو'' کو ایسے قاری اور لکھاری میسر ہیں جو ذمہ دار بھی ہیں اور سنجیدہ بھی۔ خطوط سے عیاں ہے کہ چہارسو اپنی انفرادیت اور مقبولیت کے ذیل میں ایک الگ شناخت رکھتا ہے۔ بامعنی اور بامقصد نثری تحریروں کے ساتھ ساتھ معیاری اور دل پسند منظومات پرچے کے حسن کو چار چاند لگا دیتی ہیں۔ غزلیں اور نظمیں کڑے انتخاب سے گزر کر پرچے کا حصہ بنتی ہیں اور پھر اہمیت ثابت کر کے قارئین کے دلوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گھر کر جاتی ہیں۔

تصوراقبال (اٹک)

بھائی گلزار جاوید، تسلیمات۔

''چہارسو'' کا مئی۔ جون شمارہ موصول ہوا۔ اپنی روایات کے مطابق ''چہارسو'' نے اردو میں نہ صرف پاکستان میں بلکہ ہندوستان کی ادبی دنیا میں اپنا ایک خاص مقام بنایا ہے جو باعث تحسین ہے۔ اگر رسالہ پڑھنے کے بعد کچھ سوالات ذہن میں کلبلانے لگیں تو سمجھ لیجیے کہ اس رسالے میں حرارت پیدا کرنے کا دم خم ہے۔ بھائی شباب للت پر آپ کا گوشہ خوب ہے۔ مگر انٹرویو تو خوب سے خوب تر ہے آپ تو انٹرویو کرنے میں ماہر ہیں۔ قرطاس اعزاز میں جو بھی مضامین ہیں بہت خوب ہیں۔ افسانوں اور دیگر مشمولات کے انتخاب میں آپ کا بالغ شعور جھلکتا ہے۔ شعری حصہ بھی لاجواب ہے جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

سری واستو رند (نوئڈا، بھارت)

محترم گلزار جاوید، السلام علیکم۔

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ ملتے ہی ادبی تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ سب سے پہلے ڈاکٹر فیروز عالم صاحب کی داستان حیات ''ہوا کے دوش پر'' کی قسط نمبر ۱۷ کا مطالعہ کیا۔ موجودہ قسط میں لیاقت میڈیکل کالج میں پہلا دن، ڈسکشن ہال، اناٹومی سے بیزاری، پڑھائی میں مشکلات، نئے ماحول اور نئے دوستوں کے حوالے سے ماضی کو روشن کیا ہے۔ بڑی اعلیٰ ظرفی سے کتابوں کے سلسلے میں ڈاکٹر ڈراگو مرحوم اور ایس اے خان (سلطان احمد خان) کو یاد کیا ہے۔ خوشگوار شام کا تذکرہ بھی خوب ہے۔

''ایک صدی کا قصہ'' میں دیپک کنول نے کے۔ آصف کی درویش صفت شخصیت اور فن پر اپنے خاص انداز سے قلم اٹھایا ہے مگر اس میں ایک کمی محسوس ہوئی کہ کے۔ آصف فلم انڈسٹری میں کس طرح وارد ہوئے، ابتدا کہاں سے کی۔ دیپک صاحب نے ستارہ دیوی سے عشق کے بعد فوراً یہ لکھا ''اس بیچ آصف نے انڈسٹری میں اپنے قدم جما لیے تھے'' (ص ۱۰۹) گلزار جاوید صاحب آپ نے ہم جیسے ادب کے طالب علموں کو ڈاکٹر شباب للت جیسے اہم ادیب سے روشناس کروایا۔ ڈاکٹر شباب للت کی نعت ''دربار محمدؐ'' نے دل و ذہن کو منور کر دیا۔ کس سادگی اور عاجزی سے سیرت محمدؐ کو بیان کیا ہے۔ اُن کی غزلوں نے بھی اپنی گرفت میں لیے رکھا۔ نظموں میں نیا پن ہے۔ ''عصری مسائل اور ہمارے وسائل'' اُن کی نظموں کا موضوع نظر آتا ہے۔ محمد انعام الحق نے غزلوں کا انتخاب محنت سے کیا ہے۔ ڈاکٹر شباب پر لکھنے والے اہل قلم نے بھی خوب حق ادا کیا ہے۔

''براہِ راست'' میں آپ کے نپے تلے، سخت اور بامعنی سوالات کے جوابات ڈاکٹر صاحب نے تفصیل سے بہت دھیمے انداز میں دیے ہیں ہر بات کی وضاحت سے ہندوستان میں اردو زبان و ادب کی کیفیت، اردو، ہندی ادیبوں کی چشمک اور اردو رسم الخط کے مسائل کے حوالے سے بہت سی نئی باتیں سامنے آئیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ''عکس وحدت و رسالت'' اور ''ظرافت اور صحت معاشرہ'' میں اپنے مطالعے اور خوب صورت نثر سے متاثر کیا ہے۔ ''خلعتِ زریں'' میں بڑے سلیقے سے محترم فاری شانے اہلِ علم و دانش کی آراء کو ترتیب دیا ہے۔ یہ آراء ڈاکٹر شباب للت صاحب کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی جنم بھومی پاک دھرتی کو بھی محبت سے یاد کیا ہے۔ محمد طارق علی کا افسانہ ''بیتے لمحوں کا لمس'' میں تلخ ماضی میں محبتوں کے دریچے تلاش کیے ہیں۔ طارق علی بڑی مہارت سے چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی بات کہنے کا ہنر جانتے ہیں۔ یہ کہانی ''بیتے دنوں کے لمس نے مجھے گھیر رکھا ہے'' یہاں ختم ہو جاتی تو اس کا تاثر مزید گہرا اور دیرپا ہوتا۔ حنیف باوا کا افسانہ ''نام کیا دوں'' شروع سے آخر تک بہترین کرافٹ اور مصنف کی گرفت میں رہا ہے۔ عبداللہ جاوید کے افسانے ''شکریہ میرے مہرباں'' میں اُن کے مشاہدے اور پیش کش کی داد نہ دینا ادبی بددیانتی ہے۔ وقار بن الٰہی کا افسانہ ''بڑا دل'' ہمارے سماج کے ہر تیسرے گھر کی کہانی ہے انھوں نے کمالِ مہارت سے اسے خوب صورت کہانی کے روپ میں پیش کر دیا ہے۔ محترمہ عذرا اصغر کی انفرادیت نے متوجہ کیا۔ گلزار جاوید بھائی آپ چپ چاپ بڑی آہستگی سے بیانیہ افسانے میں کامیاب تجربے کر رہے ہیں۔ ''ادھ کھائی بوٹیاں'' ایک نیم علامتی بیانیہ افسانہ ہے جس میں سماج کا وہ چہرہ بے نقاب کیا ہے جس سے عام آدمی بہت پریشان ہے ''سویٹی'' اور ''بھورے بلّے'' کی علامت کو کون نہیں سمجھ سکتا، بہت خوب، واہ، واہ۔

۱۵رمئی کی شام خط مکمل ہی کیا تھا کہ کراچی کے ایک دوست نے اندوہ ناک خبر دی کہ شاعر، نقّاد، ماہرِ لسانیات، مؤلف، مرتب اور مختلف علوم و فنون کا گہرا مطالعہ رکھنے والے رفیق احمد نقش انتقال فرما گئے (اناللہ وانا الیہ راجعون) رفیق احمد نقش (جو ہمارے لیے رفیق بھائی تھے) کا بنیادی تعلق میر پور خاص سے تھا وہ ۱۵رمارچ ۱۹۵۹ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیمی مراحل میر پور خاص، جام شورو اور کراچی سے طے کیے۔ پورا تعلیمی کیریئر شاندار رہا۔ کئی زبانوں اور اردو ''املا'' پر دسترس رکھتے تھے۔ آج کل کراچی میں بحیثیت ایسوی ایٹ پروفیسر اردو تدریسی فرائض انجام دے رہے تھے۔ وہ مشفق خواجہ کے قریبی اور بااعتماد عقیدت مندوں میں اپنے آپ کو شامل کر کے فخر محسوس کرتے تھے۔ خواجہ صاحب مرحوم اُن کی ذہانت اور زبان دانی کے قائل تھے۔ رفیق بھائی کی موت اردو دنیا کا بڑا نقصان ہے۔

نوید سروش (میر پور خاص)

---- نقّارہ ----

گنٹر گراس کے تخلیقی معرکوں میں ان حقیقتوں کا احساس سب سے زیادہ اس کے ناول ''دی ٹن ڈرم'' کی بابت ہوتا ہے۔ یہ ناول کیا ہے،فن کے زندگی بن جانے کا معرکہ ہے اور گنٹر گراس اوّل تا آخر اس معرکے میں سرخ رُو نظر آتا ہے۔ یہ گراس کی خوش قسمتی ہے اور اس ناول کے مترجم باقر نقوی کی خوش قسمتی ہے اور ہماری۔ ہم سب اردو پڑھنے والوں کی بھی خوش قسمتی ہے کہ گراس کا مزاج اور اس کا احساس اور لکھنے کا انداز اس ترجمے میں بڑی خوبی سے آ گیا ہے۔ باقر نقوی نے گزشتہ برسوں میں اردو ترجمے کے شعبے میں بڑی خدمات سرانجام دی ہیں۔ ان کا ایک کے بعد دوسرا کارنامہ سامنے آیا اور ایسا کہ دیکھ کر جی خوش ہوا۔ خدا انہیں خوش رکھے اور وہ اسی طرح اپنی زبان اور اپنے ادب کو ثروت مند بناتے رہیں۔

---اسد محمد خاں

اشاعت ۲۰۱۲، قیمت ۱۲۰۰، اکادمی بازیافت، کراچی

---- آدمی ----

یقین جانیے میرے لیے، فقط لکھنا اور اس لکھنے کے عمل سے حظ اُٹھانا کبھی اہم نہیں رہا، کہ میں زندگی کے بھیدوں بھرے کھدو کو کھولتے چلے جانے سے، اور ہر تہہ کے اُترنے پر بے پناہ حیرت یا شدید صدمے کے مقابل ہو جانے کو ہی تخلیقی عمل کی عطا سمجھتا آیا ہوں۔ سو یہ افسانے بھی انہی لمحوں کی دین ہیں۔ وہ جو کیس ہسٹری سے باہر قتل ہو جاتی ہے یا پھر پہاڑوں سے رزق کی تلاش میں اُتر کر آنے اور زندگی کی اشتہا کا گرفتار ہو جانے والا آدمی، ملبے میں دھنسا ہوا ماسٹر فضل جُو، بکھرے ہوئے وجود والا کامران، قدیمی میزانِ عدل پر تلنے والی روحیں، رِکھلی کلیر گاتی بچیاں، بھرکس کہانیوں کا پشتارہ اُٹھائے اُٹھائے پھرنے والا، بیٹی کا جنازہ اٹھنے پر بین کرنے والی ماں، وہ مرا ہوا شخص جسے زندگی کے بخیے لگانے تھے، اکیلی رہ جانے والی عورت جس کی رانوں پر اُلجھا اندھیرا گدگدی کیا کرتا۔ خالی کنستر کی طرح بجتی زندگی والا راوی کردار، کوک بھرے کھلونے کا سا ایک اور کھلونا، ماں کی دودھ جیسی بغل میں جھانک کر مغلی پھوڑے کو آنکھ میں بھر لینے اور لذت تن کا اسیر ہو جانے والا عالم یا پھر وہ لڑکی جس کے اُجلے بدن کو متعفن پانیوں کی دھار نے بھگو دیا تھا، یہ سب کردار میرے وجود کا حصہ ہیں، میری حیرتوں کے رازداں اور میرے دُکھوں کے شریک۔ سو ان افسانوں کو پڑھیے اور اس درد اور اذیت کو آنکیے جو تخلیقی سطح پر زندگی کرنے والوں کا مقدر ہے۔

---حمید شاہد

اشاعت ۲۰۱۳، قیمت ۳۰۰ روپے، مثال پبلی شرز، فیصل آباد

---- عالمی اردو ادب ----

اردو کے ادبی جرائد و رسائل میں ''عالمی اردو ادب'' واحد حوالا جاتی مجلّہ ہے۔ ''عالمی اردو ادب'' کا تازہ شمارہ ہر بار کی طرح اس بار بھی منتخب غزلوں، نظموں اور افسانوں کے علاوہ محترمہ اختر جمال، جناب منشا یاد، جناب ساجد رشید، محترمہ منصورہ احمد، ڈاکٹر آغا سہیل، ضیاء شبنمی، مختار الدین احمد اور جناب حمید اختر کے تعزیتی گوشوں کے ساتھ سعادت حسن منٹو کے سو سالہ جشن ولادت کے حوالے سے نادر تحاریر یکجا کرنے کے علاوہ سالِ گذشتہ میں جہانِ فانی کو خیر باد کہنے والے اہلِ قلم کے حالات زندگی اور کتابیات کی فہرست شامل اشاعت کی گئی ہے۔ بظاہر ہم نے اختصار کو کام میں لاتے ہوئے دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی ہے حقیقت مگر یہ ہے کہ ''عالمی اردو ادب'' کے اس شمارے کی مجلد ضخامت چار سو سے زائد صفحات کو محیط ہے اور ہر صفحہ آپ کے توجہ حاصل کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔

---عطیہ سکندر علی

اشاعت ۲۰۱۳، قیمت ۳۰۰ روپے، F-14/21-D، کرشن نگر، دہلی

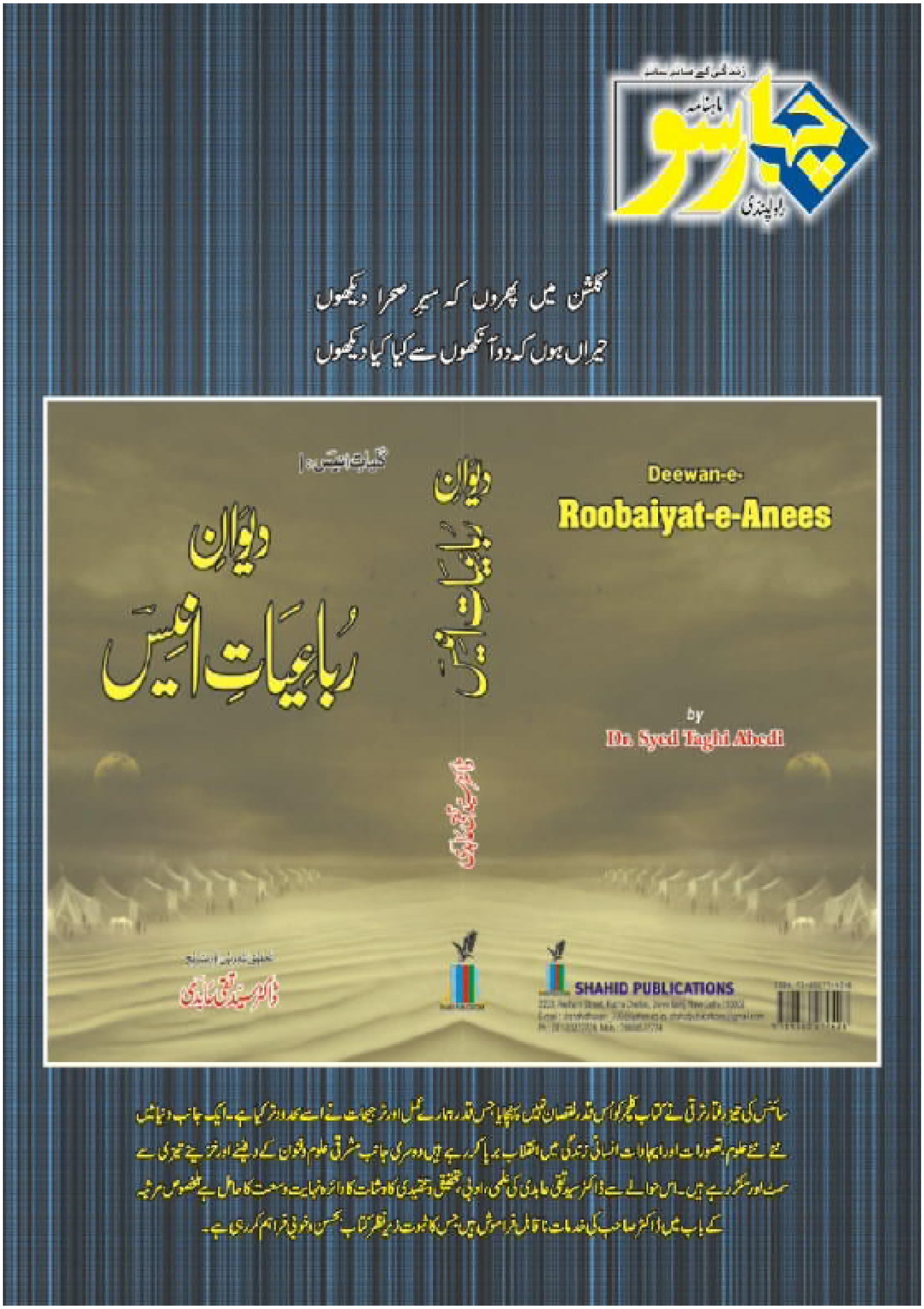
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی
گلشن میں پھروں کہ سیرِ صحرا دیکھوں
حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں
دیوان
رباعیاتِ انیس
Deewan-e-
Roobaiyat-e-Anees
by
Dr. Syed Taghi Abedi
ڈاکٹر سید تقی عابدی
SHAHID PUBLICATIONS
سائنس کی حیرت رفتار ترقی نے کتاب کلچر کو اس قدر نقصان نہیں پہنچایا جس قدر ہمارے عمل اور ترجیحات نے اسے محدود تر کیا ہے۔ ایک جانب دنیا میں
نئے نئے علوم، تصورات اور ایجادات انسانی زندگی میں انقلاب برپا کر رہے ہیں دوسری جانب مشرقی علوم وفنون کے دریچے اور خزینے تیزی سے
سمٹ اور سکڑ رہے ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر سید تقی عابدی کی علمی، ادبی، تحقیقی وتنقیدی کاوشات کا دائرہ نہایت وسعت کا حامل ہے بالخصوص مرثیہ
کے باب میں ڈاکٹر صاحب کی خدمات ناقابل فراموش ہیں جس کا ثبوت زیرِ نظر کتاب بحسن وخوبی فراہم کر رہی ہے۔